تدبر حدیث

حصہ دوم

ڈاکٹر سید محمد لقمان الاعظمی الندوی

انتساب

اپنی شریک حیات

ثروت نشور واحدی

کے نام

جن کی مخلصانہ رفاقت اور جذبہٗ تعاون و خدمت گزاری نے ہماری علمی و دعوتی کوششوں میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

محمد لقمان الاعظمی الندوی

ترتیب

انسانی اعمال پرنیت کے اثرات

ایمان کی حقیقت

اخلاق

اجتماعی زندگی کے اصول وآداب

انسانی حقوق کی اہمیت

اسلام میں انسانی جدوجہد اور مال کا درجہ

ذمے داری اور امانت کی اہمیت

عدل وانصاف

علم اور عمل صالح

عمل صالح کی فضیلت

خوف خدا اور فکر آخرت

صحابۂ کرام: جن کی روایتیں شامل کتاب ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

اسلامی تاریخ کے آغاز ہی سے حدیث شریف کا علم ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گیا تھا۔ اس علم کو قرآن کریم کے بعد سب سے زیادہ باعث تعظیم و تکریم سمجھا گیا۔ عہد نبوی ہی سے احادیث نبوی کی روایت وحفاظت کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ نے ان کو حاصل کرنے اور اپنی زندگی کو ان کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس طرح ان احادیث کی روایات اور انہیں قبول یا رد کرنے کے بارے میں مضبوط و مستحکم علمی اصول اور قواعد وضوابط محدثین کرام نے وضع کیے۔

محدثین عظام نے علم حدیث کی خدمت کے مختلف میدان اختیار کیے۔ ایک جماعت نے احادیث کی شرح اور ان کے معانی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ ایک جماعت (فقہاء) نے ان احادیث سے فقہی احکام اخذ کیے اور حکمت نبوی کی وضاحت فرمائی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے لیے جن اعلیٰ اخلاقی قدروں اور اصول ومبادی پر مشتمل احکام عطا فرمائے تھے، محدثین نے ہر دور میں اُن کو اپنی نسلوں کے سامنے پیش کیا۔ آج بھی نئی نسل کے دل و دماغ میں احادیث میں پنہاں دینی، اخلاقی اور تربیتی اصولوں کو راسخ کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔

راقم نے اسی ضرورت کے پیش نظر ایسی چالیس احادیث کی شرح کی خدمت انجام دینے کی کوشش کی ہے، جن سے اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں رہ نمائی ملتی ہے۔ ان احادیث کی شرح میں ہم نے ائمہ سلف کی آراء اور ان کی کتابوں سے روشنی حاصل کی ہے۔ مزید تفصیلات بھی پیش کی ہیں، تاکہ حدیث نبوی کے اندر جو حقائق و معانی پنہاں ہیں ان کی نقاب کشائی ہو سکے۔

ہم نے اُن احادیث کا انتخاب کیا ہے، جن کے اندر اخلاقی، دینی اور تربیتی مضامین ہیں اوران کے مطالعے سے قاری کے اندر فضائل ومکارم اخلاق سے محبت اور شرورو رذائل سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ آج کے دینی مدارس اور اسلامی اداروں کی نظر میں احادیث کے مطالعے کے لیے ایسے صحیح نصاب کا مقرر کرنا اور حدیث نبوی کی روح کو نئی نسل کے دل ودماغ میں راسخ کرنا، وقت کا بڑا بنیادی تقاضا ہے۔ اس لیے کہ اس پر حدیث نبوی کے بنیادی تربیتی مقاصد سے استفادے کا انحصار ہے۔ دینی اداروں اور مدارس کو چاہیے کہ وہ اپنے تعلیمی ماحول میں اس بات کی پوری کوشش کریں کہ اسلام کے اصول ومبادی کو نئی نسل کے اندر راسخ کردیں اوران کی ایسی رہ نمائی کریں کہ حدیث شریف موجودہ زندگی کی تشکیل وتعمیر میں اپنا بنیادی کردار پھر سے ادا کر سکے اور اسلامی بیداری کی نئی لہر کے لئے منارۂ نور کا کام کر سکے۔

حدیث نبوی کے اس مجموعے میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اسلامی تربیت کے اصول عملی طور سے برتنے میں حدیث نبوی کا جو کردار ہے، اس کو نمایاں کیا جائے۔

یہ مجموعہ ان چالیس تربیتی احادیث پر مشتمل ہے، جن سے عہد نبوی کی سماجی زندگی کی تصویر سامنے آتی ہے۔ ان احادیث پر جو بھی غور کرے گا، اس پر یہ حقیقت منکشف ہوجائے گی کہ ان میں رہ نمائی اور تربیت کی محض چند منتشر اور متفرق حدیثیں نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک ایسا مکمل نصاب ہے، جس سے صحیح اور سیدھا راستہ دکھائی دیتا ہے اور وہ معاشرے کے اندر اعلیٰ اخلاقی قدروں کو مضبوط ومستحکم کرتا ہے۔

اس مجموعے میں چالیس حدیثوں کی شرح، ان کے معانی ومضامین اور فکری گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ عربی مجموعے میں حدیث شریف کے الفاظ وتعبیرات کی تشریح اور فصاحت وبلاغت کے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اردو ترجمے میں اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

ہر حدیث کے عام مفہوم ومعنی کی وضاحت کے بعد فقہی احکام کو اجمالی انداز میں بیان کردیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ موجودہ دور میں اس حدیث سے ہماری کیا رہ نمائی ہوتی ہے اور انسانی معاشرے کی تعمیر کے لیے وہ کون سی بنیادیں فراہم کرتی ہے اور مغربی تہذیب وتمدن نے جو معاشرتی اور تمدنی خرابیاں پیدا کی ہیں، ان کو یہ حدیث کس طرح دور کرتی ہے۔ ہم نے ہر

حدیث میں اس کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ تاکہ کتاب کا تربیتی پہلو ابھر کر سامنے آجائے اور قاری کو زندگی کی شاہراہ پر چلنے میں دشواری نہ ہو۔

کتاب کے آخر میں اُن جلیل القدر صحابہ کرامؓ کے اجمالی حالات درج کر دیئے گئے ہیں، جنہوں نے یہ حدیثیں روایت کی ہیں اور جن کی زندگیاں حضور ﷺ کی مثالی تعلیم وتربیت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ آپ کے تیار کیے ہوئے افراد میں سے ایک ایک فرد نبوت کا شاہکار ہے اور نوع انسانی کے شرف وافتخار کا باعث۔ انسانیت کے اس پورے مرقعے میں بلکہ پوری کائنات میں پیغمبروں کو چھوڑ کر اس سے زیادہ حسین وجمیل اس سے زیادہ دلکش ودل آویز تصویر نہیں ملتی جو ان کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کی سیرت سازی میں جو اسلوب اختیار فرمایا اور جس طرز پر ان کی تربیت فرمائی، ہم نے راویوں کے حالات میں ان پہلوؤں کو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ تعلیم وتربیت اور دعوت کے میدان میں داعیوں، معلّموں اور مربیوں کے لیے یہ کتاب نمونہ ثابت ہو۔

یہ کتاب "دراسات تربوية في الاحاديث النبوية" کے نام سے سعودی عرب کے مشہور مکتبہ "عبیکان" ریاض سے کافی دنوں پہلے شائع ہو چکی ہے۔ ہمارے عزیز ومخلص دوست مولانا شمس الحق ندوی ایڈیٹر پندرہ روزہ "تعمیر حیات" دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو نے نہایت خلوص اور محبت کے ساتھ اس کا سلیس، عام فہم اور دل کش اُردو ترجمہ کیا، اُسے بالاقساط "تعمیر حیات" میں شائع کیا اور قارئین کے گراں قدر تاثرات کے پیش نظر اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کا مشورہ دیا۔ میں اس نوازش کے لیے ان کا تہہ دل سے ممنون ومتشکر ہوں۔

دینی ودعوتی کتابوں کا مشہور ادارہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز دہلی اور اس کے ذمے داران بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے تدبر حدیث حصہ اول کے بعد تدبر حدیث حصہ دوم کی اشاعت کو بھی اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کیا اور اس کی کمپوزنگ، تصحیح اور طباعت کا بہترین انتظام کیا۔

میں اپنے برادر نسبتی جناب نیاز واحدی کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اس کی اشاعت کے سلسلے میں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز کے متعلقہ ذمے داروں سے برابر رابطہ رکھا اور اشاعت کے سلسلے کی الجھنوں کو دور کرنے میں اُنھیں اپنا تعاون پیش کیا۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام بھائیوں کا حامی و ناصر ہو اور انہیں دینی و دنیوی ترقیات سے سرفراز کرے، جنہوں نے اس کے رسولؐ کے کلام کی اشاعت میں کسی بھی قسم کا تعاون کیا۔

سید محمد لقمان الاعظمی الندوی
حائل، المملكة السعودية العربية

حدیث-۱

ظاہر و باطن میں یکسانی

عن ابی هریرة رضی الله عنه قال: قال رسول اللهﷺ
''ان الله لاینظر الی صورکم واموالکم، ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم.'' (صحیح مسلم۔ابن ماجہ۔مسند احمد)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ تمہاری شکلوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔''

مفہوم

اللہ کے نبی جس قوم میں تشریف لائے وہ ایک بادیہ نشین قوم تھی، ان کے اپنے خاص رواج تھے، فخر ومباہات کے خاص معیار تھے، غیرت، خودداری، ہمت وجواں مردی ان کی شان امتیازی تھی اور ان سب صفات کی ان کے یہاں متعین شکلیں تھیں، مروجہ معیار تھے جن پر وہ جمے ہوئے تھے۔ ان سب چیزوں میں شہرت طلبی اور ریاکاری کی روح کارفرما تھی۔ اسلام نے آ کر ان کے ان آبائی اطوار وعادات کی اصلاح کی، ان کو ریا اور ظاہر پرستی سے پاک کیا، اور ان کو تقویٰ وخوفِ خدا، اخلاص وللّٰہیت، ایمان واحتساب کی سوغات پیش کی اور یہ کام بتدریج دھیرے دھیرے انجام دیا جاتا رہا۔ عربوں میں یہ رواج تھا کہ وہ بتوں پر اپنی قربانیوں کا گوشت چڑھاتے تھے اور ان پر اس کا خون چھڑکتے، اس ذہنیت کی اصلاح اور باطل رسم کو مٹانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْكُمْ۔'' (الحج:۳۷) خدا تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ خون بلکہ اس تک تمہاری پرہیزگاری پہنچتی ہے۔

اس طرح اسلام نے فخر و ریا اور ظاہر پرستی کی جڑ کاٹ دی، اور ایک جاہلی عادت جو ایمان واحتساب کے منافی تھی اس کو باطل قرار دیا اور ایک اصول مقرر کیا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اصل قیمت خلوص نیت اور ایمان وتقویٰ کی ہے۔ اس حدیث سے بھی اسی مفہوم کی تاکید ہوتی ہے کہ "اللہ تعالیٰ شکلوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تو کیفیت کو دیکھتا ہے، دل کو دیکھتا ہے" یہ حدیث حقیقت ایمان کی تصویر پیش کرتی ہے کہ اعمال کی روح تقویٰ ہے، آدمی کو ہمہ وقت اللہ سے ڈرنا چاہئے، ظاہر میں بھی باطن میں بھی، خلوت میں بھی جلوت میں بھی۔ اس حدیث کا مقصد ہے کہ آدمی کا دل تمام شبہات اور خلوص کے منافی باتوں سے پاک ہو یہاں تک کہ وہ مرتبہ احسان پر فائز ہو جائے اور جب انسان احسان کے مرتبے تک پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کا ہر عمل اللہ کی رضا کے لئے ہوتا ہے اور وہ ہر طرح کے معاصی سے دور رہتا ہے۔ اللہ کا دھیان ہر وقت اس کے دل ودماغ میں سمایا رہتا ہے، وہ جو قدم بھی اٹھاتا ہے اللہ کا خوف اس سے جدا نہیں ہوتا۔ اللہ کا دھیان اس کے ذہن ودماغ سے الگ نہیں ہوتا ہے، تمام حرکات وسکنات میں رضائے الٰہی اور خوشنودئ رب ہی اس کا مقصود ہوتا ہے۔ اور پھر اس طرح اس کی پوری زندگی عبادت بن جاتی ہے، پھر وہ رہتا تو اس زمین پر ہے لیکن آسمان اس کی روح پر ہوتی ہے۔

ان اللہ لا ینظر الی صورکم (اللہ تمہاری صورتوں پر نظر نہیں کرتا) یعنی وہ اس صورت کا کوئی اعتبار نہیں کرتا جس کے پیچھے حقیقت نہ ہو، اس عبادت کو قبول نہیں کرتا جس میں روح ایمانی نہ ہو، انسان کے ہر عمل کی قیمت اس کی نیت کے مطابق ہوتی ہے۔ انما الاعمال بالنیات۔ اگر وہ اپنے اعمال میں مخلص ہے اللہ کی رضا اس کا مقصد ہے اور وہ ریا ونفاق سے دور ہے تو اس کے چھوٹے سے عمل کی بھی بڑی قدر وقیمت ہے۔ یہ نہ ہو تو پہاڑ کے برابر بھی عمل کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

دوسرا جملہ اس حدیث کا یہ ہے کہ "اللہ تمہارے مالوں کو بھی نہیں دیکھتا"، یعنی جس مال سے صدقہ وخیرات نہ کیا جائے، سائل کا حق ادا نہ کیا جائے، محروم وتہی دستوں کا تعاون نہ کیا جائے، والدین اور رشتہ داروں سے سلوک نہ کیا جائے، ان مالوں پر اللہ پسندیدگی کی نگاہ نہیں فرماتا ہے۔

اللہ کے نبی ﷺ کی یہ رہنمائیاں اور ہدایتیں ایک مومن کے لئے بہت بڑی نعمت ہیں، جن سے روشنی حاصل کر کے وہ اللہ کی اس عظیم نعمت (مال) سے صحیح استفادہ کر سکتا ہے اور اس کو اس کے مواقع میں خرچ کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ مال ایک بہت بڑی نعمت ہے لیکن اس وقت

جب کہ اس کا استعمال حکم خدا کے مطابق ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَمِمَّا رَزَقْنٰہُمْ یُنْفِقُوْنَ۔'' (البقرۃ:۳) (اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں) اللہ تعالیٰ اس مال سے بہت خوش ہوتا ہے، جس کو اللہ کے راستے میں خرچ کیا جائے اور اس سے اللہ کی رضا طلب کی جائے۔ اس کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذیً لَّھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (البقرہ:۲۶۲)

''جو لوگ اپنا مال خدا کے راستے میں صرف کرتے ہیں پھر اس کے بعد نہ اس خرچ کا (کسی پر) احسان رکھتے ہیں اور نہ (کسی کو) تکلیف دیتے ہیں، ان کا صلہ ان کے پروردگار کے پاس تیار ہے قیامت کے روز نہ ان کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

جب آدمی سخاوت و فیاضی کے ساتھ اور رضاء الٰہی کی جستجو میں صدقہ وخیرات کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مال میں برکت دیتا ہے اور اس میں اضافہ کرتا ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَتَثْبِیْتاً مِّنْ اَنْفُسِھِمْ کَمَثَلِ جَنَّۃٍ بِرَبْوَۃٍ اَصَابَھَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُکُلَھَا ضِعْفَیْنِ، فَاِنْ لَّمْ یُصِبْھَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (البقرہ:۲۶۵)

''اور جو لوگ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور خلوص نیت سے اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایک باغ کی سی ہے جو اونچی جگہ پر واقع ہو (جب) اس پر مینہ پڑے تو دگنا پھل لائے۔ اگر مینہ نہ بھی پڑے تو خیر پھوار ہی سہی اور خدا تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔''

یہ ہیں وہ مبارک مواقع جہاں خرچ کرنے سے اللہ راضی ہوتا ہے، اس کے برعکس اگر کوئی ریاکاری کے طور پر روپے بہاتا ہے تو اللہ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ

وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَنۡ يَّكُنِ الشَّيۡطَانُ لَه قَرِيۡناً فَسَآءَ قَرِيۡناً
(النساء:٣٨)

''اور خرچ بھی کریں تو (خدا کے لئے نہیں بلکہ) لوگوں کو دکھانے کو اور ایمان نہ خدا پر لائیں نہ روزِ آخرت پر (ایسے لوگوں کا ساتھی شیطان ہے) اور جس کا ساتھی شیطان ہوا تو (کچھ شک نہیں) وہ برا ساتھی ہے۔''

تیسرا جملہ حدیث شریف کا یہ ہے ''ولکن ینظر الی قلوبکم' اللہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے، یعنی وہ دل جو تقوی کا محل ہے جو ایمانی جوہر کا ظرف ہے اور جہاں طاقت کا خزانہ چھپا ہوتا ہے اللہ اس کو دیکھتا ہے، یعنی اللہ کے یہاں قدر و قیمت، تقویٰ کی ہے۔ تقویٰ پر اللہ ثواب دیتا ہے، راضی ہوتا ہے، رحمتوں اور برکتوں کی بارش فرماتا ہے، ایسے بندوں کو اپنے قرب کی سے نوازتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَمَثُوۡبَةٌ مِّنۡ عِنۡدِاللّٰهِ خَيۡرٌ لَوۡكَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ۔ (البقرہ:١٠٣)

''اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو خدا کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔ اے کاش وہ اس سے واقف ہوتے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡقُرٰىٓ اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ، وَلٰكِنۡ كَذَّبُوۡا فَاَخَذۡنَاهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ۔ (الاعراف:٩٦)

''اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہوجاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے مگر انہوں نے تکذیب کی، سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔''

اسلاف نے اس حقیقت کو سمجھا تھا کہ اللہ کی نظر عنایت دل کی کیفیت کی بنا پر ہوتی ہے جس کا دل صاف و پاک ہوتا ہے اللہ اس کی نصرت اور غیبی اعانت فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّالَّذِیۡنَ ہُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ (النحل:۱۲۸)

''کچھ شک نہیں کہ جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکوکار ہیں، خدا ان کا مددگار ہے۔''

چوتھا نکتہ حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡ لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا۔'' (الکھف:۱۱۰)

''تو جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی امید رکھے اس کو چاہئے کہ عمل نیک کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔''

حدیث کا فقہی پہلو

حدیث کا خلاصہ یہ نکلا کہ عبادات کی جان یہ ہے کہ بغیر کسی ریا اور دکھاوے کے اللہ کی اطاعت کی جائے، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ریا کو شرک اصغر بتایا ہے۔ ارشاد فرمایا:

ان اخوف ما اخاف علیکم الشرک الاصغر قالوا: وما الشرک الصغر؟ یا رسول اللّٰہ! قال: الریاء (احمد والطبرانی)

''مجھے تمہارے بارے میں شرک اصغر کا اندیشہ ہے صحابہؓ نے سوال کیا کہ شرک اصغر کیا ہے؟ اے اللہ کے رسول! آپ نے کہا: ریا ونمود''

آپ نے ریا کی طرف خاص طور پر تنبیہ فرمائی اس لیے کہ وہ آہستہ آہستہ دلوں کی طرف اپنا راستہ بنالیتی ہے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ ریاکاری بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو آدمی عمل صالح فاسد نیت سے کرے تو یہ بہت خطرناک ہے اور دوسرے یہ کہ نیک کام میں رضا تو اللہ کی مقصود ہے لیکن بعد میں بغیر قصد کے دوسری غرض بھی شامل ہوجائے تو اس کا معاملہ ہلکا ہے اس سے اس کا عمل باطل نہیں ہوتا۔ پھر اس میں بھی دو حالتیں ہوں گی ایک یہ کہ جب بھی دوسری غرض اس کے ذہن میں آتی ہے وہ اس کو دور کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے اور اپنے دھیان کو اللہ کی طرف لگاتا ہے تو اس میں تو اتفاق ہے کہ اس کا عمل باطل نہ ہوگا۔ اور اس کو پورا اجر ملے گا اور

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ دوسری غرض کو دل سے ہٹاتا نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کی رضا کے ساتھ جو کہ اس کی اصل نیت ہے وہ اس غرض کو بھی جو بعد میں پیدا ہوگئی اور ضمنی طور پر آ گئی ہے۔ شامل رکھتا ہے تو اس کا حکم کیا ہے؟ اس کے بارے میں اسلاف میں اختلاف ہے۔ امام احمد اور ابن جریر نے راجح اس کو قرار دیا ہے کہ اس سے بھی اس کا عمل باطل نہیں ہوگا اور اس کو اس کی پہلی اور اصل نیت کے مطابق صلہ ملے گا۔ حضرت حسن بصری سے بھی یہی نقل کیا گیا ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

اس حدیث سے پانچ نکات اخذ کئے جا سکتے ہیں:

(۱) ہر عمل میں اخلاص ہو، غیر اللہ کی عبودیت سے اپنے دل کو خالی کر لے۔

(۲) مومن اپنے اندر تقویٰ کو پروان چڑھائے، اپنے آپ کو اس کے سانچے میں ڈھالے کیونکہ اس سے اس کی نجات اور اللہ کی رضا وابستہ ہے۔

(۳) حدیث ان عادات واطوار کو چھوڑنے کی دعوت دیتی ہے جو اخلاص کے منافی ہیں اور مظاہر پرستی اور شکلوں پر زیادہ توجہ مرکوز کرنے سے دور رہنے کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے۔

(۴) حدیث کا منشا یہ نہیں کہ آدمی ظاہر کی بالکل ہی فکر نہ کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ صرف اسی پر انحصار نہ کرے۔ ورنہ شرعاً یہ مطلوب ہے کہ ایک مومن کا باطن بھی پاک ہو اور ظاہر بھی صاف ستھرا اور پاکیزہ ہو اور اس کا چہرہ مہرہ لباس بھی اچھا ہو، اس طرح دونوں پہلوؤں سے اس کی شخصیت کامل ہوگی۔

(۵) امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس حدیث سے پتا چلا کہ قلب وہ محل ہے جس پر اللہ کی نظر ہوتی ہے، تو اب بڑا تعجب ہے اس شخص پر جو اپنے چہرے اور ظاہر پر تو خوب توجہ کرتا ہے اس کو سجاتا ہے سنوارتا، میل کچیل سے صاف کرتا ہے کہ لوگوں کے دیکھنے کا محل ہے کہیں ایسا نہ ہو کوئی اس کا عیب دیکھ لے۔ اور اپنے دل پر ذرا بھی دھیان نہیں دیتا جو کہ نظر خداوندی کا محل ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس کو ہر طرح کی گندگی سے پاک وصاف رکھتا کہ خالق کی نظر جب ہو تو اس پر کوئی عیب نہ ہو اور قلب سلیم ہو۔

حدیث-۲

چار قسم کے لوگ

عن سعید الطائی ابی البختری انه قال: حدثنی ابو کبشه الانماری انه سمع رسول اللّٰہﷺ یقول: ثلاث اقسم علیهن واحدثکم حدیثا فاحفظوه، قال: مانقص مال عبد من صدقة، ولا ظلم عبد مظلمة صبر علیها الا زاده اللّٰه عزا. ولا فتح عبد باب مسألة الا فتح اللّٰه علیه باب فقر. او کلمة نحوها، واحدثکم حدیثاً فاحفظوه فقال: انما الدنیا لاربعة نفر: عبد رزقه اللّٰه مالا وعلما فهو یتقی ربه فیه ویصل به رحمه ویعلم للّٰه فیه حقا فهذا بافضل المنازل، وعبد رزقه اللّٰه علما ولم یرزقه مالا فهو صادق النیة یقول: لو ان لی مالا لعملت فیه عمل فلان فهو بنیته فاجرهما سواء. وعبد رزقه اللّٰه مالا ولم یرزقه علما یخبط فی ماله بغیر علم. لایتقی فیه ربه ولا یصل رحمه ولا یعلم للّٰه فیه حقاً فهو باخبث المنازل، وعبد لم یرزقه اللّٰه مالا ولا علما فهو یقول: لو ان لی مالا لعملت فیه بعمل فلان فهو بنیته فوزرهما سواء.

(مسند الامام احمد بن حنبل: ج۴ ص۲۳۱۔ تحفة الاحوذی)

''سعید طائی ابوبختری سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا مجھ سے ابوکبشہ انماری نے بیان کیا کہ انہوں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں، تم سے ایک بات بیان کررہا ہوں اس کو یاد کرلو، کسی بندے کا مال صدقہ کرنے سے کم نہیں ہوتا، جس بندے پر بھی کوئی ظلم ہوتا ہے اور وہ صبر سے کام لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت کو بڑھاتا ہے جو بندہ سوال کا دروازہ کھولتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ فقر کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ یا اسی سے ملتا جلتا لفظ فرمایا اور تم سے ایک بات بیان کرتا ہوں اسے یاد رکھو۔ پھر فرمایا: دنیا میں چار قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں، ایک ایسا بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی دیا ہو، علم بھی دیا ہو، وہ بندہ مال میں اللہ تعالیٰ کے حکموں کا پاس ولحاظ رکھتا ہے اور اس کے ذریعے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کے حق (یعنی انفاق فی سبیل اللہ) کو ادا کرتا ہے، یہ بہترین درجہ ہے۔ ایک ایسا بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم تو دیا لیکن مال سے محروم رکھا، لیکن وہ مخلص ہے وہ تمنا کرتا ہے کہ کاش میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی فلاں کی طرح اعمال خیر میں خرچ کرتا۔ اس کو اس کی نیت کا ثواب ملے گا۔ یہ شخص اور مال کو صحیح مصرف میں خرچ کرنے والا، دونوں شخص ثواب میں برابر ہوں گے۔ ایک ایسا بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال تو دیا لیکن وہ علم سے عاری ہے۔ بلا سمجھے بوجھے غلط جگہوں پر خرچ کرتا ہے۔ نہ اس میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے اور نہ صلہ رحمی کرتا ہے، نہ ہی کسی اور حق کو جانتا ہے۔ یہ بدترین مرتبہ ہے اور ایک ایسا بندہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نہ مال دیا اور نہ علم۔ وہ دل ہی دل میں کہتا ہے کہ کاش ہمارے پاس مال ہوتا تو ہم بھی فلاں کی طرح (عیش وعشرت میں) خرچ کرتے اس کے ساتھ اس کی نیت ہے اس کے حساب سے معاملہ ہوگا۔ دونوں کا انجام یکساں ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو پیدا فرمایا تو انسان کے آرام وراحت کے لئے اس کو فرحت بخش اور دلکش چیزوں سے سجایا اور حسن وخوبصورتی بخشی تاکہ انسان زمین میں کھیتی باڑی کرے اور اس کے اندر کے معدنیات کو بھی تلاش کرکے ان چیزوں کو بڑھائے اور نتیجہ میں زندگی ترقی کرے اور نئی نئی چیزیں سامنے آتی رہیں اور زمین میں انسان کی خلافت عملی شکل اختیار کرے۔ لیکن یہ سب

اس طرح ہو کہ ان کے حصول سے آخرت کا نفع پیش نظر رہے۔ وہ اس کی راہ سے پھریں نہیں اور ساز وسامان میں لگ کر آخرت کے تقاضوں سے غافل نہ ہوں اور دنیوی لذتوں میں پھنس کر نہ رہ جائیں، لہٰذا حضور ﷺ صحابہ کرام کے سامنے زندگی کا ساتھ دینے والی اعتدال کی راہ کو واضح اور بیان فرماتے رہتے تھے، جس سے دنیا ان کے سامنے حقیر معلوم ہوتی تھی۔

(چنانچہ حضرت مسعر بن سعد سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی قیمت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا۔) (تحفۃ الاحوذی ج ۴)

اس لئے کہ کافر اللہ کا دشمن ہے اور دشمن کو کوئی بھی ایسی چیز جو کچھ بھی قیمت رکھتی ہو نہیں دی جاتی۔ دنیا کی لذیذ زندگی اور اس کی پرکشش خوبصورتی بندۂ مومن کو فریفتہ کر لیتی ہے اور دھوکے میں ڈال دیتی ہے، جس کے نتیجے میں وہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی ہمسری کرنے کے لئے دنیا کی طرف کھنچتا ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ تربیت کے لئے نظر آنے والے اور سنائی دینے والے وسائل سے بھی کام لیتے تھے تاکہ مومنین کو زندگی کی لذتوں کی طرف مائل ہونے سے روک سکیں۔ چنانچہ مستورد بن شداد سے مروی ہے کہ میں اس جماعت کے ساتھ تھا جو حضور ﷺ کے ساتھ بکری کے مردار بچے کے پاس رُکی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

دیکھ رہے ہو یہ مردہ بکری بکری والوں کی نظر میں بے قیمت تھی جبھی اس کو پھینک دیا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا۔ اللہ کے رسول اس کے بے قیمت ہونے کی وجہ سے ان لوگوں نے اس کو یہاں ڈال دیا ہے۔ تب آپؐ نے فرمایا: دنیا اللہ کے نزدیک اس سے بھی گھٹیا ہے جتنی یہ مردار بکری، بکری والوں کے نزدیک۔

یہ بڑا مؤثر ومبارک انداز تربیت ہے کہ آپ ﷺ چل رہے ہیں، صحابہ کرام بھی آپ کے ہمرکاب ہیں، آپ زمین پر پھینکی ہوئی ایک مردار بکری کے پاس ان کو روک لیتے ہیں پھر اس بدبودار منظر کی طرف ان کو متوجہ کر کے ان کے اندرونی احساسات کو ابھارتے ہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں: تم دیکھ رہے ہو! جب یہ بکری اپنے مالکوں کی نظر میں بے قیمت ہوگئی تبھی تو اس کو یہاں ڈالا ہے؟ صحابہ کرام نے جواب دیا۔ اللہ کے رسولؐ سچ ہے جب یہ کسی کام کی نہ رہی جبھی

اس کو پھینکا ہے۔ اس حسی اور مشاہد منظر سے آپ ﷺ فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ فرماتے ہوئے ان کو ایک تربیتی سبق دیتے ہیں کہ دنیا اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ بے قیمت ہے جتنی یہ مردار بکری، اپنے مالک کے نزدیک۔

یہ نبوی طرز تربیت انسان کی زندگی میں اعتدال وتوازن پیدا کرتا ہے اور طبعی زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ جس میں نہ محرومی ہے نہ فطری سادہ زندگی کے اقدار کو پامال کیا جاتا ہے، روحانی ترقی کے حصول کی قوت عطا کرتا ہے۔

یہ تربیتی مواقع اکثر پیش آتے رہتے ہیں، الفاظ کبھی سخت ہوتے ہیں کبھی نرم۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں ہم نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ''الدنیا ملعونة ملعون مافیها الاذکر الله وماوالاه وعالم ومتعلم'' اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس سے متعلق چیزیں عالم اور متعلّم کے علاوہ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے سب ملعون ہے۔

(تحفۃ الاحوذی)

تربیت کے معانی اور دنیا کی طرف بندۂ مومن کی نظر کی وضاحت آپ ﷺ کے ذیل کے ارشاد سے ہوتی ہے:

تین باتوں کی قسم کھا کر تم سے ایک بات بیان کرتا ہوں۔ اسے یاد رکھو۔ فرمایا:

صدقہ کرنے سے کسی بندے کا مال کم نہیں ہوتا'' یہ موقع انسانی نفس ومزاج اور آدمی کے اندرونی احساسات کے سمجھنے اور اس کی روشنی میں بات کرنے کا متقاضی ہے۔ اس لئے کہ شیطان انسان کے اندر خون کی طرح سرایت کئے رہتا ہے اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے ڈراتا رہتا ہے کہ تمہارا مال ختم ہو جائے گا جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

اَلشَّيۡطَانُ يَعِدُكُمُ الۡفَقۡرَ وَيَاۡمُرُكُم بِالۡفَحۡشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُم مَّغۡفِرَةً مِّنۡهُ وَفَضۡلاً ؕ وَّاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۚ (البقرۃ:۲۶۸)

''(اور دیکھنا) شیطان (کا کہنا نہ ماننا وہ) تمہیں تنگدستی کا خوف دلاتا اور بے حیائی کے کام کرنے کو کہتا ہے اور خدا تم سے اپنی بخشش اور رحمت کا وعدہ کرتا ہے۔ اور خدا بڑی کشائش والا (اور) سب جاننے والا ہے۔''

آپ ﷺ اس طرف اشارہ فرماتے ہیں ”صدقے سے کسی بندے کا مال کم نہیں ہوتا اور جس بندے پر کوئی ظلم ہوتا ہے اور وہ صبر سے کام لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت کو بڑھاتا ہے۔

یہ ظلم دنیا طلبی ہی کے سبب سے ہوتا ہے۔ اور دنیا سے محبت ہی کے سبب سوال کا دروازہ کھلتا اور اس پر اصرار ہوتا ہے۔ اس نفسانی بیماری کو دور کرنے کے لئے آپ ﷺ آگاہ فرماتے ہیں کہ جو شخص سوال کا دروازہ کھولے گا اس کے لئے اللہ تعالیٰ فقر کا دروازہ کھول دے گا یا اسی جیسا لفظ فرمایا: آپ ﷺ دنیا کی محبت اور اس میں غرق ہونے کے مرض کا علاج بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس دنیا کے بارے میں بندۂ مومن کا حال چار صورتوں سے خالی نہیں۔ فرمایا دنیا میں چار قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ سب سے بہتر حال اس بندے کا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے مال اور علم (نفع بخش دینی علم) دونوں دیا ہے وہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ مال کو صحیح مصرف میں لگانے اور علم سے صحیح فائدہ اٹھانے کی فکر کرتا ہے، احتیاط وتقویٰ سے کام لیتا ہے۔ ان دونوں نعمتوں کے ذریعے صلہ رحمی کرتا ہے، مال کی ضرورت ہو تو اس سے فائدہ پہنچاتا ہے اور منصب وجاہ کا اثر ڈالنا ہو تو علمی وقار سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ اللہ کا حق جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لئے مال کو وقف کرتا اور علم کو پڑھاتا ہے، مسئلہ بتاتا ہے، جس بندے کو یہ دونوں نعمتیں حاصل ہوں، اس کا اللہ کے یہاں بہترین مرتبہ ہے۔

اسی طرح آپؐ نے چند جملوں کے اندر نہایت بلیغ عبارت میں اس دنیا کے ساتھ بندۂ مومن کے معاملے کو واضح فرمادیا کہ وہ دنیا کو آخرت کی کھیتی بنائے، جس سے اس کو دنیا وآخرت دونوں کا فائدہ حاصل ہو، دین کی خدمت کرے، علماء کا اکرام کرے، ضرورتمندوں اور محتاجوں کی مدد کرے، عزیزوں اور پڑوسیوں سے محبت کا اظہار کرے، عالم اسلام کے مسائل کے حل میں دلچسپی لے۔ مسلمانوں اور ضرورتمندوں کی مصیبت دور کرے، اپنے مال کو اعتدال ودانشمندی کے ساتھ خرچ کرے۔ مال کو شرعی اصولوں اور قرآنی احکام کی روشنی میں خرچ کرے، اس کا مال اطاعت خداوندی میں معین بنے اور ثواب کمانے کا وسیلہ ثابت ہو۔ مسلمانوں کی مالداری حضرت عثمانؓ بن عفان کی مالداری کی طرح ہو۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے مال کی طرح ہو، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مال وثروت کی طرح ہو۔ مومن کی دوسری قسم وہ بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا

ہے لیکن مال سے محروم رکھا ہے، علم سے مراد ظاہر ہے دینی علم ہے جو نافع ہو اس کو مال کی نعمت نہیں حاصل کہ عزیزوں پر خرچ کرے، مال والے شخص کی طرح اللہ کی راہ میں دے۔

یہ علماء، داعیوں اور مصنّفین کی جماعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو علم کی دولت سے نوازا ہے اور ان پر احسان فرمایا ہے۔ ان کی راتیں کتابوں کے مطالعے میں گزرتی ہیں اور وہ علم کے چشمے سے سیراب ہوتے ہیں اور ہر طرح معلومات کے حصول میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کو دنیا کمانے کا موقع نہیں مل پاتا، لیکن دل میں ضرورتمندوں اور محتاجوں کی خدمت کا شوق وجذبہ رہتا ہے۔ آرزومندرہتے ہیں کہ مال ہوتو ان پر خرچ کریں وہ مسلمانوں کی مصیبت دور کرنے میں حصہ لینے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ ان کو اس نیت اور ثواب کی آرزو کا وہ صلہ ملے گا جو پہلی قسم کے لوگوں سے کم نہ ہوگا۔

تیسری قسم اس بندے کی ہے جس کو مال کی نعمت تو حاصل ہے لیکن وہ علم سے محروم ہے، لہٰذا لاعلمی کے سبب مال کو جا و بے جا خرچ کرتا ہے، اس میں ذرا بھی خوف خدا نہیں ہوتا، یا اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے میں لگا رہتا ہے۔ قاریؒ نے یہ وضاحت کی کہ علم نہ ہونے کی وجہ سے دنیا کی محبت وحرص میں مال کو خرچ نہیں کرتا ہے۔ خرچ کرتا ہے تو شہرت ونا موری کے لئے۔ مال کے حصول وخرچ دونوں میں اس کے دل میں اللہ کا خوف نہیں ہوتا۔

مال کا لالچ، بخل اور حرص کی وجہ سے عزیزوں اور رشتہ داروں پر نہیں خرچ کرتا کہ نہ اس میں رحم کا مادہ ہوتا ہے اور نہ حلم و بردباری ہوتی ہے، اپنے مال کے اندر کسی اور کا حق ہی نہیں سمجھتا ہے۔ مشکوٰۃ میں ہے یعنی مالی حق وفریضہ کو ادا ہی نہیں کرتا۔ ملا علی قاری تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا یا بندوں سے جو بھی حقوق متعلق ہیں ان کو نہیں ادا کرتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین درجہ ہے۔

مال کی یہ قسم اور دنیا کا اس طرح حاصل ہونا بندۂ مومن کے لئے امتحان و آزمائش ہے اور منافق کے بے راہ ہو جانے اور دوسروں کے فساد اور بگاڑ کا سبب ہے۔

چوتھی قسم وہ ہے کہ نہ اس کو مال حاصل ہے اور نہ علم۔ وہ آرزو یہ کرتا ہے کہ ہم کو مال ملتا تو فلاں شخص کی طرح عیاشی و بدمستی (برے کاموں) میں خرچ کرتا یعنی وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ مال ملے تو لذت کوشی میں لگا رہے اور اخلاقی اقدار سے دور رہے، نافرمانوں سے تعلق ومحبت

رکھے، برے کے ساتھ رہے، فساد پھیلانے والوں کا ساتھ دے، انہیں میں شامل ہو جائے، انہیں کے نقش قدم پر چلے، انہیں سے ملاپ رکھے اور یہ سب کچھ بے لگام ہو کر علی الاعلان کرے۔ ایسا شخص قیامت کے دن ان برے لوگوں ہی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی جس سے محبت کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہوگا۔ حدیث مذکور بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی نیت ہی کے اعتبار سے معاملہ ہوگا۔ ان دونوں کو گناہ یکساں ہوگا۔

حدیث کا فقہی پہلو

(۱) مال دار بندۂ مومن کے فرائض میں سے ہے کہ اپنے مال کے ذریعے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ مالی تعاون اور حسن سلوک کرے۔ مال دے اور علم سکھائے اور اچھے کاموں میں مال کو خرچ کرے۔ مثلاً اسپتال بنوائے، کنویں کھدوائے اور یتیم خانے قائم کرے وغیرہ۔

(۲) حدیث سے معلوم ہوا کہ عالم کے لئے مال کی تمنا کرنا اور مال کمانے اور بڑھانے کے لئے کوشش کرنا جائز ہے تا کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے محبتِ دنیا کم کرنے اور اسلامی طرز زندگی کے اندر خرچ اور کمائی دونوں میں اعتدال ومیانہ روی کا سبق ملتا ہے۔ حدیث بتاتی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دے اور اس کو اللہ کے فیصلہ پر چھوڑ دے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے علم اور مال جو بھی پسند فرمایا، اس پر راضی وخوش رہے تو یقینی طور پر وہ دنیا وآخرت دونوں جہاں کی بہتری سے محروم نہ رہے گا۔ بلکہ اس کو بہترین درجہ حاصل ہوگا۔

(۲) حدیث علم اور ان علماء کی تحسین کرتی ہے، جن کو تعلیم وتربیت میں مشغولیت کے سبب مال کمانے اور اس کو بڑھانے کا موقع نہ مل سکا لیکن وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی

تمنا رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے برابر اجر ملے گا۔ یعنی نیک نیتی اور انفاق کے تمنا کے سبب فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا ثواب گھر بیٹھے مل جائے گا۔

(۳) حدیث ایسی جماعت کا انجام بتاتی ہے، جس کو صرف دنیا کی فکر رہتی ہے، وہ علم اور مال دونوں سے محروم ہے، لیکن اس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اس کے پاس مال ہوتا تو وہ بھی ایسی جگہوں پر خرچ کرتا۔ اس نے دنیا وآخرت دونوں سے ہاتھ دھولیا۔

حدیث۔۳

آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہے

عن عبد اللّٰہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ قال :
المرء مع من أحب (فتح الباری۔کتاب الادب م۱۰/ص ۵۵۷۔صحیح مسلم)

''حضرت عبد اللہؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''آدمی (کا حشر) اسی شخص کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت اور تعلق خاطر رہتا ہے۔''

مفہوم

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت محض زبانی دعویٰ اور جذب و مستی کے اظہار کا نام نہیں بلکہ اس زبانی دعوی اور جذب و مستی کے ساتھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل پیروی اور انھیں کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا اور آپ کے طریقۂ زندگی کو عملی طور پر برتنا بھی ضروری ہے۔ محبت کوئی گیت نہیں کہ صرف گا دینا اور لوگوں کو سنا دینا کافی ہو، اور نہ کچھ الفاظ کا صرف زبان سے ادا کر دینا ہی محبت ہے۔

بلکہ محبت نام ہے اللہ تعالیٰ کے حکموں پر چلنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کرنے کا اور زندگی میں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے دستور حیات پر عمل پیرا ہونے کا اور کسی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا دوستی رکھنا ہی اس شخص کے ساتھ محبت اور لگاؤ کی علامت ہے اور قلبی لگاؤ اور فکری یگانگت ہی وہ

طاقت ور ذریعہ ہوتا ہے، جس کے اثرات انسانی زندگی کے شب و روز میں بہت کھل کر ظاہر ہوتے ہیں۔ آپ کے اس ارشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ انسان جس قسم کے لوگوں سے تعلق و محبت رکھے گا، اسی قسم کے لوگوں کے ساتھ اس کا حشر بھی ہوگا، جس نیت سے محبت کرے گا، اسی نیت کے اعتبار سے اس کا نتیجہ بھی اس کے سامنے آئے گا۔ اجر وثواب کا دارو مدار اس کی نیت ہی پر ہوگا۔ اس لئے ہر مسلمان سے سب سے پہلے یہی مطالبہ ہوتا ہے کہ کسی سے اس کی دوستی اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہو، اور نبی کریم ﷺ سے اس کی محبت ایسی ہو کہ اس کی ایک ایک ادا، نشست و برخاست اور بول چال ہر چیز میں محبت رسول کا عکس نظر آتا ہو۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص مومن کامل اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک وہ مجھ کو اپنے ماں باپ، اولاد حتیٰ کہ تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ رکھے۔''

قرآن کریم کی اس آیت میں بھی اس کی طرف اشارہ اور حکم ملتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ، وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ۔

(آل عمران: ۳۱، ۳۲)

''اے پیغمبر لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے، کہہ دو کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم مانو اور اگر نہ مانیں تو خدا بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔''

مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان تمام لوگوں کے بارے میں قول فیصل ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت کے دعویدار تو ہیں لیکن وہ اسوۂ رسول کو نہیں اپناتے جیسا کہ صحیح میں روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس شخص نے کوئی ایسا کام کیا جو ہمارے طریقے کے مطابق نہیں وہ مردود (نامقبول) ہے۔ حضرت حسن بصری اور علمائے سلف نے فرمایا ہے کہ کچھ لوگ محبت خداوندی کے دعویدار ہوئے تو اللہ رب العالمین نے اس آیت پاک کے ذریعہ ان کی محبت کو پرکھا

اور امتحان لیا، فرمایا، ''قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ۔ آپ کہہ دیجئے اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی تم کو دوست رکھے گا۔)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس حدیث پاک اور آیت کریمہ کے مفہوم کی وضاحت وتشریح کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''دین نام ہی ہے اللہ کی خاطر محبت کرنے یا اس کی خاطر غصہ اور ناراض ہونے کا۔'' اس کے بعد آیت مذکور پڑھی۔

مفسر ابن کثیر آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہر خاص و عام کو حکم فرمایا ''قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا۔'' (کہہ دو کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم مانو اور اگر نہ مانیں) یعنی اگر اس کے اس حکم کی مخالفت کرتے ہیں، تو صاف اعلان ہے (فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْکَافِرِیْنَ) تو خدا بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

آیت سے اچھی طرح واضح ہو رہا ہے کہ شریعت کے معاملہ میں آپ ﷺ کے کسی حکم کی مخالفت کفر ہے، اور جس کے اندر یہ بات پائی جائے اللہ تعالیٰ اس سے محبت نہیں فرماتا خواہ وہ شخص اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا عقیدہ اور دعویٰ رکھتا ہو اور اس کے قرب کا حصول چاہتا ہو، تاوقتیکہ وہ نبی امی ﷺ کی پیروی نہ کرے۔

حضور ﷺ اپنے اصحاب کو بہت اچھی طرح جانتے اور ان کی خصوصیات و مزاج کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ آپ سمجھتے تھے کہ وہ بدوی ہیں ان میں نرمی و محبت کا مادہ کم ہے لہٰذا آپ ان کے اندر اس محبت کو یعنی محبت رسول ﷺ کو دھیرے دھیرے حکمت و ترغیب کے ساتھ پروان چڑھاتے تھے۔ آگے کی روایت سے اس کی اچھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔

''حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ دیہات کا ایک شخص بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کیا اللہ کے رسولؐ قیامت کب آئے گی؟''۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا تیرا برا ہو تو نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ہے جو پوچھ رہا ہے؟ اس بدوی نے جواب دیا کہ قیامت کے لئے میں نے کوئی (خاص) تیاری تو نہیں کی البتہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا تم جس سے محبت کرتے ہو (قیامت میں) اسی کے ساتھ ہو گے۔ راوی حدیث کہتے ہیں کہ یہ سن کر صحابہ نے عرض کیا ''اور اسی طرح ہم لوگ بھی''؟ آپ ﷺ

نے فرمایا: ہاں! آپ ﷺ کا جواب سن کر ہم لوگ اس دن بہت ہی زیادہ خوش ہوئے۔

(فتح الباری ج ۱۰ ص ۵۵۵)

ایک روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں (آپ کا یہ ارشاد کہ تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے محبت کرتے ہو۔ سن کر مسلمانوں کو ہم نے اتنا زیادہ خوش ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا) اس خوشی کا سبب یہ تھا کہ پورے خلوص، دل کی گہرائی اور جان قربان کردینے کی آرزوؤں کے ساتھ محبت رسول ﷺ ان کے دل میں گھر کرگئی تھی، ان کو ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کی جدائی گوارا نہ تھی۔ دنیا میں نہ آخرت میں۔ لیکن ان کے خیال وگمان میں آخرت میں آپ کی صحبت ومعیت کا حصول مشکل معلوم ہوتا تھا کہ آخرت میں ان کے اس شوق صحبت ومعیت کا اندازہ لگانے کے لئے ان میں سے بعض حضرات فراق وجدائی کے تصور سے اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ پاتے تھے۔

ابن جریر کا بیان ہے کہ سعید بن جبیرؒ نے فرمایا: حضرات انصار میں سے ایک صاحب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے چہرے پر رنج وغم کے آثار تھے، یہ منظر دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا بات ہے تم غمگین کیوں نظر آرہے ہو؟'' انھوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ دل میں ایک بات نے پریشان کر رکھا ہے، آپ نے پوچھا! وہ کیا بات ہے؟ ان انصاریؓ نے جواب میں عرض کیا: اللہ کے رسولؐ ہم صبح شام خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، آپ کے چہرۂ انور کو دیکھتے ہیں، آپ کی مبارک مجلس میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوتا ہے، ایک وقت ایسا آئے گا کہ آپ دنیا سے تشریف لے جائیں گے، انبیاء کرام کے ساتھ ہوں گے، ہماری رسائی وہاں کیوں کر ہوسکے گی۔ آپ کی یہ جدائی اور فراق ہم کس طرح برداشت کریں گے۔ آپ ﷺ خاموش رہے جواب میں کچھ نہ فرمایا۔ اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ آیت لے کر اترے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (النساء:۶۹)

''اور جو لوگ خدا اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں وہ (قیامت کے

روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے، جن پر خدا نے بڑا فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور نیک لوگ اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی خوب ہے۔''

اس آیت کے اترتے ہی ان انصاری کو آپ ﷺ نے بلایا اور خوش خبری سنائی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور حضور ﷺ کے فرمودات اور حکموں پر عمل کرے گا اور جن باتوں سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے روکا ہے، ان سے بچے گا تو اللہ جل شانہ اس کو شرف وعزت کی جگہ میں رکھیں گے، اور انبیاء کرام کا ساتھ نصیب ہوگا، اس کے بعد جن لوگوں کا رتبہ ہے یعنی صدیقین، اس کے بعد شہداء اس کے بعد عام مسلمان (صالحین کرام) سب کا ساتھ ہوگا۔ اور یہ بہترین ساتھی ہوں گے۔ آپ ﷺ کے ارشاد پاک کے یہی معنیٰ ہیں کہ آدمی جس قسم کے لوگوں سے محبت رکھے گا انھیں لوگوں کے ساتھ ہوگا۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا اور عرض کیا اللہ کے رسول ﷺ مجھے آپ سے نہایت درجہ محبت ہے، یہاں تک کہ میں گھر میں بھی آپ کو یاد کرتا ہوں میں چاہتا ہوں اور میری آرزو وتمنا رہتی ہے کہ آپ کے مرتبے میں بھی (یعنی جنت میں جہاں آپ ہوں گے) آپ کے ساتھ رہوں۔ آپ نے کچھ جواب نہ دیا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل فرمائی۔

صحیح مسلم میں ربیعۃ بن کعب اسلمی سے مروی ہے کہ میں حضور ﷺ کے ساتھ رات گذارا کرتا تھا آپ ﷺ کے لئے وضو کا پانی لاتا اور دیگر خدمات انجام دیتا۔ (میری اس خدمت گذاری سے خوش ہوکر) آپ نے فرمایا۔ مانگو! کچھ سوال کرو۔ میں نے عرض کیا اللہ کے رسول جنت میں آپ کی رفاقت کا طلب گار ہوں، آپ نے فرمایا۔ (اس کے علاوہ کچھ اور) میں نے عرض کیا میں تو بس آپ کی رفاقت ہی کا طلب گار ہوں۔ آپ نے فرمایا اگر یہ بات ہے تو کثرت سے نوافل پڑھنے میں میری مدد کرو یعنی خوب نوافل پڑھا کرو آپ کے ارشاد، کہ جس سے آدمی کو محبت ہوگی اسی کے ساتھ ہوگا۔ یہ مطلب ہے کہ آپ کی ایک ایک ادا کو اپنایا جائے کہ۔ ان المحب لمن یحب مطیع۔ عاشق اپنے معشوق کے چشم وابرو کے اشارہ پر چلتا ہے، لہٰذا جو امتی بھی آپ سے محبت کرتا ہے اس کو آپ کی ایک ایک سنت پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ محبت رسول

ﷺ کی ایک دلکش تصویر ملاحظہ ہو۔

عمرو بن مرہ جہنی سے روایت ہے کہ ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر عرض کیا: ''اللہ کے رسول میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں! اور آپ ادنیٰ شک وشبہ کے بغیر اللہ کے رسول ہیں۔ میں پنج وقتہ نمازیں پابندی سے ادا کرتا ہوں، مال کی زکوۃ دیتا ہوں، رمضان المبارک کے روزے رکھتا ہوں، (ان کی بات سن کر) آپ ﷺ نے فرمایا! جس شخص کا انتقال اس حال میں ہوگا وہ قیامت کے دن انبیاء کرام صدیقین اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

آپ ﷺ اپنی امت کو اللہ ہی کی خاطر محبت کرنے اور نیک صحبت اختیار کرنے کی طرف برابر متوجہ فرماتے رہے۔ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں کہ آدمی اپنے دوست کے ساتھ رہے گا لہٰذا اس کو دیکھ بھال کر غور وفکر کر کے دوستی کرنی چاہئے۔ پھر فرمایا: آدمی جس سے دوستی رکھے گا اسی کے ساتھ ہوگا۔

اس سے بڑھ کر وہ خوشخبری ہے جو صحاح اور مسانید میں اور دیگر صحابہ کی جماعت سے متواتر طریقوں سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایک آدمی کچھ نیک حضرات سے محبت رکھتا ہے حالانکہ ان سے ملاقات نہیں ہوسکی ہے تو آپ نے فرمایا: آدمی اسی شخص کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے حضرت انسؓ کی ایک روایت میں ہے آپ نے فرمایا: میں حضور ﷺ سے محبت کرتا ہوں، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے محبت کرتا ہوں اور اللہ کی ذات سے امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن وہ مجھے انھیں حضرات کے ساتھ اٹھائے گا، اگرچہ میں ایسے اعمال نہ کرسکا جیسے ان حضرات نے کئے ہیں۔ آپ ﷺ کے ارشاد کا یہی مطلب ہے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنتی لوگ اپنے اوپر بالا خانوں کے جنتی لوگوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے مشرق ومغرب کے افق پر مائل بغروب چمکتے ہوئے تارے نظر آتے ہیں۔ صحابۂ کرام نے عرض کیا! اللہ کے رسول ﷺ یہ تو انبیاء کرام کے مقامات ہیں دوسرے لوگ وہاں نہیں پہنچ سکتے، یہ سن کر آپ نے فرمایا کیوں نہیں۔ خدا کی قسم وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور رسولوں کی تصدیق کی، وہ اس مرتبہ کو پہنچیں گے۔ نیک صحبت کا مسئلہ صحابۂ

کرام کے قلب و روح پر طاری رہتا تھا، لہٰذا آخرت کی صحبت و معیت کی فکر بھی ان کو دامن گیر رہتی تھی کہ دنیا میں وہ صحبت نبوی کی لذت کا مزہ چکھ چکے تھے۔ یہ تو ایسی چیز ہے کہ ہر اس دل کو جو حضور ﷺ کی صحبت سے معمور و فکر مند رکھے گا کہ آخرت میں بھی یہ صحبت نصیب ہو۔ اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے لئے کچھ معیار اور پیمانے مقرر فرما دیئے ہیں۔

محبت کے سلسلے کی بنیادی چیزیں

مدینہ منورہ کا ماحول و معاشرہ تین طبقوں پر مشتمل تھا۔ مسلمان، یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین۔ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ گذشتہ ماحول کے اثرات، انس و تعلق، عادت اور طبعی میلان و کشش کبھی کبھی بعض مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ نرمی اور تعلق رکھنے پر آمادہ کرتی ہے اور وہ ان کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، لہٰذا آپ ﷺ نے اس کے لئے کچھ معیار اور پیمانے مقرر فرما دیئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''دل سے دوستی و محبت صرف بندۂ مومن سے کرو جو احساس و عقیدے میں تمھارے دل کی آواز سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اسی طرح اعزاز و تکریم کے جذبے سے تمہارا کھانا خوف خدا رکھنے والے بندے ہی کھائیں یعنی انھیں کو دلی قدر و منزلت کے ساتھ کھلاؤ اور دعوت کرو''۔ اس لئے کہ جس طرح کے لوگوں سے انس اور خلا ملا ہوگا انھیں کے ذوق و مزاج کا عکس تمھارے آئینۂ قلب پر پڑے گا۔ اچھے ساتھی اور دوست کے اثرات و فوائد اور برے ساتھیوں کے نقصانات کو آپ ﷺ نے نہایت بلیغ اور انوکھی مثال دے کر واضح فرمایا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھے اور برے ساتھی کی مثال مشک فروش اور بھٹی دھونکنے والے کی سی ہے کہ مشک فروش یا تو تمھیں کچھ خوشبو دے دے گا یا تم اس سے خرید لو گے اگر یہ دونوں باتیں بھی نہ ہوئیں تو جب تک اس کے پاس رہو گے خوشبو محسوس کرو گے، اس کے برعکس بھٹی دھونکنے والا تمھارے کپڑے جلا دے گا یا نہیں تو تمھاری ناک میں بدبو سما جائے گی، جو طبیعت کو مکدر کر دے گی''۔ (صحیح مسلم کتاب البر)

بات اچھی طرح سمجھانے اور واضح کر دینے کے لئے یہ نہایت بلیغ مثال ہے۔ اچھے آدمی کی صحبت کی مثال عطر فروش سے دی اور برے شخص کی صحبت کو بھٹی دھونکنے والے سے، اس کے ذریعے آپ ﷺ نے ملنے جلنے کا مفید طریقہ بتا دیا، ساتھی اور دوست بنانے کی غرض و غایت

کھول کر بیان فرمادی۔اسی لئے آپ ﷺ نے یہ بھی فرمادیا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی سے اللہ واسطے محبت کرتا ہو، اللہ کے دین کی وجہ سے محض بہی خواہانہ جذبہ سے انس والفت اور بھائی چارگی رکھتا ہوتو اپنے اس بھائی کو بتادے کہ میں تم سے اللہ واسطے محبت رکھتا ہوں، تاکہ وہ بھی اسی کے مطابق معاملہ کرے۔

حضرت مقدام بن معدیکرب سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے محبت کرے تو اس کو بتادے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں''۔ (تحفۃ الاحوذی م ۷ ص ۷۱)

آپ ﷺ اس تلقین وتشویق کو وقفہ وقفہ سے تازہ فرماتے رہتے تھے، اور مادی چیزوں کو بھی روحانی وقلبی تعلق سے جوڑ دیتے تھے۔ معاذ بن جبل فرماتے ہیں ہم نے آپ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میری عظمت کے سبب باہم محبت کرنے والے لوگوں کے لئے نور کے ایسے منبر ہوں گے جن پر انبیاء اور شہداء کو بھی رشک آئے گا''۔

(تحفۃ الاحوذی م ۷ ص ٦٦)

ان فرمودات نبوی پر غور وفکر کرنے سے جو تصویر ہماری نگاہوں میں بنتی ہے وہ ہم کو مدینہ منورہ کے اس پرسکون اور حسین انسانی معاشرے میں پہنچا دیتی ہے، جس کے بہت بڑے حصے کو ہم نے بھلا رکھا ہے، اس پہلو سے ہمارے اندر بڑی کمزوری آ گئی ہے۔ ہم اس سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ اس کے نہ ہونے سے ہم پر ذلت ونکبت کا گمبھیر سایہ ہے۔

مدینہ منورہ کی فضاؤں میں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی امت کے دِل میں مادی چیزوں میں بھی تعلق مع اللہ کے جذبات پیدا فرمادیتے ہیں، آپ ﷺ دلوں کو مادی پراگندگی سے اس طرح پاک وصاف فرمادیتے ہیں کہ آپ ﷺ کا امتی ایمان کامل کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے حتیٰ کہ جب وہ کسی شخص سے محبت کرتا ہے، یا کسی ایسی چیز کا طلبگار ہوتا ہے جو دنیا سے تعلق رکھتی ہے، یا اپنی کسی خواہش وچاہت کو پورا کرنا چاہتا ہے، دنیا کے کسی قانون واصول کو اپنا تا ہے، تو ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور محبت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ ہی کی رضا ومحبت کو پیشِ نظر رکھنا اس کی زندِگی کو آسان بنادیتا ہے، ہمہ وقت اور ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی

محبت ہی اس کے دل پر چھائی رہتی ہے۔

علمائے کرام نے ان اسباب ومحرکات کو بیان فرمایا ہے، جن کے اپنانے سے اللہ تعالیٰ بندے سے محبت فرماتا ہے اور بندے میں اللہ تعالیٰ سے محبت کا شوق وجذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب مدارج السالکین میں اس موضوع پر بڑی دلچسپ ومفید بحث کی ہے اور وہ اسباب گنائے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ ان میں چند ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) قرآن کریم کو غور وفکر کے ساتھ معانی کو سمجھ کر پڑھنا اور اس کی مراد کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔

(۲) فرائض کے بعد نوافل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔

(۳) ہر حال میں اس کو یاد کرنا۔ دل وزبان سے بھی عمل اور حال سے بھی۔

(۴) خواہشوں کے غلبے کے وقت اللہ تعالیٰ کی رضا اور محبت کو ترجیح دینا۔

(۵) دل سے اللہ تعالیٰ کے ناموں اور صفات کو تازہ کرتے رہنا اور ان کو پہچاننا اور دیکھنا اور اس کی معرفت ہی کی فکر میں لگے رہنا۔

(۶) اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات کا استحضار رکھنا، اس کی نشانیوں اور ظاہر و پوشیدہ نعمتوں کو یاد کرتے رہنا کہ اس سے دل میں منعم کی محبت بڑھتی جائے گی۔

(۷) اس کے سامنے انکسار وخود سپردگی کی ادا پیش کرنا۔

(۸) سحر خیزی یعنی تہجد کا اہتمام کرنا جو اللہ تعالیٰ کے سماء دنیا پر نزول کا وقت ہوتا ہے یہ دعا ومناجات کا بہترین وقت ہوتا ہے۔

(۹) اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی مجلس میں بیٹھنا اور ان کی اچھی اچھی باتوں کو دل میں اتار لینا۔

انھیں باتوں کو اختیار کر کے محبت کے مرتبے کو پہنچا جا سکتا ہے۔

دل کو صاف وشفاف رکھنے اور دنیا کی پراگندگی سے بچانے کے لئے اور نفس کو معدہ و مادہ کی محبت سے دور رکھنے، دنیا کی محبت اور موت کے خوف سے بچنے کے لئے ان مذکورہ باتوں کا خیال ودھیان رکھنا ضروری ہے۔ جس بندۂ مومن کو محبت کا یہ جام حاصل ہوگا وہ قیامت کے دن انبیاء کرام، شہداء عظام اور خدا کے برگزیدہ بندوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے معلوم ہوا کہ انسان کو اچھے اور نیک لوگوں سے دوستی کرنی چاہئے اور اچھی مجلسوں میں بیٹھنا چاہئے۔

(۲) یہ حدیث نو جوانوں کو راہ دکھاتی ہے کہ علماء کرام، دین کے داعیوں اور نیک لوگوں سے ملتے رہیں اور ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہیں، ان کے اخلاق و کردار کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں اور اچھے اعمال میں انھیں کے طریقے کو اپنائیں۔

(۳) یہ حدیث محبت اور بھائی چارہ کی دعوت ہے اور مومن میں اس بھائی چارے کا بیج بوتی ہے جو قرآن کریم کا مطلوب ہے۔ "انما المومنون اخوۃ"۔

(۴) اس موضوع پر جن احادیث کا ذکر ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن بندہ اللہ کے رسول ﷺ اور آپ کے صحابہ سے محبت رکھے گا تو خواہ وہ ان کے معیار کے بعض اعمال کو نہ کر سکے تاہم قیامت کے دن انھیں حضرات کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

حدیث - ۴

ایمان کی مٹھاس

عن انس بن مالك رضى الله عنه، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : "ثلاث من كن فيه وجد بهن حلاوة الايمان ـ أن يكون الله ورسوله أحب اليه مما سواهما ـ وأن يحب المرء لا يحبه الا لله ـ وأن يكره أن يعودَ فى الكفر بعد أن أنقذه الله منه كمايكره ان يقذف فى النار ـ (متفق عليه)

"حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کے اندر تین صفات پائی جائیں گی، اس کو ایمان کا لطف حاصل ہوگا۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر چیز سے زیادہ اس کو محبوب ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ شخص جس شخص سے بھی محبت کرے اللہ واسطے محبت کرے۔اور تیسرے یہ کہ وہ ایمان کی دولت نصیب ہونے کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹنا اتنا ہی ناپسند کرتا ہو جتنا یہ کہ اس کو آگ میں ڈالا جائے۔"

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث نہایت عظیم اور اسلام کی بنیادی اور اصولی چیزوں میں سے ایک ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ ایمان کی مٹھاس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر عمل کرنے اور ان کی خوشنودی کی خاطر مشقت جھیلنے میں لطف و مزہ آئے اور دنیا کی چیزوں پر وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند و ناپسند کو مقدم رکھے، اس پر ترجیح دے، اللہ سے بندے کی محبت یہ ہے کہ اس کے حکموں پر چلے اور جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان سے باز رہے یہی مطلب محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ہے۔ (صحیح مسلم (شرح نووی) ج ۲ ص ۱۳)

ایمان کی مٹھاس کی پہچان یہ ہے کہ بندۂ مومن کے دل میں یہ یقین جم جائے کہ پیش

آنے والی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اس کو جو پریشانی یا خوشحالی پیش آئی ہے وہ مقدر تھی اس سے ٹل نہیں سکتی تھی، اور جو چیز اس کو نہ پہنچی اس کا نہ پہنچنا یا نہ ملنا پہلے سے مقدر تھا، اگر سارے لوگ مل کر اس کو کچھ فائدہ پہنچانا چاہتے تو اس پر قادر نہیں تھے بس وہ اتنا ہی فائدہ پہنچا سکتے ہیں جتنا اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقدر فرمادیا ہے، اور اسی طرح اگر تمام لوگ مل کر اس کو نقصان پہنچانا چاہیں تو ایسا ہرگز نہیں کر سکتے بس اتنا ہی نقصان پہنچا سکیں گے جتنا اللہ تعالیٰ نے مقدر فرمادیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَاكَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔"(التوبہ:۵۱)

"کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی، بجز اس کے کہ خدا نے ہمارے لئے لکھ دی ہو وہی ہمارا کارساز ہے اور مومنوں کو خدا ہی پر بھروسا رکھنا چاہئے۔"

ایمان کے لطف و مزہ کا مطلب یہ ہے کہ بندۂ مومن غیر اللہ کے خوف، بزدلی، جزع و فزع سے آزاد ہو اور صبر و ثبات، ہمت و جواں مردی اور مہم جوئی کے جذبات سے آراستہ ہو، قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کے دعوے میں وہی شخص سچا ہے جس کا ایمان یقین کی دولت سے بہرہ ور ہو اور اس کا نفس اس پر مطمئن ہو، دل میں ایمان کی ایسی بشاشت سمائی ہو جو اس کے رگ و ریشے میں دوران خون کی طرح جاری و ساری ہو، ایسے ہی شخص کو ایمان کی مٹھاس اور اس کا لطف حاصل ہوتا ہے اور فرمایا، اللہ واسطے محبت اللہ تعالیٰ سے محبت ہی کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ محبت دل کی پسند و ناپسند کا اللہ تعالیٰ کی پسند و ناپسند کے تابع ہو جانے کا نام ہے۔ یعنی انسان اسی چیز کو پسند کرے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے بندہ بھی اس کو ناپسند کرے۔ (شرح نووی)

حلاوت ایمان کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ بندہ اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ یقین رکھے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے جس بندے کے لئے رزق میں کشادگی فرمادی کسی اور کے بس میں یہ نہیں تھا کہ اس کو روکتا، اور کوئی شخص جب تک اپنا رزق پورا نہ کر لے

اور موت کے مقررہ وقت سے پہلے کی مدت گذار نہ لے اس کی موت نہیں آ سکتی۔ حلاوت ایمان کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ مسلمان دنیا کی بہت زیادہ حرص اور اس کی طلب میں ہمہ وقت سرگرداں رہنے سے محفوظ ہو، اسی طرح وہ نفسانی لالچ، بخل اور خرچ کرنے کے موقع پر کم خرچ کرنے کے مرض سے دور ہو، بلکہ اس کے اندر جود وسخا، دوسروں کو اپنے پر مقدم رکھنے اور دینے کا شوق وجذبہ پایا جاتا ہو، وہ قناعت اور بقدر ضرورت ہی کو اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا ہو۔

حاصل کلام یہ کہ دل میں ایمان کی ایک خاص لذت اور لطف کی کیفیت پائی جاتی ہے جو تقریباً شعوری اور حسی مٹھاس جیسی ہوتی ہے بلکہ اکثر اس سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے جس سے نہایت کڑوی چیز کو دفع اور دور کیا جاسکتا ہے اس کا ادراک واحساس اسی شخص کو ہوسکتا ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہو۔ (سنن نسائی، ج ۸ ص ۹۶)

ایمانی لذت اور مٹھاس کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ بندۂ مومن خواہشوں کی غلامی، نفس امارہ کے قید وبند اور مال وزن کے فتنے سے آزاد ہو، ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنے اور اپنے ہر کام کو اسی طرح رضا وخوشنودی کی خاطر کرنے کی سعادت سے بہرہ مند ہو، اپنے ہر کام میں اسی سے مدد کا طالب ہو اور اس کی طرف سے جو کچھ بھی پیش آئے اس پر سرِ تسلیم خم رکھے، اپنی ذات سے متعلقہ فرائض اور ذمہ داریوں کو پوری امانت ومستعدی کے ساتھ ادا کرنے میں لگا ہو۔

ایمان کی لذت اور مٹھاس کا تقاضا یہ ہے کہ بندۂ مومن ایمانی لذت کی ان صورتوں کو ذیل میں مذکور طریقوں سے حاصل کرنے کی فکر کرے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ محبت حقیقی معنی میں اللہ اور اس کے رسول ہی سے ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ اللہ ہی کی مثالی ذات نے اس کو پیدا کیا ہے، بندوں کو اسی نے ظاہری وباطنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اس رحیم آقا نے پوری کائنات کی چیزوں کو انسانی ضرورتوں کے تابع بنا دیا ہے۔ اس لئے بھی حقیقی محبت کا مستحق اللہ تعالیٰ ہی ہے کہ بندہ اسی کا محتاج ہے اور ہر حال میں اس کا سہارا اور بھروسا اللہ تعالیٰ کی ہی ذات ہے، اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے:

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ

خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (النمل:۶۲)

''بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے اور کون اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے اور (کون) تم کو زمین میں (اگلوں کا) جانشین بناتا ہے (یہ سب خدا کرتا ہے) تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے (ہرگز نہیں) مگر تم بہت کم غور کرتے ہو۔''

آگے فرمایا ہے:

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ (النمل:۶۳)

''بھلا کون تم کو جنگل اور دریا کے اندھیروں میں رستہ بتاتا ہے اور (کون) ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے (یہ سب کچھ خدا کرتا ہے) تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے (ہرگز نہیں) یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں خدا (کی شان) اس سے بلند ہے۔''

آگے مزید فرماتا ہے:

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ۔ (النمل:۶۲-۶۴)

''بھلا کون پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اس کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے اور (کون) تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے (یہ سب کچھ خدا کرتا ہے) تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے (ہرگز نہیں) کہہ دو (مشرکو!) اگر تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔''

بندۂ مومن کو اللہ تعالیٰ سے محبت کے اس معیار پر ہونا چاہئے جو اس کے شایان شان ہے، کہ وہ مالک و خالق بھی ہے اور بندوں کا حاجت روا بھی، بندہ اپنے کو اسی کا محتاج سمجھتا ہے،

اسی پر بھروسا کرتا ہے، اپنی جملہ ضروریات میں اسی کی مدد کا طلبگار رہتا ہے، اس کی نعمتوں اور فضل وعنایت پر شکر گزار ہوتا ہے۔ جو بندہ ایسا نہیں کرتا وہ محبت کے دعویٰ میں جھوٹا ہے اس کو ایمان کا لطف ومزہ نہیں نصیب ہوگا۔

''اللہ اور اس کے رسول ﷺ سب سے زیادہ محبوب ہوں'' کی علماء یہ تشریح فرماتے ہیں کہ محبت سے مراد محبت اختیاری ہے طبعی نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کو نفسانی خواہشوں اور دیگر تمام چیزوں پر مقدم رکھے، اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس سے یا جس شے سے بھی محبت کرے اللہ ہی کے لئے کرے، اپنی پسند وخواہش کی وجہ سے نہ کرے، ان تمام چیزوں کو ناپسند کرے جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے اور ان سے ناراض ہوتا ہے۔ محبت و ناراضی دونوں گویا ایک ہی چیز ہیں کہ بندہ اپنے کو رب ذوالجلال کی پسند وناپسند کے تابع کر دے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی پورے طور پر بندے کو محبوب ہو۔ اپنی ذات اور نفس اللہ تعالیٰ کے سامنے ہیچ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور طرف نظر جائے ہی نہیں کہ یہ اسی کا غلام اور بندہ ہے اور غلام تو آقا ہی کے چشم وابرو کے اشارہ کا منتظر اور اسی کی پسند وناپسند کے تابع ہوتا ہے۔ جب یہ بات پائی جائے گی جبھی بندے کا نفس اللہ تعالیٰ کی ذات کے سامنے فنا ہوگا۔ اسی وقت اس پر حضور ﷺ کا یہ ارشاد پوری طرح منطبق ہوگا کہ تم میں کا کوئی شخص اس وقت تک مومن کامل نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ (سنن نسائی، جلد ۸ ص ۹۶)

اس کے بعد اپنی محبت اور دوستی اللہ کے رسول ؐ کی مرضی کے تابع کر دے اس لیے کہ آپ ہی کی ذات (ان تمام لوگوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہونے میں جو انسانیت کے بلند مقام کے خواہاں ہوں اور بڑائی اور کمال کے مرتبے پر پہنچنا چاہتے ہوں) اس کی مستحق ہے، آپ کی ذات اس لیے بھی اس محبت ودوستی کی مستحق ہے کہ آپ نے اپنے رب کی امانت بندوں تک پہنچانے کا حق ادا کیا، اپنے رب کا پیغام بندوں تک پہنچایا اور امت کی بہی خواہی کا حق ادا کیا۔

نبی کریم ﷺ سے ہماری محبت کا مطالبہ اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

صحابہ کرام کے حالات میں آپ ﷺ سے بے پناہ محبت کے عجیب وغریب واقعات ملتے ہیں۔امام بیہقی نے حضرت عروہ سے روایت کیا ہے کہ ''جب مشرکین زید بن دثنہ کو قتل کرنے کی غرض سے حرم سے باہر مقام تنعیم میں لے گئے اور راستے میں حضرت خبیبؓ بن عدی انصاری اور زید بن دثنہ کی ملاقات ہوگئی تو دونوں نے ایک دوسرے کو یہ نصیحت وتلقین کی کہ اس راہ میں جو بھی مصیبت پیش آئے اس پر صبر وثابت قدمی کے ساتھ جمے رہنا،حضرت ابوسفیانؓ جواس وقت کافر تھے، انھوں نے زید بن دثنہ سے کہا کہ تم کو خدا کی قسم دلا کر کہتا ہوں، بتاؤ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ اس وقت ہمارے قبضے میں محمدﷺ تمہاری جگہ ہوں، ہم ان کی گردن مار دیں اور تم بجائے دار پر ہونے کے اپنے گھر والوں میں رہو؟

ابوسفیانؓ کے جواب میں حضرت زیدؓ نے فرمایا: خدا کی قسم مجھے یہ تک گوارا نہیں کہ محمدﷺ اس وقت ہماری جگہ ہوں اوران کو کوئی کانٹا بھی چبھے اور میں اپنے اہل وعیال میں رہوں۔

یہ سن کر ابوسفیانؓ نے کہا : ''ہم نے کسی کو کسی سے ایسی محبت کرتے نہیں دیکھا جس طرح محمدﷺ کے ساتھی محمدﷺ سے محبت کرتے ہیں''۔

نسیبۃ بنت سعد انصاری کا قصہ ہے کہ غزوۂ اُحد میں ان کے بھائی، باپ اورشوہر تینوں شہید ہو گئے تھے۔ جب ان کو اس کی خبر دی گئی تو پوچھا حضورﷺ کا کیا حال ہے، مقصود خیریت پوچھنا تھا،لوگوں نے بتایا کہ آپﷺ خیریت سے ہیں! یہ سن کر ان کو چین نہ آیا اور کہا، مجھے دکھا دو میں اپنی آنکھوں سے آپﷺ کو دیکھ لوں۔ جب آپﷺ کو دیکھ لیا تب دل کو قرار آیا اور کہا کہ آپ موجود ہیں تو ہر مصیبت ہیچ ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کو اللہ جل شانہ اور اس کے رسول محمدﷺ سے خلوص کے ساتھ محبت ہوتی ہے، وہ ان کی آواز پر لبیک کہے اور ان کا حکم بجا لائے، اور جن چیزوں سے منع فرمائیں، ان سے باز رہے ورنہ وہ محبت کے دعویٰ میں جھوٹا اور ایمان کی کڑی کو توڑنے والا شمار ہوگا۔

آپ ﷺ کے ارشاد: ''آدمی آدمی سے محبت کرے اور یہ محبت صرف اللہ کے لئے ہو'' کی تشریح میں یحیٰ ابن معاذ فرماتے ہیں: اللہ واسطے محبت کی حقیقت یہ ہے کہ حسن سلوک کے

موقعے پر حد سے آگے نہ بڑھے کہ کسی دوسرے کی حق تلفی ہو جائے اور سختی کے موقعے پر سختی کرنے میں کمی نہ کرے۔ (فتح الباری، کتاب الایمان م ۱/۶۲)

یہ حدیث اخوت اسلامی کا درس دیتی ہے جو اس وقت تک خالص نہیں ہو سکتی، نہ ہی پائیدار ہو سکتی ہے، نہ اس میں تعاون کا جذبہ ہو سکتا ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہ ہو اور اس محبت سے اللہ کی رضا نہ مقصود ہو، اور یہ اس وقت نصیب ہوتا ہے جب مومن کو ایمان کی مٹھاس اور چاشنی حاصل ہوتی ہے یہی وہ چیز ہے جس کی ایک سے زیادہ حدیثوں میں آپ ﷺ نے تاکید فرمائی ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا ''تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو''۔

(فتح الباری، کتاب الایمان م ۱/ص ۶۲)

آپ ﷺ اس اسلامی اخوت کو مختلف مواقع پر بیان فرماتے رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ شخص ہے جو ان تمام چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے''۔ (فتح الباری، کتاب الایمان م ۱/ص ۶۲)

صحیح اسلامی اخوت اس وقت تک ایمان کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتی جب تک تقویٰ نہ ہو۔ اس لیے کہ ایمان کے بغیر اُخوت کا پایا جانا مشکل اور تقویٰ کے بغیر سچائی اور دوستی کا پایا جانا دشوار، اخوت ایمان کے بغیر نہیں پائی جا سکتی، اس کا ثبوت تو یہ آیت کریمہ ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات: ۱۰) مومن تو آپس میں بھائی ہیں۔ اور تقویٰ کے بغیر دوستی نہیں ہو سکتی اس کی دلیل یہ آیت ہے:

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ

(الزخرف: ۶۷)

''جو (آپس میں) دوست (ہیں) اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیزگار (کہ باہم دوست ہی رہیں گے)۔''

جو شخص صاحب ایمان ہوتا ہے اور اس کے ایمان پر تقویٰ کا رنگ بھی چڑھا ہوتا ہے، تو اس شخص کو ''کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ کبوتر با کبوتر باز با باز'' کے اصول کے تحت ملاقات و تعارف کے پہلے ہی لمحے میں اس شخص سے محبت وانس پیدا ہو جاتا ہے، جو ایمان وتقویٰ کا حامل ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے روحیں تیار کیا ہوا لشکر ہیں جو ان میں سے ایک دوسرے سے متعارف ہوتی ہیں باہم مل جاتی ہیں مانوس ہو جاتی ہیں۔ اور جو ایک دوسرے کے لئے اجنبی اور الگ نوعیت کی ہوتی ہیں ایک دوسرے سے دور ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ ایسا نفس رکھنے والا شخص جس میں خباثت پائی جاتی ہو اور جس کے اندر فساد اور بگاڑ جڑ پکڑ چکا ہو، وہ نفس مومن سے میل نہیں کھاتا، اس لئے کہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ذوق و مزاج کے ہیں۔ روح اور طریق زندگی دونوں اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لہٰذا مخلصانہ اسلامی اخوت ومحبت کے آداب میں یہ شامل ہے کہ جب بھائی کو بھائی سے محبت ہو تو اس کو بتا دے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، اس لئے کہ حدیث شریف میں ابو داؤد اور ترمذی دونوں ہی نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب آدمی اپنے بھائی سے محبت کرے تو اس کو بتا دے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے''۔

گرم جوشی اور چہرہ کی بشاشت کے ساتھ ملنا اس کو چار چاند لگاتا ہے حتیٰ کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''تمہارا اپنے بھائی سے ہنس کر ملنا صدقہ کا ثواب رکھتا ہے''۔

کفر کی طرف دوبارہ لوٹنا اتنا ہی ناگوار ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا یہ جملہ اللہ واسطے محبت اور ایمان کی حلاوت کی تشریح کے بعد لایا گیا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی پر ایمان جب دلوں میں جم جاتا ہے اور دل کی بشاشت میں رچ بس جاتا ہے تو ایسے شخص کو کفر کی ہر قسم سے نفرت ہو جاتی ہے، ہر غلط چیز اس کو ناگوار ہوتی ہے، وہ ہر قسم کی کجروی سے دور بھاگتا ہے بلکہ اس سلسلے میں بندۂ مومن کے احساسات بہت تیز ہو جاتے ہیں، جس سے وہ حق و باطل اور ایمان و کفر میں فرق کرنے لگتا ہے، کفر کی تمام اقسام مثلاً عہد حاضر میں سیکولرزم، قومیت، اشتراکیت، اور کفر صریح یعنی کھلی ہوئی بت پرستی، علانیہ الحاد اور بے دینی، ہمارے موجودہ زمانے میں ارتداد و بے

دینی کے طرح طرح کے طریقے اور الگ الگ رنگ روپ ہیں جو بعض بھولے بھالے اور سیدھے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اس پر ایسا دلکش رنگ روغن چڑھا رہتا ہے کہ اس کا سادہ لوح لوگوں کا سمجھنا اور بھانپنا مشکل ہوتا ہے۔ عہد حاضر میں ارتداد کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک مسلمان خاص مقصد کے تحت قومیت کے شعار کو رواج دے اس کی دعوت اور اس کی ساری تگ و دو اسی کے لئے ہو۔ خلافت اسلامی کے خاتمے کے فوراً بعد یہودیوں نے اسلامی ممالک میں قوم پرستی کے شعور و جذبات کو ابھارا۔ کیوں؟ تا کہ مسلمانوں کی طاقت پاش پاش ہو وہ متحد رہنے کے بجائے امت مسلمہ کی حیثیت سے ایک جسم ہونے کے بجائے قومیت کے خانوں میں بٹ کر۔ کرد، ترکی، اور عرب الگ قوموں میں بٹ کر ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیں اور اس طرح اسلام کو حکومت سے بے دخل کر دیا جائے اور شریعت اسلامی کو زندگی کے تمام شعبوں سے نکال دیا جائے، دین و عقیدہ کو چھوڑ کر مسلمان صرف قومیت کی بنیاد پر آپس میں لڑتے رہیں اور اسلام دشمن طاقتوں کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔

ارتداد کی ایک شکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو پوری کائنات کا مالک و خالق ہے کسی اور کو حکومت اور قانون سازی کا حق دیا جائے ہر وہ شخص جو اللہ عزوجل کے علاوہ کسی اور کی حاکمیت کا اعتقاد رکھتا ہو یا اس پر مطمئن ہو، وہ مرتد و کافر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ
لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا
تَسْلِيمًا (النساء:٦٥)

”تمھارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمھیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کردو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں۔ تب تک مومن نہیں ہوں گے۔“

ارتداد کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کتاب وسنت کے کسی جز کا مذاق اڑایا جائے، جیسا کہ ”سلمان رشدی“ نے اپنی کتاب آیات الشیطان میں سنت کے نقوش کا مذاق اڑایا ہے۔

ارتداد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ منکرین خدا، منافقوں اور بے دینوں سے اس امید

میں ربط وضبط رکھا جائے کہ ان کے ساتھ رہنے سے عزت حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ، اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ"۔ (المائدۃ:۵۱)

"اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انھیں میں سے ہوگا۔ بیشک خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

ارتداد و بے دینی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ رب العزت کے لئے ایسی صفات بیان کی جائیں اور ان کا عقیدہ رکھا جائے، جو اس کے شایان شان نہیں، لہٰذا جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسموں میں حلول کرتا ہے (یعنی کسی جسم میں داخل ہو جاتا ہے سما جاتا ہے) وہ شخص کافر اور گمراہ ہے۔ یا یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ تین میں کا ایک ہے، یا یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم لوگ غنی ہیں یہ ساری باتیں کفر وگمراہی کی ہیں۔

اللہ تعالیٰ جیسی کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی، نہ اس کی ذات کے اعتبار سے اور نہ صفات کے اعتبار سے۔ اس کی ذات بے ہمتا، زمان ومکان، حلولیت وجسمیت سب سے منزہ اور پاک ہے وہ اپنے جلال وکمال، بڑائی یکتائی اور ربوبیت میں بے مثال ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (الانعام:۱۰۳)

(وہ ایسا ہے) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرسکتا ہے اور وہ بھید جاننے والا خبردار ہے۔

لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (الشوریٰ:۱۱)

اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھتا سنتا ہے۔

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (سورہ اخلاص:۲)

''نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔''

ارتداد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اسلام کی بعض چیزوں پر ایمان لایا جائے اور بعض چیزوں کا انکار کیا جائے، مثلاً کوئی کہے کہ میں اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ اسلام عبادت اور اخلاق کا دین تو ہے لیکن میں اس پر نہیں ایمان رکھتا کہ وہ قانون حکومت اور دستور حیات بھی ہے، اسلام کے متعلق یہ تصور وخیال آدمی کو ارتداد کا شکار بنا دیتا ہے اور اس کو کفر کا مرتکب بنا دیتا ہے۔ سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰىٓ اَشَدِّ الْعَذَابِ۔ (البقرة: ٨٥)

''(یہ) کیا (بات ہے کہ) تم کتاب (خدا) کے بعض احکام تو مانتے ہو اور بعض سے انکار کئے دیتے ہو تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہے اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیئے جائیں۔''

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) اس حدیث میں حضور ﷺ نے ''اُحب'' تفضیل کا صیغہ استعمال فرمایا ہے تا کہ مومن پر یہ بات واضح ہو کہ حلاوت ایمان کے لئے تنہا محبت کافی نہیں بلکہ یہ محبت دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہو، محبت کی دیگر قسموں سے ممتاز و فائق ہو، مثلاً اپنی ذات سے محبت، اولاد سے محبت، بیوی سے محبت، مال وشہرت کی محبت، لہٰذا جو شخص اپنے اندر یہ محبت پیدا کرنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کو تمام محبتوں پر مقدم رکھے۔

(۲) حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان کی بھی ایک لذت ہے جو دل میں حسی محبت کی طرح ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس کا احساس اسی شخص کو ہوتا ہے، جس کا

سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہو، جس کے نتیجے میں وہ فضائل اخلاق سے سنورنے کی فکر کرتا ہے، احکام پر عمل کے لیے کوشاں رہتا ہے، دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتا ہے، پست اور گھٹیا باتوں سے جن سے دین نے منع کیا ہے بچتا ہے، اس سے خود دور رہتا ہے اور دوسروں کو بھی اس سے روکتا ہے لہٰذا مومن کیلئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی سے دوستی اور اسی سے محبت کرے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کو محبت کی دیگر تمام قسموں پر مقدم رکھے۔

(۳) حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ محبت اللہ کے رسول ﷺ سے ہونی چاہئے، اس لئے کہ آپ ہی کی ذات انسانوں کے لئے بہترین اسوہ اور نمونہ ہے۔

اب اگر بندۂ مومن اللہ اور اس کے رسول سے محبت کے اس معیار پر نہیں اترتا تو اس کو ایمان کی مٹھاس نہیں نصیب ہوگی اور نہ اس کی لذت سے لطف اندوز ہو سکے گا۔

آج اس بات کی کتنی شدید ضرورت ہے کہ حضور ﷺ کی ذات گرامی سے صحابۂ کرام کی محبت کے قصے پڑھیں کہ واقعی ان کو اللہ کے رسول ﷺ سے محبت تھی، اور آپ کی محبت کو اپنی جانوں پر بھی مقدم رکھتے تھے اور آپ کے پیچھے سب کچھ قربان کر دینے کو تیار رہتے تھے، اس لئے کہ ان کو ایمان کا مزہ مل گیا تھا اور اس سے لطف اندوز ہو چکے تھے۔

حدیث - ۵

ایمان کا ذوق اور مزہ

عن العباس بن عبدالمطلب انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول : ذاق طعم الايمان من رضى بالله ربًا وبالاسلام دينا و بمحمد رسول.

(صحیح مسلم (شرح نووی) ج ۲/۲ تحفۃ الاحوذی، م ۳۷۲/۷۔ مسند الامام احمد بن حنبل، م ۲۰۸/۱)۔

''حضرت عباس بن عبدالمطلب سے روایت ہے کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ''جو شخص اس پر راضی ہوگیا (یعنی یقین جمالیا) کہ اللہ ہی خالق و مالک، رازق و پرورش کرنے والا ہے۔ اور اسلام کو اپنا دین مان لیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسولِ برحق تسلیم کرلیا، اس کو ایمان کا مزہ مل گیا۔''

ایمان کا مزہ اس کو ملے گا، جس نے اس بات کا یقین کرلیا کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا پالن ہار ہے۔ وہی اس کی پرورش کرتا ہے، وہی اس کی تمام ضروریات کا ذمہ دار ہے اور وہی ساری دنیا کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ خود اس کا ارشاد ہے:

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ وَالَّذِیْ هُوَ يُطْعِمُنِیْ وَيَسْقِيْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ وَالَّذِیْ يُمِيْتُنِیْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ. (الشعراء: ۷۷-۸۱)

''وہ میرے دشمن ہیں لیکن خدائے رب العالمین (میرا دوست ہے) جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے رستہ دکھاتا ہے۔ اور وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، اور جب بیمار پڑتا ہوں تو مجھے وہی شفا بخشتا ہے اور وہ جو مجھے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا۔''

دوسری جگہ فرمایا:

قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْغِي رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ. (الانعام: ١٦٤)

''کہو کیا میں خدا کے سوا اور پروردگار تلاش کروں؟ اور وہی تو ہر چیز کا مالک ہے۔''

ایک آیت میں رب بمعنیٰ آقا و مالک کے استعمال ہوا ہے فرمایا:

هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (ہود:۳۴)

''وہی تمھارا پروردگار ہے۔ اور تمھیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

ایک جگہ فرمایا:

ثُمَّ إِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ (الزمر:۷)

''پھر تم سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

ان آیتوں کو پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ رب کا لفظ، حاکم و مالک سب معنیٰ پر مشتمل ہے، رب کا لفظ ہم کو بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حاکم مطلق ہے کوئی اس کا شریک نہیں، پوری کائنات اسی کے زیر فرمان ہے وہی اس کا بلاشرکت غیرے مالک ہے، اسی کا فرمان چلتا ہے، کسی اور کافر کی مجال نہیں، اس حیثیت سے وہ ہمارا بھی مالک و خالق ہے اور سارے عالم اور عالم میں جو کچھ ہے اس سب کا بھی وہی خالق و مالک ہے اور ہر جگہ اسی کا حکم چلتا ہے۔ لہٰذا وہی ہمارا کفیل و ذمہ دار ہوا اور وہی ہمارا محافظ و نگہبان، (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں) جو شخص اس حدیث کی معنویت و گہرائی و گیرائی پر غور کرے گا اس کو ایمان کا صحیح لطف و مزہ حاصل ہوگا یہی معنیٰ آپ ﷺ کے اس ارشاد ''جس نے اللہ کے اپنے رب ہونے کا عقیدہ رکھا اور اس کو پسند کیا'' کے ہیں۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ (اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو رب نہ مانا اور اسلام کے اصول وطریقوں کے علاوہ کسی اور دین کی طرف نہ دیکھا وہی راہ چلا جو حضور ﷺ کے لائے ہوئے دستورِ حیات اور شریعت کے مطابق تھی، اس میں شبہ نہیں کہ جس شخص کے اندر یہ خصوصیات پائی جائیں گی، اس کے دل میں ایمان کی صحیح مٹھاس پائی جائے گی، اور وہ ایمان کا مزہ پائے گا۔ (صحیح مسلم (شرح نووی) ج ۱۷ ص ۲

حدیث کا یہ جز کہ جس نے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانا اور وہ آیات جو اوپر مذکور ہوئیں اس بات کو بتاتی ہیں کہ معبود ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس لئے کہ شان معبودیت اسی میں پائی جاتی ہے، تنہا وہی ان صفات کا جامع اور تمام نقائص اور خامیوں سے پاک ہے، رضی باللہ ربّاً کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کے سوا نہ کوئی اور خالق ہے نہ رازق ہے اور نظام کائنات میں کوئی اس کے سوا تصرف نہیں کر سکتا، چنانچہ بندہ شعائر عبادت میں صرف اللہ یکتا کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اپنی امید وطلب میں بھی وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، خوف وتقویٰ میں بھی وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ (البقرہ:۱۶۳-۱۶۵)

قرآن کریم عقیدۂ توحید اور زندگی اور دل میں اس کے تقاضوں کے مابین بڑا گہرا ربط وتعلق پیدا کرتا ہے۔

ہم ان آیات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اوّلاً ایک اللہ اور ایک معبود سے ابتدا فرمائی ہے، پھر اس کے بعد کائنات کی ان چیزوں کو بیان فرمایا ہے، جن سے اس کے معبود ہونے کی حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ ان حقائق کو اچھی طرح واضح کر دینے کے بعد، قیامت کے منظر کو بیان فرمایا۔ جس میں صرف اسی کی قوت قاہرہ کا ظہور ہوگا، باقی ساری طاقتیں (جو اس نے اپنی مخلوق، خصوصاً انسان کو عطا کی ہیں) ختم ہو چکی ہوں گی۔ انھیں آیات کے سیاق میں ان لوگوں کو متنبہ فرماتا ہے جو اس کے مقابلے میں خدا کی یکتائی کے سلسلے میں جاہلیت کی عادات کو اپناتے ہیں، اس کے بعد مؤمنین کو حکم دیتا ہے کہ اس نے جن پاکیزہ چیزوں کو حلال فرمایا ہے ان کو کھائیں، اور جن چیزوں کو اس طرح بیان فرمادیا ہے:

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ، وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (البقرہ:۱۷۳)

''اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو اور سور کا گوشت اور جن چیزوں پر خدا کے سوا کسی اور

کا نام پکارا جائے، حرام کر دیا ہے ہاں جو ناچار ہوئے (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک خدا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

اس طرح کی بہت سی قرآنی آیات توحید کے سیاق میں آتی ہیں جو توحید کے معنیٰ کو کھول کھول کر بیان کرتی ہیں۔ علماء نے توحید کو تین قسموں پر محمول کیا ہے۔

(۱) تمام مخلوق کا وہی تنہا پالنہار ہے۔

(۲) صرف اسی کی ذات قابل عبادت ہے۔

(۳) وہ اپنے نام اور صفات میں بھی یکتا ہے۔

ایمان کا لطف اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ بندۂ مؤمن توحید کی ان تینوں قسموں کے مفہوم پر پوری گہرائی کے ساتھ غور کرے۔ اللہ تعالیٰ نے توحید کی ان تینوں قسموں کو اپنے اس ارشاد میں جمع فرما دیا ہے:

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا (مریم:٦٥)

''یعنی آسمان اور زمین کا اور جوان دونوں کے درمیان ہے سب کا پروردگار، تو اس کی عبادت کرو اور اس کی عبادت پر ثابت قدم رہو بھلا تم کوئی اس کا ہم نام جانتے ہو۔''

جہاں تک مخلوق کے پالنہار ہونے میں اللہ تعالیٰ کی یکتائی کا تعلق ہے تو اس کی وضاحت اس سے ہو جاتی ہے کہ مخلوق کو پیدا کرنے اور نظام کائنات کو چلانے پر وہ تنہا قادر ہے، اس کو کسی کی مدد اور شراکت کی ضرورت نہیں، جس کا ثبوت اس کا یہ ارشاد ہے:

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ

(الاعراف:۵۴)

''دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی (اسی کا ہے) یہ خدا رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔''

اسی طرح کا یہ ارشاد:

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

(اٰل عمران:۱۸۹)

''اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کو ہے، اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔''

توحید ربوبیت کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا اقرار کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اس عالم کو بنانے والے دو نہیں ہیں کہ دونوں اپنے افعال وصفات میں برابر ہوں خدا کی یہ یکتائی بلا شبہ برحق ہے، بہت سے اہل نظر، ماہرین علم کلام اور صوفیہ کے نزدیک یہی مقصود ہے۔ کسی انسانی جماعت نے توحید کی اس قسم کی ضد نہیں تسلیم کی ہے، بلکہ فطری طور پر دلوں میں یہ اقرار پہلے سے موجود ہوتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ اہمیت کے ساتھ جو موجودات میں کسی اور چیز کے بارے میں ہوسکتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں رسولوں کی زبان سے کہلوایا گیا ہے:

أَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ابراہیم:۱۰)

'' ان کے پیغمبروں نے کہا کیا (تم کو) خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔''

کائنات کے بنانے والے کے انکار اور اس سے تجاہل برتنے کا سب سے زیادہ مشہور شخص فرعون ہے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ أَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ (بنی اسرائیل:۱۰۲)

''تم یہ جانتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے پروردگار کے سوا ان کو کسی نے نازل نہیں کیا، (اور وہ بھی تم لوگوں کے) سمجھانے کو،

اسی لئے جب فرعون نے تجاہل برتتے ہوئے انکار کے طور پر حضرت موسیٰ سے کہا (وما رب العالمین) ساری دنیا کا رب کون ہے؟ تو حضرت موسیٰ نے اس سے کہا:

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ۔ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ، قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ، قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ، قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (الشعراء: ۲۳-۲۸)

''کہا کہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں میں ہے سب کا مالک ہے بشرطیکہ تم لوگوں کو یقین ہو، فرعون نے اپنے ہالی موالی سے کہا کہ کیا تم سنتے نہیں ہو (موسیٰ نے کہا) تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا مالک، فرعون نے کہا کہ (یہ) پیغمبر جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، باؤلا ہے (موسیٰ نے) کہا کہ مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان دونوں میں ہے، سب کا مالک بشرطیکہ تم کو سمجھ ہو۔''

ایمان کا مزہ وہی شخص پا سکتا ہے جو دل سے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مان لے۔ اس کا یہ یقین و عقیدہ بن جائے کہ ساری مخلوق کا پالنہار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، پیدا کرنے، رزق عطا کرنے اور نظام کائنات کو چلانے میں یکتا ہے، وہی ہے جس نے تمام مخلوق کو اپنی نعمتوں سے بڑھایا اور پروان چڑھایا، اور مخلوق کے خواص کی بھی پرورش و تربیت اسی نے کی، وہ ہیں انبیاء کرام اور ان کے متبعین جو صحیح عقیدہ، اچھے اخلاق، مفید علوم اور نیک اعمال میں انبیاء ہی کے نقش قدم پر ہوتے ہیں۔

جہاں تک توحید عبودیت کا تعلق ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تنہا اسی کی عبادت کی جائے، اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کی جائے، خواہ فرشتہ ہو یا نبی، کوئی ولی ہو، یا درخت اور پتھر، یا چاند، جو کچھ بھی ہو جیسا بھی ہو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں عبادت کی مستحق تنہا اسی کی ذات ہے۔ اس کا ثبوت اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا (النساء: ۳۶)

اور خدا ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔

دوسری آیت میں فرمایا:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ۔ (الانبیاء:۲۵)

''اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی طرف بھی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میری ہی عبادت کرو۔''

اللہ کو معبود ماننے میں رب کے بھی ایک ہی ہونے کے معنیٰ پائے جاتے ہیں کہ عبادت صرف اسی کی کی جاسکتی ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں، اس لئے کہ مشرکین عرب بھی رب ایک ہی کو مانتے تھے، کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے، جیسا کہ خود قرآن کریم اس کی شہادت دیتا ہے۔ فرمایا:

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ۔ (لقمان: ۲۵)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے، تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے۔

دوسری جگہ فرمایا:

قُلۡ لِّمَنِ الۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ، سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ قُلۡ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ (المومنون:۸۴،۸۵)

''کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب کس کا مال ہے تو جھٹ بول اٹھیں گے کہ خدا کا، کہو پھر سوچتے کیوں نہیں۔''

قرآن کریم میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ وہ بتوں کے بارے میں یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے کہ تخلیق عالم میں یہ شریک ہیں، معلوم ہوا کہ اصل توحید معبود کا ایک ہونا ہے، جس سے رب کے معنیٰ خود ہی واضح ہوجاتے ہیں، کہ جو معبود و خالق ہوگا وہی پالنہار بھی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ

عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الروم:۳۰)

''تم ایک طرف کے ہو کر دین (خدا کے رستے) پر سیدھا منہ کئے چلے جاؤ اور خدا کی فطرت کو جس پر ان لوگوں کو پیدا کیا ہے، (اختیار کئے رہو) خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

ایمان کا مزہ اسی کو آئے گا جو تسلیم کرے کہ اللہ تعالیٰ ہی ساری مخلوق کا معبود اور خدا ہے ساری عبادتیں اس نے اپنے لئے خاص کر لی ہیں اور دین خالصۃ اللہ ہی کے لئے ہے۔

ناموں کی صفات میں یکتا ہونے کا عقیدہ یہ ہے کہ اس کے ناموں اور صفتوں میں بھی کوئی شریک نہیں ہوسکتا ہے، اس عقیدے کی تکمیل اس طرح ہوسکی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے جو نام اور صفتیں خاص کر لی ہیں ان میں کوئی بھی اس کا شریک و ہمسر نہیں ہوسکتا، اسی طرح اللہ کے رسول نے اس کی صفات بیان کی ہیں ان سب میں کوئی اس کا شریک نہیں، نہ ان صفات میں کوئی رد و بدل کر کے کسی کو شریک کیا جا سکتا ہے نہ اس کی کسی صفت کو معطل کر کے اور نہ ہی اس کی کیفیت، شکل، تشبیہ اور مثال دے کر۔

لہٰذا جو چیز اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بیان فرما دی ہے اس کی نفی جائز نہیں یا اس صفت کو اپنے لئے بیان فرما دیا ہے، کسی کی بھی نفی جائز نہیں۔ اس لئے کہ وہ خود فرماتا ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (الاعراف:۱۸۰)

''اور خدا کے سب نام اچھے ہی اچھے ہیں تو اس کو اس کے ناموں سے پکارا کرو اور جو لوگ اس کے ناموں میں جھگڑا ڈالتے ہیں ان کو چھوڑ دو وہ جو کچھ کر رہے ہیں عنقریب اس کی سزا پائیں گے۔''

اگر اللہ تعالیٰ کی صفات میں ہم کسی طرح کی تبدیلی کریں گے تو گویا اس کی صفت کو معطل کرنا ہوا جس سے نص کے حکم کو بدلنا یا اس کو جھٹلانا لازم آئے گا اور یہ بھی لازم آئے گا کہ گویا

باللہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں نقص وعیب ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لئے مثال کے طور پر کسی نام وصفت کا بیان کرنا بھی جائز نہیں، اس لئے کہ اس کا ارشاد ہے لیس کمثله شئ وهو السميع البصير۔ اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھتا سنتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (النحل:۷۴)

''تو لوگو خدا کے بارے میں (غلط) مثالیں نہ بناؤ (صحیح مثالوں کا طریقہ) خدا ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک پایا جاتا ہے، جس سے نص میں تحریف لازم آتی ہے یا اللہ تعالیٰ کی تنقیص کے ساتھ اس کا جھٹلانا لازم آتا ہے۔ اس لئے اس صورت میں اس کی مثال ناقص وعیب دار مخلوق سے دی جاتی ہے۔

جس نے اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کی اور اس کو ناکارہ بتایا تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی توحید ہی کو غلط قرار دے دیا اسی طرح جس نے اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے تشبیہ دی تو اس کی اس تشبیہ سے توحید کو نقص لازم آئے گا۔

رب کے ایک ہونے کا انکار تو انسان کی ایک شاذ جماعت ہی نے کیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے بارے میں فرمایا کہ اس نے کہا ما علمت لكم من اله غيرى۔ اپنے سوا کسی کو خدا نہیں جانتا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو ان الفاظ میں مخاطب فرمایا ہے:

لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ۔ (بنی اسرائیل:۱۰۲)

تم جانتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے پروردگار کے سوا ان کو کسی نے نازل نہیں کیا۔

(اور وہ بھی تم لوگوں کو) سمجھانے کو۔

یہ سب کچھ محض تکبر کی بنا پر تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ أَنفُسُهُمْ ظُلْماً وَّعُلُوّاً۔ (النمل:۱۴)

بے انصافی اور غرور سے انھوں نے انکار کیا کہ ان کے دل ان کو مان چکے تھے، جب یہ دنیا اور اس میں جو حوادث پیش آ رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے رب ہونے پر گواہ ہیں، تو یہ طے شدہ بات ہے کہ مخلوق کا کوئی پیدا کرنے والا ضرور ہے، اور ایسے حوادث جو پیش آ رہے ہیں، ان کو بھی وجود میں لانے والی کوئی ذات ہے ضرور۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالأَرْضِ۔ (الطور:۳۶،۳۵)

''کیا کسی کے پیدا کئے بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود (اپنے تئیں) کرنے والے ہیں یا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔''

جب اس حقیقت کا جواب دیا گیا جو ضروری تھا، تو ان منکرین خدا نے کمزور و بے سر و پا جوابات دیئے اور کچھ حیران ہو کر رہ گئے کچھ جواب ہی نہ سوجھا۔

مسلمان جن باتوں کا بھی مکلّف بنایا جاتا ہے، خواہ وہ از قسم عبادت ہوں جو اس کے لئے ضروری قرار پاتی ہیں، یا مسائل زندگی ان سب کا ذکر ایک ہی سیاق میں توحید اور نظام کائنات میں اللہ تعالیٰ کے متصرف ہونے اور قوت وقدرت کے ساتھ ہوتا ہے، اس عقیدے کے ساتھ ساتھ معبود و مالک کے ایک ہونے کے تقاضے سے اللہ تعالیٰ کے قانون کے اتباع اور اس پر عمل کا حکم دیتا ہے چنانچہ فرماتا ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ

الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ، بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔ (البقرہ:۱۶۳-۱۶۵)

''اور (لوگو!) تمھارا معبود خدائے واحد ہے۔ اس بڑے مہربان (اور) رحم کرنے والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں (اور جہازوں) جو دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں ہیں، اور مینہ میں جس کو خدا آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ (یعنی خشک ہونے کے پیچھے سرسبز) اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں، عقل مندوں کے لئے (خدا کی قدرت کی) نشانیاں ہیں، اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر خدا کو شریک (خدا) بناتے ہیں، اور ان سے خدا کی سی محبت کرتے ہیں۔ لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو خدا ہی کے سب سے زیادہ دوست دار ہیں۔''

قرآن کریم کے اس طرح کے محکم اور پختہ اسلوب بیان میں توحید اور اس کی وسعت پر دلالت کرنے والی بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں۔

''ایمان کی لذت اس کو نصیب ہوگی جس نے اپنا مالک و پالن ہار اللہ تعالیٰ کو مان لیا۔'' یعنی اس نے یہ عقیدہ رکھا کہ بندے کے جو بھی اعمال ہوں گے اور ان کا تعلق اس کی ذات سے ہوگا جیسے قربانی، نذر، دعا، خوف، امید و بھروسا، شوق اور ڈر، خضوع و خشوع، طلب مدد اور فریاد، اس کے علاوہ اور وہ تمام اعمال جن کو اللہ تعالیٰ نے عبادت قرار دیا ہے اور بندوں کو ان کے کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کی اہل و مستحق اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔

اسی طرح ایمان کا مزہ اس کو آئے گا جو اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں اور اس کی صفات عالیہ کو اسی یکتا و بے ہمتا کے لئے خاص کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو صفات بیان فرما دی ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی جو صفات بتائی ہیں ان کا پایا جانا قطعی اور یقینی ہے خواہ اس کی کیفیت سمجھ میں نہ آئے اور اس کی مثال نہ دی جا سکے، نہ تو ان صفات میں تبدیلی ہو سکتی ہے نہ وہ کبھی ختم ہو سکتی ہیں جیسے اس کی ذات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی ایسے ہی اس کی صفات ہمیشہ سے ہیں ہمیشہ رہیں گی، اس جیسا کوئی نہیں وہ خوب سننے والا دیکھنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں کلام فرمانا، رحمت، غصہ، رضا، سننا اور دیکھنا، چہرہ، دونوں ہاتھ، آنا اور اترنا، عرش پر جلوہ افروز ہونا، وغیرہ سب ثابت ہیں۔ البتہ ان کی کیفیت ہمارے فہم و ادراک سے باہر ہے۔ ان تمام صفات کو بندوں یا مخلوق کی صفات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ کے رب و مالک تسلیم کرنے کا عقیدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کی گفتگو سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرَاهِيْمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ، قَالَ اِبْرَاهِيْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ:۲۵۸)

”بھلا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو اس (نمرود کے) سبب سے کہ خدا نے اس کو سلطنت بخشی تھی ابراہیم سے پروردگار کے بارے میں جھگڑنے لگا جب ابراہیم نے کہا میرا پروردگار تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے، وہ بولا کہ جلا اور مار تو میں بھی سکتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ خدا تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے آپ اسے مغرب سے نکال دیجئے (یہ سن کر) کافر حیران رہ گیا اور خدا بے انصافوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔“

نمرود بادشاہ جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ان سے بحث و مباحثہ کیا وہ خدا کے وجود کا منکر نہیں تھا، بلکہ اللہ کی وحدانیت اور خدائی میں یکتائی کا منکر تھا

وہ نظام کائنات میں تنہا اللہ تعالیٰ کے تصرف وفرمانروائی کا منکر تھا۔

یہ سرکش بادشاہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت وپروردگاری کے بعض مفاہیم ومعانی کا انکار محض اپنی بادشاہت کے غرور اور گھمنڈ میں کر رہا تھا۔ حالانکہ اس کو اللہ تعالیٰ کی اس عطا اور دین کا معترف وشکر گذار ہونا چاہئے تھا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ اس کی اس قدر ناشناسی وکفرانِ نعمت پر اس کا تعجب وحیرت کے اسلوب میں ذکر فرماتا ہے۔ فرماتا ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَآجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ

''بھلا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو اس (نمرود کے) سبب سے کہ خدا نے اس کو سلطنت بخشی تھی۔ ابراہیم سے پروردگار کے بارے میں جھگڑنے لگا۔''

قرآن کریم کا یہ اسلوب بیان بادشاہ کے انکار کو جس شناعت کے لہجے میں بیان کر رہا ہے وہ بتاتا ہے کہ اس پر ربوبیت کا پورا مفہوم کھلا نہیں تھا، لہٰذا اس نے اللہ کے رب ہونے کا انکار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو اس کی ان صفات سے پہچانا جن میں اس کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا گمان وخیال بھی نہیں کرسکتا، چنانچہ اس بادشاہ کے جواب میں کہ تمہارا رب کون ہے؟ آپ فرماتے ہیں کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ مزید صفات خود اس سے قبل کی آیت میں بیان ہوئیں۔ یہ وہ صفات ہیں جن میں کوئی اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں۔ چنانچہ آخر بادشاہ لاجواب ہوگیا۔ اسکا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ایمان کا مزہ اس کو ملتا ہے، جو صرف اسلام کو اپنا دین ومذہب تسلیم کرتا ہے، اور اس پر مطمئن وراضی رہتا ہے کہ اسلام اپنی ساری اقدار کے ساتھ انسانی زندگی کیلئے عملی دستور حیات ہے، ایسا دستور جو اس اعتقادی تصور وخیال پر بھی مشتمل ہے جو کائنات کی بھی وضاحت کرتا ہے اور اس کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے اس کو بھی بتاتا اور بیان کرتا ہے جیسا کہ وہ انسان کی تخلیق کے مقصد عظیم کو بیان کرتا ہے، یہ دستور اجتماعی نظام اور عملی ضوابط جو اسی عقیدے کے نتیجہ میں وجود میں آتے ہیں اور اس کا سہارا لیتے ہیں ان سب پر مشتمل ہے اور ان کو انسانی زندگی میں عملی طور پر پیش کرتا ہے مثلاً اخلاقی نظام۔

اسلام تو وہ سرچشمۂ جاری ہے جس سے یہ سب چیزیں وجود میں آتی ہیں، وہ اصول

اور بنیادیں جن پر اخلاقی نظام قائم ہوتا ہے وہ طاقت جو اس سے حاصل ہوتی ہے، سیاسی اصول و ضوابط اور اس کا ڈھانچا، اس کی خصوصیات اسی طرح سماجی نظام اور اسکی بنیادیں اور قدریں۔ اقتصادی نظام اور اس کا فلسفہ اور اس کو عملی شکل دینا۔ ملکی قوانین اور اس کے جملہ شعبہ جات۔

یہ اسلام کی ہمہ گیر اور عملی تصویر ہے، جو احساسات انسانی پر اثر انداز ہوتی ہے اور دلوں میں جھرجھری پیدا کر دیتی ہے۔ جو شخص بھی اسلام کی اس ہمہ گیری پر راضی ہو گیا اس کو اسلام کا مزہ آئے گا۔ یہ ہے اسلام کی وسعت و ہمہ گیری جو تمام سابقہ تعلیمات نبوت کی جامع اور تمام انبیاء سابقین کی توثیق وتصدیق کرتی ہے اور پہلے آنے والے تمام رسولوں کے دین کو ایک بتاتی ہے، اور سبھی سابقہ دعوتوں اور رسالتوں کو ایک ہی اصل سے ملاتی ہے۔ اسلام کی ان ساری خصوصیات و امتیازات کے ساتھ اس کے اقرار کی اصل روح اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب دل کے اقرار کے ساتھ ساتھ دین اسلام کی پسندیدگی اور اس پر بالکلیہ رضامندی کا مزہ حاصل ہو۔

یہ ہے وہ دین جس کا انسان سے مطالبہ ہے اور جس کے سامنے ساری کائنات سرنگوں ہے۔ قرآن کریم کا یہ ارشاد اس حقیقت کو واضح کرتا ہے:

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ أَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ طَوْعاً وَّ كَرْهاً وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (آل عمران:۸۳)

’’کیا یہ (کافر) خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں؟ حالانکہ سب اہل آسمان و زمین خوشی یا زبردستی اس خدا کے فرمانبردار ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔‘‘

آیت سے واضح ہو گیا کہ پوری کائنات حکم خداوندی کے سامنے سرنگوں اور خدائی نظام کے تابع فرمان ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول خدا ﷺ کے ارشاد، ذاق طعم الایمان میں کتنی بلاغت ہے، تاکہ کسی کے ذہن میں یہ نہ آئے کہ اسلام محض الفاظ کا ایک مجموعہ ہے جس کو صرف زبان سے ادا کر لیا جائے۔ بس اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابندی اور اس پر عمل کی چنداں ضرورت نہیں نہ عملی زندگی میں اس کو برپا کرنا ضروری ہے، آیت کریمہ:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى

الاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ. (آل عمران:۸۵)

'' اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا۔ اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔''

لہٰذا صرف شہادتوں کا زبان سے ادا کر لینا اسلام نہیں جب تک کہ لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت اور اس کے معانی کی عملی زندگی پر فرماں روائی نہ ہو۔

حدیث کا دوسرا جزء کہ **ذاق طعم الایمان من رضی بمحمد رسولا** ایمان کا مزہ اس کو ملے گا جو محمد ﷺ کو اللہ کا رسول برحق تسلیم کرے کہ اس لئے کہ اس دستور حیات کو اللہ تعالیٰ کے پاس سے لانے والی ذات گرامی آپ ہی کی ہے اسی لئے فرمایا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِىٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً. (النساء:۶۵)

''تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمھیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کردو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔''

آیت کریمہ قسم کے ساتھ بطور تاکید کے نازل ہوئی ہے۔ اس میں کسی طرح کے شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے نہ کوئی ابہام پایا جاتا ہے، کھلی ہوئی صراحت ہے، حضور ﷺ کو حکم بنانا شریعت خداوندی کو حکم بنانا ہے اگر یہ نہیں تو حضور ﷺ کی وفات کے بعد نہ شریعت باقی رہتی نہ اللہ کے رسول ﷺ کی سنت!

''علامہ ابن قیم اس کو بہت باریک بینی اور پورے مالہ و ماعلیہ کو نظر میں رکھتے ہوئے اس کو نہایت عام فہم انداز میں پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: یہ حدیث اللہ تبارک وتعالیٰ سبحانہ کی ربوبیت، معبودیت، آپ کے حبیب محمد عربی ﷺ کی رسالت اور اطاعت، دین کی پسندیدگی اور اپنی خواہش کو اس کے تابع بنا دینے کے مفہوم پر مشتمل ہے، اور جس بندۂ مومن میں یہ چاروں چیزیں

جمع ہو جائیں وہی صحیح معنیٰ میں صدیق ہے۔ زبان سے دعویٰ کرنا تو بڑا آسان ہے۔ لیکن حقیقۃً اس پر قائم رہنا اور امتحان و آزمائش کے وقت جب کہ شریعت کا حکم اپنی خواہشات نفسانی سے ٹکرا رہا ہو ثابت قدم رہنا اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب کہ زبانی اقرار کا ساتھ دل بھی دے رہا ہو ورنہ آدمی خواہشات نفسانی اور دنیاوی مفاد کے سامنے دین کے حکم کو پس پشت ڈال دیتا ہے اس وقت جب دینی حکم دنیاوی اغراض و مقاصد سے ٹکرا رہا ہو دین پر جمنا مشکل ہو جاتا ہے اسی لئے کسی نے کہا ہے:

چوں می گویم مسلمانم بہ لرزم
کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

شاعر کہتا ہے کہ جب میں اپنی زبان سے کہتا ہوں کہ مسلمان ہوں تو کپکپا اٹھتا ہوں اس لئے کہ لا الٰہ کے اقرار کے بعد کی پابندیوں کو جانتا ہوں کہ پھر اس کلمے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کس طرح اپنے کو اس کے سامنے جھکا دینا پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور معبود تسلیم کر لینا اس بات کا متقاضی ہے کہ تنہا اسی ذات بے ہمتا سے محبت کی جائے دل میں تنہا اسی کا خوف ہو، ساری امیدوں کا مرکز وہی ذات عالی ہو، اسی کی طرف رجوع و انابت ہو، ہر طرف سے کٹ کر اسی کو اپنا کارساز مانا جائے، جب یہ کیفیت پائی جائے گی تو بندہ خلوص کامل کے ساتھ تنہا اسی کی عبادت کرے گا اور اسی کے حکموں پر چلے گا۔ اور جب بندہ اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا مالک و پالنہار مانے گا تو اس کے ساتھ آقا کی طرف سے جو کچھ بھی پیش آئے گا اس پر راضی و خوش رہے گا، صرف اسی کی ذات پر بھروسہ کرے گا، اسی سے مدد و نصرت کا طلبگار رہوگا۔ لہٰذا جو اس کا حکم ہو اس پر کاربند ہو اور اس کی طرف سے جو کچھ مقدر ہو اور پیش آئے اس پر صبر و رضا سے کام لے۔

رہا اللہ کے نبی کے رسول ہونے کو تسلیم کرنا تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ پورے طور پر اللہ کے رسول کی اطاعت کرے اور خود کو ان کے حکموں کے تابع بنائے ایسا کہ آپ کا حکم اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو، آپ ہی کے فرمودات سے روشنی حاصل کرے، زندگی کے جو مسائل پیش آئیں ان میں آپ ہی کے ارشادات کو حکم بنائے، کسی اور قانون و ضابطہ کا سہارا نہ لے اور نہ ہی

کسی اور کے فیصلہ پر قطعاً راضی ہو نہ اللہ تعالیٰ کے ناموں اور اس کی صفات میں، نہ ہی اس کے کاموں اور فیصلوں میں، اور نہ ہی ایمانی لطف ومزہ، اور ایمانی بلندی اور قدر ومنزلت میں، ان تمام چیزوں کے بارے میں کسی اور کی لن ترانی کو قبول نہ کرے، ہاں اگر کسی وقت ان حکموں اور تقاضوں پر عمل کرنے میں بے بس ہو جائے اور اس کو عمل کا یارا نہ رہے تو اس کا عذر ایسے ہی قابل قبول ہوگا جیسے کسی جاں بہ لب بھوکے کا کہ جان بچانے کے لئے حرام چیز کا کھالینا جائز اور قابل قبول عذر ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے دین پر راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دین جن چیزوں کا حکم دیتا ہے ان پر عمل کرے اور جن باتوں سے روکتا ہے ان سے باز رہے، اور اس دینی حکم سے اپنے دل میں کوئی تنگی نہ محسوس کرے۔ (مدارج السالکین: ج ٢: ١٧١-١٧٥)

ان ساری تفصیلات کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام کے تابع ہو جانے کے لئے تو اتنا کافی ہے کہ اسلام کا جو حکم وفیصلہ ہو اس پر عمل کرلے بس، لیکن ایمان کے بارے میں اتنی بات کافی نہیں بلکہ دل کا انشراح وخوشی اور اطمینان قلب کے ساتھ اس پر راضی رہنا اور حضور پاک ﷺ کو زندگی کے ہر ہر عمل میں اسوہ اور نمونہ بنانا تاکہ ”**ذاق طعم الایمان من رضی بمحمد رسولاً**“۔ کا دعویٰ اس پر پوری طرح منطبق ہو سکے۔

موجودہ حالات اور حدیث

حدیث اس بات کو واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور کارساز مان لینے کے بعد اسی کی ذات پاک سے محبت کی جائے اور عبادت تو عبادت، زندگی کے سارے اعمال اسی کی رضا کے شوق میں کئے جائیں۔

اس نے جن باتوں کا حکم دیا ہے ان پر عمل اسی کی رضا کے لئے ہو اور جن چیزوں سے روکا ہے اللہ ہی کی خوشنودی کے لئے ان سے باز رہا جائے اور بندوں میں سے جس سے محبت ہو اس بنا پر ہو کہ وہ خدا کا فرمانبردار ہے۔ اور جس سے ناراض ہو اس کا سبب صرف یہ ہو کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام کو اپنا دین مان لینے کے بعد اس پر عمل لازم ہے، بلکہ اس کی دعوت دینا اور اس راہ میں جو تکلیف اٹھانی پڑے اس پر صبر کرنا تقاضۂ ایمان ہے دین کے ارکان اور ظاہری وباطنی حکموں پر عمل خواہ وہ اعتقاد سے تعلق رکھتے ہوں یا قول وعمل سے۔ وہ

عبادات کی قسم سے ہوں یا معاملات واخلاقیات اور آداب زندگی سے، حاصل یہ کہ تمام چیزوں میں دین ہی کے تقاضے پر عمل ہو۔

حدیث سے یہ بھی رہنمائی ملتی ہے کہ آپ ﷺ جو کچھ لے کر آئے اس کی دل سے تصدیق کی جائے اس کی سچائی میں کوئی شک وشبہ نہ رہے اور جو کچھ آپ نے فرمایا اس پر عمل ہو جن باتوں سے روکا ہے ان سے بچا جائے۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی، ان کے حکموں پر چلا اور منع کی ہوئی چیزوں سے بچا، رسول ﷺ کی لائی ہوئی خبر کو دل کی سچائی کے ساتھ مانا آپ کی لائی ہوئی شریعت کو اپنا حکم بنایا، اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلا اور ان پر چلا وہی صحیح معنوں میں ایمان کا مزہ پائے گا، اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف کرے گا، اپنے لطف وکرم سے اسکو جنت کی بہاروں میں داخل کریگا اور اس سے راضی وخوش ہوگا، یہ محض اللہ کی دین ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔

حدیث کا فقہی پہلو

رضی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شرعی احکام پر عمل کرنے میں کوئی تکلیف نہ معلوم ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ شرعی حکم وفیصلہ پر اس کو کوئی اعتراض نہ ہو اور نہ اس کے حکم وفیصلہ سے غصہ ہو۔ جس طرح کہ بیمار کڑوی دوا پینے پر راضی ہو جاتا ہے، روزہ دار سخت گرمی کے موسم میں بھوک پیاس کی شدت کو برداشت کرتا ہے اور مجاہد میدان جہاد میں زخموں کی تکلیف کو برضا ورغبت جھیلتا ہے۔

حضرت ابوعثمان سے آپ ﷺ کے دعائیہ الفاظ " أسألک الرضا بالقضا " کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: کہ فیصلے سے پہلے رضا کا مطلب ہے رضا کا عزم وارادہ رکھنا۔ فیصلے کے بعد رضا کا مطلب ہے اظہار رضا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰؓ کو لکھا۔ ساری خوبیاں (ہر حال پر) راضی رہنے میں ہیں اگر راضی رہ سکتے ہو تو خوب، ورنہ صبر سے کام لو۔

رضا کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رضا تو عوام کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دے دیا، ان کی قسمت میں لکھ دیا اس پر راضی رہیں، اور ایک خواص کی رضا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مقدر فرما دیا ہے اس پر قانع اور راضی ہیں۔ ایک خواص الخواص کی ہے، کہ وہ ہر حال میں اس سے راضی رہتے ہیں۔

حدیث - ٦

طاقتور مومن کی فضیلت

عن ابی هريرة رضی اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم: المومن القوی خیر واحب الی اللّٰه من المومن الضعيف وفی کل خیر، احرص علی ما ینفعك، واستعن باللّٰه ولا تعجز، وان اصابك شیء فلا تقل لوانی فعلت کان کذا وکذا، ولکن قدر اللّٰه وماشاء فعل، فان لو تفتح عمل الشیطان (صحیح مسلم: کتاب القدر (شرح نووی ج ١٦ ص ٢١٥۔ ابن ماجہ۔ المقدمہ ١٠)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ وسلم نے فرمایا: قوی مومن بہتر ہے اور اللہ کو کمزور مومن سے قوی مومن زیادہ محبوب ہے۔ (اس سے اسلام کی زیادہ خدمت ہوسکتی ہے) اور دونوں میں خیر ہے۔ ہر اس نیکی پر لالچ کرو جو تم کو نفع پہنچائے۔ اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو اور عاجز نہ ہو۔ اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچے تو یہ نہ کہو کہ یہ کرتا تو یہ ہوتا بلکہ یہ کہو کہ اللہ نے جو چاہا مقدر کردیا۔ لفظ ''اگر'' شیطانی وساوس کا دروازہ کھول دیتا ہے۔''

اسلام کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ باطل کے مقابلے میں وہ پیہم جدوجہد کی دعوت دیتا ہے، جو ہمیشہ سے چلی آرہی ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ.

(الانفال: ٣٩)

''اور ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (یعنی کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین

سب خدا ہی کا ہو جائے۔''

حضور ﷺ کا ارشاد ہے: مجھے لوگوں سے قتال کا حکم ہے تا آنکہ وہ (کلمہ توحید کا اقرار کرلیں) کہیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ جب وہ اس کلمے کا اقرار کرلیں گے تو مجھ سے اپنے جان و مال کو محفوظ کرلیں گے سوائے (اس کے کہ جہاں اسلام جان و مال کو خرچ کرنے کا حکم دے) اس کے حق کے اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے پاس ہوگا۔ (شرح نووی: ج ا ص ۴۰۶)

دین اسلام کا یہ مزاج ہے کہ وہ اپنے پیرووں کے لئے کسی بھی حال میں گھٹیا پن اور ذلت و کمزوری کو نہیں پسند کرتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (المنافقون:۸)

''حالانکہ عزت خدا کی ہے اور اس کے رسول ﷺ کی اور کومنوں کی۔''

لہذا جہاد مومنین کے لئے جنت کا راستہ اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا سبب قرار پایا، مجاہد کو جنت اور آخرت کی نعمت و راحت کی بشارت سنائی گئی۔ جہاد کا چھوڑنا اور اس سے بیٹھ رہنا ذلت و رسوائی کا سبب بنتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو۔ (بلکہ) اس سے اللہ تعالیٰ کی عافیت طلب کرو۔ لیکن جب دشمن سے مڈبھیڑ ہو ہی جائے تو جم کر لڑو اور یاد رکھو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔ (شرح نووی: ج ۱۲ ص ۴۵)

حضور ﷺ نے صحابہ کرام کو جہاد کی ایسی تربیت دی کہ ان کے دلوں میں جہاد کا شوق پیدا ہوگیا، ان کے سینے شوق جہاد سے بھر گئے، دلوں میں جہاد ہی کا سودا سمایا رہنے لگا۔ چنانچہ انھوں نے اعلان حق کیا، نیکیوں کا حکم دیا، برائیوں سے روکا، لوگوں میں عدل وانصاف قائم کیا اور حدیث کے مطلب کو کہ ''جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔'' اچھی طرح سمجھا۔

یہ حدیث قصر جہاد کی وہ اینٹ ہے جس کے سائے میں صحابہ کرام نے تربیت پائی اور آپ ﷺ کے ارشاد کہ ''طاقتور بندۂ مومن کمزور بندۂ مومن سے افضل ہے۔'' کی فضا میں پروان چڑھے۔

امام نووی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہاں قوت سے مراد آخرت کے لیے

جان ودل سے تیار رہنا ہے۔ جس بندۂ مومن میں یہ صفت پائے جائے گی وہ دشمن کے مقابلے میں نکلنے اور جہاد کرنے کے لئے پروانہ وار بڑھنے میں پیش پیش ہوگا، اس کے اندر نیکیوں کا حکم دینے اور برائیوں سے روکنے کا شوقِ فراواں ہوگا اور وہ اس راہ کی ہر مشکل و تکلیف کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں خوشی خوشی برداشت کرے گا اور وہ نماز روزہ کی ادائی اور ذکر خداوندی میں رطب اللسان رہنے میں نہایت چاق چوبند اور سرشار و سرمست ہوگا، اسی طرح دوسرے احکام شریعت کا وہ پابند وشیدائی ہوگا۔ (شرح نووی: ج۱۶ص۲۱۵)

جو شخص آپ ﷺ کی سیرت کا بہ نظر غائر مطالعہ کرے گا اس کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ آپ ﷺ مجاہدانہ زندگی گزارنے پر زور دیتے تھے۔ ہجرت کے بعد آپ کے وقت کا بیشتر حصہ اللہ کی راہ میں غزوات وسرایا میں صرف ہوا۔ اوران غزوات وسرایا کے درمیان آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کی ہمہ جہت تربیت فرماتے تھے۔ ارشاد ربانی ہے:

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يَشْرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ (النساء:۷۴)

''تو جولوگ آخرت (کوخریدتے اوراس) کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچنا چاہتے ہیں ان کو چاہئے کہ خدا کی راہ میں جنگ کریں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِأَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (التوبہ:۴۱)

''تم سبک بار ہو یا گراں بار (مال واسباب تھوڑا رکھتے ہو یا بہت) گھروں سے نکل آؤ اور خدا کے راستے میں مال اور جان سے لڑو یہی تمھارے حق میں اچھا ہے بشرطیکہ سمجھو۔''

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ مجاہدانہ زندگی کی تربیت طاقتور بندہ مومن کو ایک نئی طاقت عطا کرتی ہے اوراس کو فائدہ پہنچانے والی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ بذات خود مجاہد کے لئے قوت وجواں مردی میں بہترین نمونہ تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ سب سے حسین، سب سے زیادہ سخی اور سب سے بڑھ کر جری و بہادر تھے۔ ایک رات مدینہ کے لوگ گھبرا گئے سب پر خوف طاری ہوگیا۔ آپ ﷺ حضرت طلحہ کے گھوڑے پر ننگی پیٹھ بلا زین کے سوار ہو کر اس سمت کو نکل پڑے جدھر سے آواز آئی تھی، دوسرے لوگ بھی نکلے تو دیکھا کہ حضور ﷺ سب سے پہلے اس سمت کو پہنچ چکے ہیں، جدھر سے آواز آئی تھی اور آواز کا سبب معلوم کیا۔ (الفروسیۃ لابن القیم: ۱۵۹)

حضور ﷺ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مومن قوی اور شہ سواری وجواں مردی کی مثالیں اپنے ذاتی عمل سے پیش فرماتے رہتے تھے۔ آپ ﷺ سے دوڑ کا مقابلہ بھی مذکور ہے۔ اونٹوں کی دوڑ کا مقابلہ بھی فرمایا۔ آپ نے نیزہ بازی کا مقابلہ بھی دیکھا سنن ابی داؤد حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے فرمایا: حضور ﷺ نے ہم سے دوڑ کا مقابلہ کیا میں آگے بڑھ گئی۔ کچھ عرصے کے بعد جب میرا بدن بھاری ہوگیا تھا دوبارہ آپ نے دوڑ کا مقابلہ فرمایا اس مرتبہ میں پچھڑ گئی تو آپ نے فرمایا یہ پہلی مرتبہ میرے پیچھے رہ جانے کا بدلہ ہوگیا۔

اس طرح کی چیزوں سے حضور ﷺ مومن قوی کے مفہوم ومعنی کی اپنے قول وعمل سے وضاحت فرماتے رہتے تھے۔

حضرت رکانہ بن یزید نے جو بڑے قوی تھے اپنے اسلام لانے سے قبل مکہ مکرمہ میں حضور ﷺ سے کہا کہ اگر آپ مجھے پچھاڑ دیں تو میں ایمان لاؤں گا۔ کشتی ہوئی اور حضور ﷺ نے رکانہ کو پچھاڑ دیا۔ شکست کھا جانے کے بعد رکانہ نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ تم جادوگر ہو۔ پھر بعد میں اسلام لائے۔ (الفروسیۃ لابن القیم: ص ۸۷)

مختلف مواقع پر حضور ﷺ صحابہ کرامؓ کے اندر قوت وطاقت اور جہاد کی روح پھونکتے اور بیدار فرماتے رہتے تھے۔

بخاری شریف میں سلمہ بن اکوع سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کا بنو اسلم کے کچھ لوگوں کے پاس سے گزر ہوا جو بازار میں نیزہ بازی دکھا رہے تھے، آپ نے فرمایا: اے بنی اسماعیل تم تیر اندازی کرو۔ تمھارے باپ تیر انداز تھے چلو تیر چلاؤ میں فلاں جماعت کی ساتھ

ہوں۔ (الفروسیۃ لابن القیم: ص ۸۷)

صحابہ کرامؓ شہ سواری پسند فرماتے تھے اور نشاط و توانائی پیدا کرنے کی فکر کرتے تھے اپنے جسم مبارک کو قوی بنانے کی مشقیں کرتے رہتے تھے، حضرت عقبہ بن عامر بڑھاپے میں بھی دونوں باتوں کی مشق کرتے تھے، آپ سے کہا گیا بڑھاپے میں یہ ورزش کر رہے ہیں، اس سے آپ کو تکلیف ہوگی، یہ سن کر انھوں نے جواب دیا کہ اگر ہم نے حضور ﷺ سے ایک بات نہ سنی ہوتی تو ہم یہ تکلیف نہ اٹھاتے۔ میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''جس نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (الفروسیۃ لابن القیم: ص ۱۱۶)

اسلام طاقتور مسلمان کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس دین کا مزاج مجاہدانہ ہے۔ لہذا وہ عزت کا داعی ہے، وہ اس دین کی اشاعت کے لئے ضرورت پڑنے پر میدان کارزار کی طرف نکلنے کا داعی ہے کہ کمزور لوگوں کو بندوں کی عبادت سے نکال کر بندوں کے مالک کی عبادت کی طرف بلائے کہ لوگوں میں جوڑ پیدا کرے، دوستوں سے وعدے ہوں، دشمنوں سے معاہدے ہوں، اس کو عہد شکن دشمنوں کو نیچا دکھانے کے لئے قوت وطاقت کے اسباب کی بھی ضرورت ہے۔ اسی طرح دشمنوں کو نقصان کے علاوہ جن لوگوں سے خطرہ ہوسکتا ہے، ان کو ڈرانے اور ان پر دباؤ رکھنے کے لئے بھی قوت وطاقت کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِيَانَةً فَانۡبِذۡ اِلَيۡهِمۡ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡخَآئِنِيۡنَ۔ (الانفال: ۵۸)

''اور اگر تم کو کسی قوم سے دغا بازی کا خوف ہو تو (ان کا عہد) انھیں کی طرف پھینک دو۔ (اور) برابر (کا جواب دو) کچھ شک نہیں کہ خدا دغا بازوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

اسلام عہد کو نباہنے کی تاکید کرتا ہے۔ جب فریق ثانی کی طرف سے خیانت و عہد شکنی دیکھتا ہے تو معاہدے کو علی الاعلان ختم کر دیتا ہے۔ اور عہد ختم ہونے کے بعد جنگ ضروری ہے۔ جو داؤں پیچ اختیار کرنے کی متقاضی ہے اور جنگ میں دشمن کو غلط فہمی میں ڈالنے والی چال اپنانے کی اجازت ہے۔ جنگ کے لئے قوت وطاقت کی تیاری بیدار مغزی اور ہمہ وقت چاق چوبند رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ مقابلے کے لیے تو ہر دشمن اپنا ساز وسامان تیار کرنا

ضروری سمجھتا ہے۔ جنگ کے موقعے پر دشمن کو غفلت میں رکھنے کی ہر چال درست ہے۔ اس کو دھوکا نہیں کہا جائے گا اور مومن قوی ہی ان تمام صورتوں میں اپنا رول اور کردار کر سکتا ہے۔

اسی لئے اسلام نے قوت کے مفہوم اور دائرہ کو وسیع معنی میں لیا ہے، جسم کی طاقت، مال کی طاقت، قلم کی طاقت، اسلاف نے مومن قوی کے معنی اسی طرح سمجھا اور سمجھایا ہے۔ لہذا اس اعتبار سے شہ سواری کی دو قسمیں ہیں۔ علم وقدرتِ کلام کی مہارت، یہ ایک قسم کی شہ سواری ہے علمی میدان کے لیے۔ نیزہ بازی و تیراندازی شہ سواری ہے میدان جنگ کے لیے، چونکہ صحابہ کرامؓ ان دونوں میدانوں کے ماہر تھے، اس لئے قدرت کلام اور دلائل کے ذریعے ملکوں کو فتح کیا اور تلوار کے ذریعے ملکوں کو فتح کیا۔ ان دونوں قسموں کے لوگ ہی اسلام کے صحیح خادم ہیں ان دونوں کے علاوہ لوگ ان کے معاون وسہارا نہیں بلکہ وہ نوع انسانی پر بوجھ ہیں۔ (الفروسیة: ۱۵۷)

قرآن کریم مسلمانوں کو طاقت بڑھانے کی دعوت دیتا ہے۔ جسمانی طاقت کو بڑھانے والے اسباب اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ تاکہ جہاد کی صلاحیت پیدا ہو سکے ارشاد ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (الانفال:۶۰)

''اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لئے مستعد رہو کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمھارے دشمنوں اور ان کے سوا اور لوگوں پر جن کو تم نہیں جنتے اور خدا جانتا ہے ہیبت بیٹھی رہے گی اور تم جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرو گے اس کا ثواب تو تم کو پورا پورا دیا جائے گا۔ اور تمھارا ذرا نقصان نہیں کیا جائے گا۔''

مسلم شریف میں حضرت عقبہ سے روایت ہے کہ ہم نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ان (دشمن) کے لئے جو بھی طاقت پیدا کر سکتے ہو کرو۔ یاد رکھو تیراندازی طاقت ہے۔ لہذا اپنی وسعت بھر تیاری کرنا فرض ہے جو فریضۂ جہاد کی ادائی کے لئے معاون ہے۔

قرآن ہر طرح کی طاقت اور وسائل واسباب کو تیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ لفظ ''قوۃ'' نکرہ استعمال ہوا ہے۔عربی زبان میں اس طرح کے لفظ کا استعمال وسعت وعموم کو بتانے کے لئے کیا جاتا ہے۔''رباط الخیل'' کوخصوصیت کے ساتھ اس لئے ذکر کیا کہ قرآن کریم کے مخاطب اول اہل عرب کو گھوڑوں کی سواری اوران کے پالنے میں خصوصی امتیاز حاصل تھا، اگر قرآن کریم ان کو ایسے اسباب تیار کرنے کا حکم دیتا، جن سے وہ اس وقت واقف نہیں تھے اور بعد میں وہ چیزیں وجود میں آ سکتی تھیں تو ایسی صورت میں ان کو نا قابل فہم چیزوں کا حکم دیا جاتا۔

اصل چیز یہ ہے کہ ''رباط الخیل'' کا صحیح مفہوم سمجھا جائے جو حالات اور زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔اس لئے کہ اسلام کو طاقت کی ضرورت ہے جس کے ذریعے کمزوروں اور مظلوموں کو ظلم کی چکی میں پسنے سے بچائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۔ (النساء:۷۵)

''اورتم کو کیا ہوا ہے کہ خدا کی راہ میں ان کے بےبس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو دعائیں کیا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو اس شہر سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا۔''

مفسر قرآن ابن کثیرؒ واعدوا لھم ماستطعتم کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے مقابلے کے لئے اپنی قدرت بھر ہر قسم کے سامان جنگ کو تیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ ہم نے حضور ﷺ کو منبر پر آیت کریمہ واعدولھم ماستطعتم من قوۃ کی تلاوت کے بعد فرماتے ہوئے سنا، سن لو! تیراندازی قوت ہے۔آیت کی تشریح میں آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ تیراندازی قوت ہے۔اس بات کو واضح کردیتا ہے کہ جہاد کی اہم خصوصیت دشمن کو شکست دینے کے لئے ہتھیار مارنا خواہ تیر کی شکل میں ہو یا بندوق، پستول اور آج کے دیگر جدید ہتھیاروں کی شکل میں۔رمی یعنی پھینکنا اور چلانا سبھی

ہتھیاروں کے مفہوم پر مشتمل ہے جو طاقت کا اہم پہلو ہے۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو صرف تیر اندازی سیکھنے ہی پر نہیں آمادہ کیا بلکہ عمل کو برابر جاری رکھنے کا حکم فرمایا۔

خالد بن ولید جہنی سے مروی ہے کہ عقبہ بن عامر جب ہمارے پاس سے گزرتے تو فرماتے خالد ہمارے ساتھ چلو تیر اندازی کریں، ایک دن میں نے ذرا دیر کر دی تو انھوں نے کہا خالد! آؤ ہم تم کو آپ ﷺ کی بتائی ہوئی ایک بات بتاتے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا تو انھوں نے کہا حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرے گا، ایک تیر بنانے والے کو جو ثواب کی نیت اور دینی خدمت کے ارادے سے تیر بناتا ہے۔ اسی طرح اس کے چلانے والے کو اور تیر اٹھا اٹھا کر دینے والے کو، تم لوگ تیر اندازی اور شہسواری کی کوشش کرو۔ تمھاری تیر اندازی مجھ کو شہسواری سے بھی زیادہ پسند ہے۔ کھیل اور تفریح صرف تین چیزوں میں درست ہے، اپنے گھوڑے کو سکھانے اور تربیت کرنے میں دلچسپی، بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق اور تیسری چیز تیر اندازی۔ تیر اندازی سیکھنے کے بعد جو شخص اس کو ناپسندیدگی کی وجہ سے چھوڑ دے تو اس نے ایک نعمت کی ناشکری کا ارتکاب کیا۔ یا آپ نے یہ فرمایا کہ نعمت کا سرے سے انکار کر دیا۔ (سنن نسائی شرح السیوطی وحاشیہ السندی: ج ۶ / ۲۲۳)

یہ حدیث مدینہ منورہ کے اندر قائم ہونے والے ترقی پذیر معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر ہے جو جہاد و غزوات کی فضا میں پروان چڑھ رہا تھا اور جس میں مجاہدانہ تربیت کا عمل برابر جاری تھا کہ آیت مبارکہ کے وسیع مفہوم میں جہاد کے اسباب اپنائے جائیں۔ معاشرہ اسی کی روشنی میں پروان چڑھے آیت کریمہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ جہاد کی علمی و عملی مشق کے مسلسل عمل کی دعوت دیتی ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا! جس شخص کا انتقال اس حال میں ہو کہ اس نے نہ جہاد کیا اور نہ اس کے دل میں کبھی جہاد کا جذبہ پیدا ہوا۔ تو وہ نفاق کا اثر لے کر مرا۔

(سنن نسائی شرح السیوطی وحاشیہ السندی: ج ۶ / ۲۲۳)

حضرت نجیح سلمی سے مروی ہے کہ ہم نے حضور ﷺ کو فرماتے سنا کہ جس نے اللہ کی راہ میں ایک تیر پہونچایا اس کو جنت میں ایک درجہ حاصل ہو گیا اس دن ہم نے سولہ تیر

پہنچائے۔فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے اللہ کی راہ میں ایک تیر چلایا اس نے ایک بندۂ آزاد کو بےفکر اور آزاد کرنے کا ثواب حاصل کرلیا۔
(سنن نسائی شرح السیوطی وحاشیہ السندی: ج۶/۲۲۳)

آپ ﷺ کا آیت پاک کی تشریح میں فرمانا کہ تیراندازی قوت ہے۔آپ کی معجز بیانی کی دلیل ہے کہ برسہابرس سے اس میں پیش آنے والی جنگوں میں استعمال ہونیوالے سبھی ہتھیار آ جاتے ہیں کیونکہ رمی یعنی پھینکنے کا ہر عمل ہر ہتھیار میں پایا جاتا ہے۔لہذا ہر ایسے ہتھیار کا بنانا اس کی مشق کرنا سب ''ان القوۃ الرمی'' میں آ جاتا ہے۔معرکہ آرائی اور جنگوں میں کامیابی کا یہ اہم جز ہے جو تیر اندازی سے شروع ہوکر دور مار راکٹ و بمباری جہازوں پر جاکر ختم ہوتا ہے جو سب کا سب رمی کے لفظ میں آ جاتا ہے اور جنگ وجدال کے سبھی وسائل کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔

موجودہ زمانے میں اس مومن قوی کی کتنی سخت ضرورت ہے جو رمی کا ماہر ہو۔امت آج اس مرد قوی کی کتنی محتاج ہے جس کا وہ سہارا لے اور جس سے اپنی قوت کو مضبوط کرے،اس کا ہاتھ پکڑے اور اس کے ذریعہ دشواریوں پر قابو پائے اور اس کے ذریعہ اپنے وہ وسائل تیار کر سکے جس کے ذریعے مشرق ومغرب کے کمزور مردوں،عورتوں اور بچوں کو مصیبت سے نجات دلا سکے۔ اور ان کو مدد بہم پہونچا سکے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (النساء:۷۵)

''اور تم کو کیا ہوا ہے کہ خدا کی راہ میں ان بےبس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو دعائیں کیا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو اس شہر سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا،اور اپنی ہی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار مقرر فرما۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات بےہمتا پر ایمان ہی ہم کو ہر اعتبار سے قوت وطاقت کی جان

عطا کرتا ہے، لھذا مرد مومن اللہ کے سوا کسی اور کے فضل ونوازش کا امیدوار نہیں ہوتا اور اللہ کے سامنے کسی اور چیز کی کوئی پروا نہیں کرتا، اس ایمانی طاقت کی مثال حضرت خبیبؓ بن عدی کے قصے میں آئینہ کی طرح سے سامنے آجاتی ہے، کفار جب ان کو دار پر چڑھانے کے لئے لائے تو حضرت خبیبؓ نے کہا اگر تم مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت دینا پسند کرو تو دے دو، میں دو رکعت پڑھ لوں، ان لوگوں نے نماز کی اجازت دے دی۔ حضرت خبیبؓ نے نہایت ہی خضوع وخشوع کے ساتھ دو رکعتیں ادا فرمائیں، نماز سے فارغ ہوکر ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اگر مجھے اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ تم یہ خیال کروگے کہ ہم نے قتل کے خوف سے نماز لمبی کردی ہے تو میں نماز کی لذت میں دیر تک ڈوبا رہتا، اور اس کے بعد چند اشعار پڑھے جن کا ترجمہ ہے:

''مختلف قبائل وجماعتوں کے لوگ جمع ہوگئے ہیں اور وہ سب میرے قتل پر تلے ہوئے ہیں''

انھیں اشعار میں سے ذیل کے چند اشعار کا ترجمہ دیا جارہا ہے جو ان کی قوت ایمانی کی صحیح اور سچی تصویر پیش کرتا ہے:

''وطن سے دور پردیس میں اپنی مصیبت وپریشانی اور دشمنوں کے اس جمگھٹے میں جہاں جان کے لالے پڑگئے ہیں صرف اللہ سے فریاد کرتا ہوں، اور جو کچھ پیش آرہا ہے اللہ ہی کی راہ میں پیش آرہا ہے اور اگر وہ چاہے تو ہمارے جسم کے بکھرے ہوئے جوڑوں اور پاش پاش ٹکڑوں میں برکت دے دے جب میں اسلام کے نام پر قتل کیا جارہا ہوں تو اس سعادت عظیمہ کے حصول پر مجھے ذرہ برابر پرواہ نہیں کہ اللہ کے نام پر مجھے کس پہلو گرایا جائے گا۔ (سیرۃ ابن ہشام، ج۳،۴، ص ۱۷۶)

بندۂ مومن کی طاقت کا یہ اعجاز ہے کہ وہ ہر حال میں حق گوئی سے کام لیتا ہے اور اسی پر قائم رہتا ہے، بندہ مومن کی قوت ایمان ہی کی یہ دین ہے کہ اس کو ہمیشہ ہمیش جنت میں رہنے کا یقین حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر راضی اور خوش رہتا ہے۔ اس کو یہ یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ پیش آرہا ہے سب محبوب حقیقی کی طرف سے پیش آرہا ہے، اس کی نگاہوں میں یہ ارشاد ربانی گھوم رہا ہوتا ہے:

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا (التوبہ:۵۱)

بندہ مومن اس عقیدے پر مطمئن رہتا ہے کہ اس کا رزق متعین ہے، اس کی موت کا دن مقرر ہے۔ کسی اور کی یہ مجال نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے میں رکاوٹ بن سکے، لہذا بندہ مومن حق گوئی ہی کو پورے اعتماد و وثوق کے ساتھ اپنا شعار بناتا ہے اور اپنے ہر قول وعمل میں حسن اخلاق کا لازوال نمونہ پیش کرتا ہے اور اپنے اس ایمانی کردار کی وجہ سے حرص وہوس، بخیلی و بزدلی جیسی بری خصلتوں سے آزاد ہوتا ہے۔ اور اس کے اندر تمام ایمانی قدریں جمع ہو جاتی ہیں۔ یہ مومن قوی اپنے ایمان وعقیدہ، اپنے علم ویقین، جسم وجان، مجاہدانہ مشق وتربیت سب میں فائق ہوتا ہے۔ یہی راز ہے کمزور مومن سے اس کے افضل وبہتر ہونے کا۔ **اللھم اجعلنا منھم.**

آپ ﷺ نے مومن قوی کے مفہوم کی وضاحت ایک اور انداز سے فرمائی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''دوسرے کو پچھاڑ دینے والا طاقتور نہیں، صحابہ کرام نے عرض کیا اللہ کے رسول ﷺ پھر کون طاقتور ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا! جو شخص غصے کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے وہ ہے طاقتور۔

(صحیح مسلم شرح نووی ج ۱۶)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ان سارے ہی مفہوموں کے اعتبار سے مومن قوی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اس مومن سے جو کمزور ہو۔ لیکن حدیث کے الفاظ میں (وفی کل خیر) کلٍّ (ہر ایک) کے لفظ کو نکرہ لانا اور تنوین لگانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ بھلائی دونوں ہی میں ہے۔ دونوں ہی صاحب ایمان ہیں اور کمزور مومن بھی اپنے ضعف کے ہوتے ہوئے بہت سے ان نیک کاموں میں مشغول ہوتا ہے جو قوی نہیں کرتا، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مومن جسمانی طور پر تو کمزور ہوتا ہے لیکن اس کا ایمان مضبوط ہوتا ہے۔ اس کے پاس مال زیادہ ہوتا ہے۔ اس طرح سے کبھی وہ دیکھنے میں تو نحیف وکمزور ہوتا ہے لیکن فکری اور تحریری صلاحیت میں بہت فائق ہوتا ہے۔ جس سے دین کی خدمت کرتا ہے (اس کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث میں مروی ہے کہ علماء کے قلم کی روشنائی شہداء کے خون کے برابر ہوگی۔

حدیث پاک کے الفاظ (وفی کل خیر) ہر ایک میں بہتری ہے۔ خیر کے اسی مفہوم اور اسی طرح کے دوسرے معانی پر مشتمل ہیں۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ ''جس چیز سے تم کو نفع پہنچے اس کے جویا اور خواہاں رہو اور مدد اللہ سے چاہو، اس میں جلدی مچاؤ۔'' حریص بنو کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور فضل کے طلب گار بنے رہو، اور اپنی اس طلب میں اللہ تعالیٰ ہی سے چاہو۔ عبادت و فضل خداوندی طلب کرنے میں کمزوری اور سستی نہ دکھاؤ۔ مومن قوی کی پہچان یہ ہے کہ اپنے فرائض وحقوق ادا کرنے میں چاق چوبند ہو، ادائے حقوق کی حرص اور اس کا شوق رکھتا ہو، اس لئے کہ شوق ورغبت کمزوری اور سستی کا مقابلہ کرتے ہیں، ان دسائل واسباب کو اپنانے کے بعد افسوس نہ کرے نہ شرمندہ ہو کہ شیطانی وساوس کا دروازہ کھل جائے اور کہے ''اگر میں نے کوشش کی ہوتی تو ایسا ہو جاتا ویسا ہو جاتا لیکن اللہ کی مرضی جو چاہا کیا۔ ''اگر'' کہنا شیطان کے لئے دروازہ کول دیتا ہے (صحیح مسلم ج ۱۶ر ص ۲۱۵)

قاضی عیاض نے اس سلسلے میں ذرا وضاحت کی ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ لفظ ''اگر'' کہنے کی یہ ممانعت اس شخص کے لئے ہے جو اس پر یقین کر کے کہے کہ اگر ایسا کیا ہوتا ایسا ضرور ہو جاتا۔ لیکن جو شخص اس کو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر محمول کرتے ہوئے کہے اس کو وہی چیز پہنچ سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقدر فرمادی ہے تو اس کا لفظ ''اگر'' کہنا اس میں نہ شمار ہوگا کہ اگر شیطان کے لئے دروازہ کھول دیتا ہے۔ حدیث کے الفاظ دنیا وآخرت دونوں قسم کی بھلائیوں پر مشتمل ہیں۔

اور نفع بخش امور دو طرح کے ہوتے ہیں۔ دینی اور دنیوی اور بندہ دونوں ہی کا محتاج ہے۔ بہر دوصورت بندے کی سعادت اور توفیق کا مدار نیک کاموں اور عبادت کے سلسلے میں اس کی کوششوں پر ہے جب کہ اپنی کوشش میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا بھی طالب ہو، حاصل یہ کہ جب بھی بندہ اس عمل کو اس قید استعانت کے ساتھ اپنائے گا اس میں اس کو کامیابی حاصل ہوگی اور اگر ان تین باتوں میں سے کسی بات کی کمی ہوگی تو وہ بھلائی سے محروم ہو جائے گا اور جو ان نفع بخش چیزوں کا حریص نہ ہوگا بلکہ سستی وکاہلی کا شکار ہوگا تو ناکام ونامراد رہے گا۔ (صحیح مسلم ج:۱۶ص ۲۱۵)

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) مومن قوی کا مطلب ہے ایمان میں پختگی، بدن میں مضبوطی، اپنی سوچ اور فکر میں

بیدار مغزی، اسی طرح مالی طور پر خود کفیل بلکہ کفالت کرنے کی اہلیت رکھنے والا، غرض یہ کہ ہر اس صلاحیت واستعداد کو حاصل کرے جو امت مسلمہ کو فائدہ پہنچا سکے۔

(۲) حدیث سے مومن کی قوت کی پہچان یہ معلوم ہوئی کہ وہ ان وسائل کے حصول اور اس لئے ہمہ وقت متحرک اور چاق چوبند رہتا ہے جو ملک وملت کے لئے مفید ہوں۔

(۳) حدیث سے یہ بھی رہنمائی ملتی ہے کہ بندہ مومن کو بے کسی اور دوسروں کے سامنے کمزوری ظاہر کرنے سے بہت بلندر رہنا چاہئے، اسی طرح اضمحلال و پژمردگی سے بھی دور رہنا چاہئے تاکہ اس کی زندگی بہادری وجواں مردی، زندگی و زندہ دلی کی جیتی جاگتی مثال ہو جسے دیکھ کر دوسرے بھائیوں کا بھی حوصلہ بڑھے۔

(۴) حدیث سے بندہ مومن کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی معلوم ہوئی کہ وہ ہر آن و ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ومطمئن رہے۔

(۵) حدیث یہ بھی بتاتی ہے کہ اسباب ووسائل میں کوتاہی نہ کرنی چاہئے لیکن اسباب اختیار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو فیصلہ ہو اس پر مطمئن وراضی رہنا چاہئے۔

(۶) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میدان جہاد کی طرف نکلنے سے پہلے اپنے نفس کے ساتھ جہاد اکبر کرے کہ اس میں کہیں سے شیطان کا دخل نہ ہونے پائے کہ اس کی خواہش وچاہت میں، شوق ورغبت میں اپنی ذاتی مصلحت، خاندان اور قوم وقبیلہ کے مفاد کا شیطانی وسوسہ شامل ہو، بس جو قدم بھی اٹھے اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے دین کی نصرت کے لیے اٹھے۔

حدیث کا فقہی پہلو

حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قضا وقدر پر ایمان رکھنا واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ پر مخلوق کی تقدیر لکھ دی ہے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا فرمایا اور اس کو لکھنے کا حکم دیا۔ قلم نے پوچھا کیا لکھوں؟ الہ رب العزت نے فرمایا، قیامت تک جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کو لکھو۔ انسان کو جو کچھ اچھا یا برا پیش آتا ہے، وہ اس سے بچ نہیں سکتا کہ پہلے سے طے شدہ ہے۔ اور جو چیز مقدر نہیں اچھی ہو یا بری وہ اس کو مل نہیں سکتی۔

تقدیر اللہ تعالیٰ کے تابع ہے اس نے جو چاہا لوح محفوظ میں لکھ دیا۔ ماں کے پیٹ میں جب بچے کو پیدا فرماتا ہے تو اس میں روح پھونکنے سے پہلے اس کے پاس ایک فرشتے کو بھیجتا ہے اور اس کو چار باتوں کا حکم دیتا ہے: اس کی روزی لکھ دو، اس کی موت لکھ دو، اس کا عمل لکھ دو، بد بخت یا خوش بخت لکھ دو۔

اس میں قوی وضعیف سب شامل ہیں قوی اور ضعیف کے اسی اشتباہ کی حضور ﷺ نے وضاحت فرمائی اور یہ فرمایا کہ دونوں میں خیر ہے۔

مومنین کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نافذ ہونے والے اس حکم میں اور اس کی قدرت قاہرہ میں ایمان ویقین بھی شامل ہے جو کہ اللہ نے چاہا وہ ہوا، اور جو نہ چاہا وہ نہیں ہوا۔ لہذا کسی بندۂ مومن کے لئے یہ زیبا نہیں کہ وہ یہ کہے کہ اگر ایسا کیا ہوتا تو یہ ہو جاتا وہ ہو جاتا۔ اس لئے کہ زمین وآسمان کا وجود اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ اور جو وہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں پر قادر ہے جو وجود میں آ گئی ہیں ان پر بھی اور جو ابھی وجود میں نہیں آئی ہیں ان پر بھی۔ (فتاوی ابن تیمیہ ج ۳/۱۴۸، ۱۴۹)

لَو یعنی ''اگر'' کا لفظ اپنے معنی میں بولنے والے کی نیت وارادے کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے، کبھی وہ برے کام کی تمنا وآرزو کے لئے بولا جاتا ہے یہ بھی ناپسندیدہ ہے اور کبھی اچھی تمنا اور آرزو کے لئے بولا جاتا ہے۔ یا علم نافع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تمنا کی یہ صورت پسندیدہ ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر میں اپنے کام میں لگ جاتا تو پھر نہ چھوڑتا، ایسے پیش آنے والے معاملات جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اگر میری امت پر دشوار نہ ہوتا تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم دیتا۔''

حدیث - ۷

مومن کامل

عن عبداللّٰہ بن عمرو رضی الله عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ والمهاجر من هجرمانهی اللّٰہ عنه

(صحیح بخاری، کتاب الایمان ج:۱ص ۵۳)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کامل اور سچا مسلمان وہ ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے جو ان تمام باتوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں، وہ مسلمان ہے اس کا مطلب کامل مسلمان ہے، یہ مطلب نہیں کہ جس نے اپنی زبان یا ہاتھ سے کسی کو تکلیف دی تو وہ اب مسلمان ہی نہ رہا، یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ علم تو وہ ہے جو نفع پہنچائے یا عالم تو زید ہے۔ جس کا مطلب پسندیدہ اور باکمال ہوگا یہ مطلب نہیں کہ جس سے فائدہ نہ پہنچا وہ عالم ہی نہیں۔ زید کے علاوہ کوئی عالم ہی نہیں، یا جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ آدمی تو عرب ہوتے ہیں یا عربوں میں کہا جاتا ہے، مال تو حقیقتاً اونٹ ہوتا ہے۔ سب کا موقع ومحل اور تفصیل وتشریح الگ الگ ہے۔ اس کا اندازہ ایک اور حدیث سے ہوتا ہے اوپر جو حدیث مذکور ہوئی اس کا مطلب یہی ہے کہ مسلمانوں میں سب سے اچھا مسلمان کون ہے؟ آپ نے فرمایا: جس مسلمان کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں، جب کہ اسلام اور مسلمان دونوں کو درجہ کمال تک پہونچانے کے لئے دوسری اور بہت سی چیزیں ہیں۔ اس حدیث پاک میں زبان اور ہاتھ کا ذکر ایک خاص وجہ اور مناسب سے فرمایا گیا ہے۔ (صحیح مسلم: ج ۲ رص ۱۰)

اس حدیث کا مطلب اور پس منظر سمجھنا ان تاریخی اسباب سے واقفیت پر منحصر ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت اور ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کے ماحول اور معاشرے سے تعلق رکھتے

ہیں جو اوس وخزرج قحطان ومہاجرین اور مکہ مکرمہ اور اس کے ارد گرد کے جو عدنانی ایمان لائے تھے ان سب پر مشتمل تھا، جب آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی اور حضرات انصار نے آپ کی مدد فرمائی تو اس وقت عدنانی، قحطانی سبھی اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے اور ان کے علاوہ مدینہ منورہ میں یہودیوں کے تین قبیلے بنوقینقاع، بنونضیر اور بنوقریضہ اور ان سب کے الگ الگ قلعے اور پناہ گاہیں تھیں، ان کے گاؤں بھی آباد تھے، جن میں وہ مل جل کر آزادانہ زندگی گزارتے تھے، یہودیوں کا اوس وخزرج سے تعلق خودغرضانہ تھا۔ جب ان کو اپنا فائدہ نظر آتا ان دونوں قبیلوں کو آپس میں لڑا دیتے تھے ان میں جنگ کی آگ لگا کر خود فائدہ اٹھاتے تھے۔

اس کے سبب اوس وخزرج میں بہت سی جنگیں ہوئیں۔ ہجرت سے پانچ سال پہلے تک پہلی جنگ سمیر کے نام سے اور آخری جنگ بسوس کے نام سے مشہور ہے۔ یہودیوں نے ان دونوں قبیلوں کو باہم لڑانے کی چالیں چلیں۔ ان میں باہم پھوٹ ڈالنے والے کاموں پر اکسایا اور ایک دوسرے کے خلاف حسد کی آگ بھڑکایا کہ یہ لوگ آپس میں لڑتے رہیں، یہودیوں کی طرف ان کی توجہ نہ ہو، وہ ان کی طرف سے مطمئن وفارغ ہوں۔ (سیرۃ ابن ہشام: ج ۱/ ۲۵۲)

قبائلی اور نسلی تعصّبات کے اس ماحول میں اسلام نے مسلمانوں کو اس سے بچانے اور دور رکھنے کے لئے تمام مسلمانوں کو خواہ وہ کسی بھی قوم وخاندان سے تعلق رکھتے ہوں باہم بھائی بھائی قرار دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''انما المومنون اخوۃ. ''مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

سہیلی نے نقل کیا ہے کہ جب صحابہ کرامؓ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو مدینہ منورہ کے مسلمانوں میں ہجرت کر کے آنے والوں میں آپ ﷺ نے بھائی چارہ کرایا تا کہ مہاجرین سے پردیس کی وحشت وگھبراہٹ دور ہو جائے، جو اپنے اہل خاندان وطن اور قبیلے کو چھوڑنے سے پیدا ہو گئی تھی۔ (الروض الانف: ج ۲/ ۲۵۲) وہ حضرات انصار سے گھل مل جائیں۔ ان میں باہم انس ومحبت پیدا ہو جائے، اور ایک دوسرے سے طاقت حاصل ہو۔

آپ ﷺ کو اس بھائی چارے کو بڑھانے اور اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے کی بڑی فکر تھی، اس لئے کہ کبھی کبھی قبائل کی اس ملی جلی آبادی کی بھائی چارے والی صاف ستھری فضا کو

معمولی معمولی اختلافات پراگندہ کردیتے تھے۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ دو غلاموں میں جھگڑا ہو گیا ایک کا تعلق مہاجرین سے تھا دوسرے کا انصار سے۔ مہاجر نے آواز دی اے مہاجرین! اور انصاری نے انصار کو پکارا۔ آواز سن کر آپ ﷺ باہر تشریف لائے۔ فرمایا یہ کیا تم لوگ جاہلیت کی باتیں کررہے ہو؟ لوگوں نے کہا نہیں اللہ کے رسول ایسا نہیں ہے، دو غلام آپس میں لڑ گئے۔ ایک نے دوسرے کی پشت پر گھونسا مار دیا۔ آپ نے فرمایا خیر! کوئی بات نہیں، پھر نصیحت فرمائی دیکھو بھائی آدمی کو اپنے بھائی کی مدد کرنی چاہئے خواہ وہ ظالم ہو، (اس کو ظلم سے روکے) اور مظلوم ہو تو اس کی طرف سے بیچ بچاؤ کرے، اس خوبصورت انداز سے آپ نے حق کی طرف سے دفاع کا ایک ڈھنگ بتا دیا۔

انھیں مربیانہ طریقوں میں سے آپ کا یہ ارشاد بھی کہ (سچا) مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ یہاں ہاتھ کے لفظ کا استعمال گویا پیچھے سے مارنے کی تصویر کشی کررہا ہے خواہ ہاتھ سے ہو یا کسی اور چیز ڈنڈے وغیرہ سے مقصود مسلمان کی طرف اس کو تکلیف پہنچانے کے لئے ہاتھ کا چلانا ہے اس ہاتھ چلانے کے ساتھ زبان سے سخت الفاظ بھی نکلتے ہیں، اسی فطرت کو ذہن میں رکھ کر آپ نے اپنے ارشاد میں لسان (زبان) کا لفظ استعمال فرمایا، اس طرح کے واقعات وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے تھے جو معاشرے کی برادرانہ فضا کو مکدر کردیتے تھے، اور اس کے متقاضی ہوتے تھے کہ اس کا فوراً مداوا کیا جائے اور ایسے موقعوں پر مناسب حل اختیار کیا جائے۔

سفیان بن عیینہ نے روایت کیا ہے کہ عمرو نے جابر بن عبداللہ کو کہتے ہوئے سنا۔ ایک دن صبح کو ہم لوگ حضور ﷺ کے پاس تھے کہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو پشت کی طرف سے مار دیا، اس انصاری نے انصار کی دہائی دی، اس پر مہاجر نے مہاجرین کو پکارا۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کیا جاہلیت کی باتیں ہورہی ہیں؟ چھوڑو یہ بڑی گندی بات ہے۔ منافق عبداللہ بن ابی نے سن لیا، اس نے کہا اب تو بات ہو چکی، خدا کی قسم جب ہم مدینہ پہنچیں گے تو وہاں کا معزز شخص ذلیل کو ضرور نکال دے گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ کے رسول ﷺ آپ اجازت دیں تو میں اس منافق کی گردن مار دوں، آپ نے فرمایا یہ نہ کرو کہ لوگ یہ کہنے لگیں کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو

قتل کردیا کرتے ہیں۔ آیت قرآنی اسی واقعے کی طرف اشارہ کررہی ہے:

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ۔ (المنافقون:۸)

''کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر مدینہ پہنچے تو عزت والے ذلیل لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے۔''

کبھی کبھار یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات پیش آتے رہتے تھے جس سے مدینہ منورہ کا پرسکون ماحل مکدر ہوجاتا تھا اور اس کے متعدد اسباب ہوتے تھے۔

(۱) ایک بڑا سبب تو مدینہ منورہ میں منافقین اور یہود کا وجود تھا جو اسلامی اخوت واتحاد کی اہمیت اور خطرے کو جانتے تھے کہ یہ ان کے حق میں کیا ثابت ہوگا۔

(۲) اسلام سے قبل گزشتہ زمانے میں اوس وخزرج کے درمیان ہونے والی جنگوں کے اثرات بھی باقی تھے۔

(۳) تمام عرب کے لوگ دین وعقیدے میں قریش اور اہل مکہ کے تابع تھے، وہ قریش کو بیت اللہ شریف کے متولی اور دین وعقیدہ میں نمونہ ہونے کی نظر سے دیکھتے تھے، اور قریش اوس وخزرج کے معترف تھے، جن کا تعلق عرب عاربہ بنوقحطان سے تھا، ان کی باہم شادیاں بھی ہوا کرتی تھیں، گو وہ اپنے کو ان سے افضل سمجھتے تھے، چنانچہ غزوہ بدر کے موقع پر جب انصار کے کچھ نوجوان مقابلے کے لئے نکلے تو عتبہ بن ربیعہ نے کہا: اے محمدؐ! ہمارے مقابلے میں ہمارے ہمسر لوگوں کو اتارو جو ہماری قوم سے ہوں، تو آپ ﷺ نے ابوعبیدہ بن حارث، حضرت حمزہ اور حضرت علی کو مقابلہ میں اترنے کی دعوت دی، جب یہ حضرات بڑھے تب انھوں نے کہا: ہاں یہ ہیں ہمارے جوڑے کے معزز لوگ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش کے لوگ مدینہ منورہ کے لوگوں کو کھیتی باڑی کے کام کی وجہ سے جس کے لئے مدینہ کی زمین سازگار تھی اور ان کا ذریعہ معاش تھا۔ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان وجوہات کی وجہ سے اس طرح کے واقعات کئی

مرتبہ پیش آئے۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک مہاجر نے پیچھے سے ایک انصاری کو مار دیا، انصاری نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بدلے کا مطالبہ کیا، آپ نے فرمایا: چھوڑو یہ گندی بات ہے۔

(شرح صحیح مسلم، نووی، ج ۱۶ ص ۱۳۷، ۱۳۸)

یہ حدیث بہت ہی قابل غور ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس پر مطالعہ کرنا چاہئے۔ جن صاحب نے مارا وہ مہاجر تھے اور انصاری کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ بدلے کا مطالبہ کرے مگر بدلے کی خواہش اور اس کا مطالبہ بھائی چارے کے خلاف تھا اور آپ ﷺ اس بات کے کوشاں تھے کہ تعصب اور نسلی امتیاز کا خاتمہ فرمادیں اور جاہلیت کے اثرات مٹا کر اس کی جگہ بھائی چارے کا جذبہ پیدا فرمادیں اس لئے آپ ﷺ بدلہ دلانے کے بجائے انصاری کے اندر بھائی چارے پوشیدہ جذبات کو ابھارتے ہوئے اس کو معافی اور درگذر کرنے کی نصیحت فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں چھوڑو یہ بڑی گندی بات ہے۔

واقعے کو پڑھنے والا ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ اس طرح کے واقعات جو معمولی سمجھے جاتے ہیں۔ حضور ﷺ کو بہت فکر مند بنا دیتے تھے اور آپ اس کے ازالے کے لئے فکر مند ہو جاتے تھے۔ اسی فکر کے نتیجے میں آپ نے ارشاد فرمایا! ''سچا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔'' یہ حدیث صحاح ستہ میں تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ متعدد روایتوں سے بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ صحیح ابن حبان میں ''المهاجر من هجر السيئات والمسلم سلم المسلمون من لسانه ويده، يعنی المهاجر من هجر السيئات'' کے الفاظ کا اضافہ ہے۔ جس کے معنی ہیں مہاجر وہ ہے جس نے برائیوں کو چھوڑ دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس معمولی بات کی نزاکت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خطرات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اور اس کو بار بار دہرانے اور مختلف انداز واسلوب کے ذریعے صحابہ کرامؓ کے دل میں بٹھا دینا چاہتے تھے، چنانچہ نہایت لطیف انداز میں فرمایا: مہاجر تو حقیقتاً وہ ہے جو برائیوں کو چھوڑ دے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو کئی بار اس صورت حال سے سابقہ پڑا اور متعدد بار

آپ ﷺ کو نصیحت کرنا پڑی اور نصیحت کے الفاظ میں اضافہ فرمایا:

چنانچہ سنن نسائی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے کہ جس کی طرف سے لوگ اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں مامون ہوں کوئی خطرہ نہ محسوس کریں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بات بڑھ کر کبھی کبھی طنز و تعریض، مار پیٹ، قتل اور لوٹ مار تک پہنچ جاتی تھی اور لوگ بے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت سے دوچار تھے، چنانچہ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا: اسلام کا کون سا عمل اور طریقہ پسندیدہ ہے۔ گویا سائل یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کس طرح کا طرز زندگی ایک اچھا اور ایک دوسرے سے محبت کرنے والا معاشرہ تیار کرسکتا ہے۔ چنانچہ جواب میں آپ ﷺ نے باہم محبت اور انس پیدا کرنے والی چیزیں بیان فرمائیں آپ ﷺ نے فرمایا:

''دوسروں کو کھانا کھلاؤ، سلام کو عام کرو اور اس کو رواج دو، جس کو پہچانو اس کو بھی سلام کرو اور جس کو نہ پہچانو اس کو بھی سلام کرو۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ دل کے میل اور کھوٹ کو دور کرتی ہیں۔ کہ کھانا کھلانا ہاتھ کی ایذا رسانی سے روکتا ہے اور سلام زبان کی ایذا رسانی سے روکتا ہے۔

(السیرۃ النبویۃ۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۱۴۴/۱۳۲)

اس عملی اور موثر تربیت کے ذریعہ آپ ﷺ ایک ایسا اسلامی معاشرہ قائم فرمانا چاہتے تھے جو باوقار، محترم، منظّم اور علمی ہو۔ اس کی اپنی اقدار ہوں۔ اور وہ انسانی بستی کا گلدستہ ہو۔

باہمی محبت و تعلقات و روابط، کھانا کھلانے اور سلام کو عام کرنے سے زیادہ پختہ و مضبوط ہوتے ہیں۔ حدیث پاک میں مسلم کا لفظ عام ہے مرد اور عورت دونوں ہی اس سے مراد ہیں یعنی کھانا کھلانے اور دعائے سلامتی کا جذبہ و عمل دونوں میں ہونا چاہئے۔ ایک اور دوسری روایت ہے جو اسلامی معاشرے کے دائرے کو وسیع تر کرتی ہے۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ: جس نے ہماری طرح سے نماز پڑھی اور ہمارے قبیلے کی طرف رخ کیا، اور ہمارے ذبح کئے ہوئے جانور کو کھایا وہ مسلمان ہے (شرح صحیح

مسلم،نووی، ج۱۶/۱۳۹)اسی لئے علماء فرماتے ہیں:اہل ذمہ بھی اچھے برتاؤ اور سلوک کے اعتبار سے اس میں شامل ہوں گے۔

یہ حدیث قابل غور ہے،اس کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھ کر سوچا اور غور کیا جائے تو اس سے محبت وتعلق کی مہک محسوس ہوتی ہے۔مارنے والا شخص پردیسی اور مہاراجہ تھا،انصاری کو یہ پورا حق تھا کہ بدلے کا مطالبہ کرے مگر بدلے کا مطالبہ برادرانہ اور محبانہ جذبے کے خلاف تھا۔دوست ومحبوب کی غلطی کو محبت وتعلق کی نظر بھلا دیتی ہے، برداشت کر جاتی ہے اور اس کو پی جاتی ہے، بدلہ لے لیا تو پھر وہ بات کہاں رہ جاتی ہے،اور آپ ﷺ اس فکر اور کوشش میں تھے کہ نسلی اور قبائلی تعصب کو مٹا کر اسکی جگہ مسلمانوں کے دلوں میں محبت بھر دیں۔

چنانچہ آپ ﷺ انصاری کے دل میں موجود برادرانہ محبت کو ابھارتے ہوئے معاف ودرگذر کرنے کی تلقین فرماتے ہیں۔فرمایا: چھوڑو یہ گندی بات ہے۔حدیث پر غور کرنے والے اور اس کے اثرات کی تہہ میں جانے والے کو محسوس ہوگا کہ آپ ﷺ یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات کے سلسلے میں بڑی فکر فرماتے تھے اور یہ کوشش ہوتی تھی،اس طرح کی چیزیں مسلم معاشرے میں نہ داخل ہونے پائیں کہ یہی بڑے فتنے اور انتشار کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں۔(جیسا کہ آج ہم اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ اور اس کی آگ میں جل رہے ہیں) لھذا آپ بہت فکر واہتمام کے ساتھ اس کو ختم کرنے کی کوشش فرماتے تھے اور بہتر سے بہتر طریقے پر حل فرمانے کا طریقے اپناتے تھے،اسی لئے مذکور بالا حدیث جس پر یہ بحث چل رہی ہے تھوڑے سے فرق کے ساتھ صحاح ستہ اور دیگر کتب کی بہت سی روایتوں میں بیان ہوئی ہے کہ یہ بات مسلمانوں کے دلوں میں رچ بس جائے۔اور زبان یا ہاتھ کسی طرح بھی مسلمان اپنے بھائی کا دل نہ دکھائے،صحیح ابن حبان میں حدیث اس طرح آئی ہے۔"المهاجر من هجر السيئات والمسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده." یعنی صحیح معنوں میں مہاجر وہ ہے جو برائیوں اور گناہوں کو چھوڑ دے اور کامل مومن وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا سے مسلمان محفوظ رہیں۔گویا آپ ﷺ نے یہ محسوس فرمالیا کہ مہاجر اس غلطی کا ارتکاب دوبارہ بھی کرسکتا ہے۔ لہذا فرمایا بھائی مہاجر تو وہ ہے جو برائیوں کو چھوڑ دے، یہ فرما کر گویا اس کو تاکید فرمادی کہ

دیکھو آئندہ ایسا نہ کرنا یہ نہایت نامناسب بات ہے کہ مسلمان کو تکلیف پہونچائے۔

روایتوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعات متعدد بار پیش آئے ہیں اور آپ کو اس معاشرتی مشکل کو حل کرنا پڑا ہے۔

وقت کی نزاکت کی مناسبت سے روایتوں کے الفاظ میں کمی زیادتی فرمائی ہے۔ چنانچہ سنن نسائی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه والمومن من امنه الناس دمائهم واموالهم. اس حدیث میں سچا مومن وہ ہے، جس سے لوگوں کو اپنے جان و مال کا خطرہ نہ ہو، کا اضافہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بات طنز و تعریض اور معمولی ایذارسانی سے بڑھ کر کبھی کبھی لوٹ مار اور قتل تک پہنچ جاتی تھی اور معاشرے میں بے چینی اور نفسیاتی فکر و تشویش پیدا ہوگئی تھی۔

صحابہ کرامؓ نے سوال کیا: اللہ کے رسول ﷺ ''أي الاسلام خير'' اسلام کی سب سے بہتر حالت کیا ہے شاید سائل یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ایک محبت بھرا اور باہم میل محبت اور ایک دوسرے کی فکر رکھنے والا معاشرہ کس طرح وجود میں آسکتا ہے۔ جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''تطعم الطعام وتقرأ السلام على من عرفت ومن لم تعرف'' کھانا کھلاؤ (باہم میل محبت میں ایک دوسرے کی دعوت کرو) (جو مسلمان بھی ملے) اس کو سلام کرو چاہے اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہنچانتے ہو۔ یہ وہ شرعی ذرائع اور صفات وعادات ہیں جو دل کے اندر سے حسد و بغض، بدخواہی اور دھوکہ دہی کے میل کو نکال کر اپنے بھائی کے لئے دل کو جذبات خیر سے بھر دیتے ہیں ان کی خوشی سے خوشی اور ان کے غم سے غم محسوس کرتے ہیں۔ جو بھائی اپنے بھائی کو کھانا کھلائے گا بھلا وہ اس پر ہاتھ کیسے اٹھائے گا اور جو سلامتی کی دعا دے گا وہ اپنی اسی زبان سے اپنے اسی بھائی کو برا بھلا کیسے کہے گا۔ طعنہ زنی کے لئے زبان کیونکر کھولے گا۔

آپ ﷺ ان حکیمانہ، عملی اور موثر تعلیمات کے ذریعے ایک ایسا اسلامی معاشرہ قائم فرمانا چاہتے ہیں جس کی فضا میں ایک دوسرے کا ادب واحترام سمایا ہوا ہو۔ معاشرے کا نظام، طور طریقہ اور رہن سہن ایک امتیازی شان رکھتا ہو۔ اسلامی معاشرہ ایک ایسی دنیا ہو جس میں ایک دوسرے کے بارے میں نرالے جذبات واحساسات ہوں۔ دوسروں سے ملنے جلنے کے

ایسی پرخلوص ومحبت سے لبریز اور چھلکتی ہوئی ادائیں ہوں کہ پورے ماحول پرسکون وسکینہ کی چادر تنی ہوئی ہو، ایک دوسرے کی دعوت کرنے، کھانے کھلانے اور سلام ودعا سے یہ تعلقات برابر بڑھتے ہی جائیں گے۔ اوران میں مضبوطی وپختگی بڑھ کر عادت ثانیہ بن جائے گی اس طریقے کو مدینہ منورہ کے پاکیزہ ماحول میں برتا اور دیکھا جاچکا ہے، تاریخ میں اس کی شہادت موجود ہے۔

آپ ﷺ نے من سلم المسلمون کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ ''مسلمات'' یعنی مسلمان عورتوں کا ذکر نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں اس میں شامل نہیں بلکہ چونکہ مرد کو اولیت حاصل ہے تربیت وتعلیم اسی کے ذمے ہے، معاشرے پر وہی مؤثر ہوتا ہے اس لئے اکثر مومن ومسلم مذکر ہی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مراد دونوں ہی ہوتے ہیں، عورت چونکہ مرد کے تابع بنائی گئی ہے، اس لئے مرد کے ذکر کے بعد وہ بھی اس میں شامل ہوجاتی ہے۔ کہیں کہیں عورت کی فضیلت کو بیان کرنے کے لئے علاحدہ ذکر کردیا جاتا ہے، اس لئے عورت بھی اس میں شامل ہے۔

ایک اور روایت بھی ہے جو اسلامی معاشرے کے دائرے کو مزید وسیع کرتی ہے۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

من صلی صلاتنا واستقبل قبلتنا وأکل ذبیحتنا فذالك المسلم

''جس نے ہماری نماز پڑھ لی اور ہمارا ذبیحہ کھالیا اس کا شمار مسلمانوں میں ہے۔

اس لئے علماء کہتے ہیں کہ حسن سلوک اور معاملات میں اہل ذمہ بھی مسلمانوں ہی کے حکم میں ہوں گے۔ ان کو بھی حق اور انصاف کا پورا حق حاصل ہوگا۔''

ان ہدایات وتعلیمات کے ذریعے آپ ﷺ ایسا عظیم الشان معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے، جس میں ہر فرد بشر سکون اور چین اور پیار اور محبت کی فضا میں بے خوف وخطر زندگی گزار رہا ہو۔ گھر میں ہو تو، سفر میں ہو تو، ہر حال میں اس کی عزت وناموس اور جان ومال محفوظ ہو، نہ کسی سے کوئی بدگمانی ہو اور نہ کسی کی عیب جوئی اور ٹوہ میں لگا جائے، اور نہ ہی کسی کی عزت وشرف اور آزادی میں کوئی ادنیٰ خلل پڑنے پائے، وہ ایسا مثالی معاشرہ ہو، جس میں انسانوں کے باہم اتحاد اور میل ملاپ کا اونچے سے اونچا نمونہ پایا جاتا ہو، خواہ ان کے قبائل اور قومیں مختلف ہی کیوں نہ ہوں، اس معاشرے کا بس ایک ہی معیار وپیمانہ ہو اور سب اسی کو مانتے اور تسلیم کرتے ہوں، وہ

پیمانہ اس خالق کا بنایا ہوا ضابطہ حیات ہو، جو اپنے بندوں کے مزاج، ضروریات، خصوصیات اور الگ الگ صلاحیتوں اور صفات سے خوب واقف ہے۔ اس لئے معاشرے میں ہوائے نفسانی کا گزر نہ ہو، اس معاشرے کا معیار و پیمانہ اخوت، بھائی چارہ اور اپنے پر دوسرے بھائی کو مقدم رکھنا ہے۔ جہاں کی فضا ایسی ہو کہ ایک بھائی اپنے بھائی کے یہاں ہدیے کا پیالہ بھیجے تو وہ محلّہ بھر میں گھومتے ہوئے پھر اسی کے پاس آجائے۔

اس اعتبار سے یہ حدیث پاک شریفانہ کریمانہ اور پاکیزہ کردار معاشرے کے نقوش قائم کرتی ہے، اور ایمان کے وہ سنگ میل قائم کرتی ہے، جس کی بنیاد پر ایسے معاشرے کے قیام کی دعوت دی گئی ہے۔ اس مثالی ماحول میں بندۂ مومن پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ عملی اور تعمیری زندگی گزارے، بھائی چارہ اور مل کر رہنے کا شعار اپنائے اور اس کی انجام دہی میں مشقت و ناگواری سے سابقہ پڑے تو پیشانی پر شکن لائے بغیر اس کو برداشت کرے، جس بات کا مقابلہ نہ کرسکتا ہو اس سے چشم پوشی سے کام لے اور اس کی عادت ڈالے کہ کوئی چبھتا ہوا اور چڑانے والا لفظ زبان سے نہ نکالے، اپنی زبان سے کوئی دل دکھانے والا لفظ نہ نکالے، کہ مسلمان ذکی الحس ہوتا ہے، اس لئے کہ نیزہ کا زخم تو پر ہو جاتا ہے لیکن زبان کا زخم باقی رہتا ہے جس کو عرب شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

جراحات السنان لها الالتئام
ولا یلتأم ماجرح اللسان

جب اسلامی معاشرہ اس طرح کا اتحاد و محبت، برادرانہ برتاؤ اور بھائی چارے کا جیتا جاگتا معاشرہ ہوگا تو امت مسلمہ اعداء اسلام کی سرکشی اور دراز دستی کو کچلنے کی اہل ثابت ہوگی، اس معاشرے میں سوچ سمجھ کر موقع و محل کو دیکھ کر ہوشیاری اور چالاکی سے اقدام کرنے کی سوجھ بوجھ ہوگی، وہ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نہ اٹھائے گا۔ اور آپس میں محبت و خوش خلقی، ایک دوسرے کی مدد و تعاون، ہمدردی و بہی خواہی کے جذبات سے دل لبریز ہوں گے جس کی تصویر کشی قرآن کریم نے ان الفاظ میں کی ہے: اشداء علی الکفار رحماء بینهم کبھی کبھار اگر باہم اختلاف ولڑائی کی نوبت آجائے تو فوراً کتاب وسنت کی طرف رجوع کر کے معاملہ کو جلد ختم کر دیا جائے، آپ کے ارشاد کا پکا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ

رہیں اور سچا مہاجر وہ ہے جو ان تمام باتوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ صحیح معنی میں اسلام اسی وقت کامل ہوسکتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اور مسلمان دونوں کے حقوق ادا کئے جائیں کہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو خود کے لئے پسند کرتا ہے۔ ان کو اپنی زبان اور ہاتھ کسی بھی ذریعے سے تکلیف نہ پہنچائے۔

(۲) حدیث بتاتی ہے کہ حقیقی مسلمان تو وہی ہے جس کے دل میں ایمان رچ بس گیا ہو، ایسا کہ مسلمانوں کی ضروریات ومفاد کا پورا خیال رکھے، ان کی امانتوں کی حفاظت کرے اور قتل وخونریزی سے تو کوسوں دور رہے۔

(۳) حدیث نے یہ بھی تعلیم دی کہ مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے والی ہر بات سے پرہیز کرے خواہ زبان سے ہو یا قلم ونیزہ سے ہو۔ جس بات سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچے اس سے مسلمان کو بچنا چاہئے۔

(۴) حدیث نے واضح کردیا کہ ایمان بندۂ مومن کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے جان ومال اور عزت وآبرو کو اپنی زیادتیوں سے محفوظ رکھے۔

(۵) مسلمانوں کو تکلیف پہنچانا تو اتنی سخت بات ہے کہ فرمایا گیا کہ جس سے لوگ مأمون نہ ہوں گویا وہ ایمان سے عاری ہے۔

(۶) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہجرت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اپنے دین وایمان کی حفاظت کی غرض سے آدمی اپنا گھر بار اور وطن چھوڑ دے، یہ تو خصوصی ہجرت ہے۔ جس کی فضیلت میں بہت کچھ بیان ہوا ہے۔ دوسری قسم کی ہجرت جو عام ہے یہ ہے کہ عام آدمی اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دے۔

حدیث کا فقہی پہلو

حدیث سے ثابت ہوا کہ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کا جان ومال، عزت وآبرو حرام ہے،

اس پر زیادتی ظلم عظیم ہے۔ الا یہ کہ شریعت نے اللہ اور اللہ کے رسول نے حلال کیا ہو، حجۃ الوداع کے موقع پر جب آپ ﷺ نے خطبہ دیا تو فرمایا:

آج تمھاری جان و مال اور عزت تم پر اسی طرح حرام ہے۔ جس طرح آج کے دن اور اس شہر اور اس مہینہ میں حرام ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے ہماری طرح نماز پڑھی ہمارے قبلے ک قبلہ بنایا ہمارے ذبح کئے ہوئے جانور کو کھایا وہ مسلمان ہے اس کے بارے میں اللہ اور اللہ کے رسول کے حقوق ہیں۔

فرمایا: اگر دو مسلمانوں میں جھگڑا ہو جائے اور دونوں اپنی اپنی تلواریں لے کر مقابلہ میں آ جائیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے، لوگوں نے سوال کیا، اللہ کے رسول قاتل کا تو جہنم میں جانا سمجھ میں آتا ہے، مقتول کیوں جہنم میں جائے گا؟ آپ نے فرمایا وہ بھی تو اپنے مدمقابل کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ” میرے بعد تم کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارو۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ: م۳/۲۸۳)

حدیث - ۸

رزق کے معاملے میں اللہ پر توکل

عن عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: لو انکم کنتم تتوکلون علی اللّٰہ حق توکله لرزقتم کما یرزق الطیر تغدو خماصاً وتروح بطاناً۔

(ترمذی کتاب الزہد/۳۳۔تحفۃ الاحوذی، ج ۷/۸)

''حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ارشاد فرماتے تھے کہ ''اگر تم لوگ اللہ پر ایسا توکل کرو اور اعتماد کرو جیسا کہ اس پر توکل کرنے کا حق ہے، تو تم کو وہ اس طرح روزی دے گا جس طرح کہ پرندوں کو دیتا ہے کہ وہ صبح کو بھوکے اپنے آشیانوں سے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس آتے ہیں۔''

مفہوم

توکل کے سلسلہ میں یہ حدیث بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور حصول رزق کا یہ سب سے بڑا وسیلہ وذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے:

وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ۙ وَّيَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُ ؕ وَمَنۡ يَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسۡبُهٗ ؕ (الطلاق: ۲،۳)

''اور جو کوئی خدا سے ڈرے گا وہ اس کے لئے (رنج ومحن سے) مخلصی (کی صورت) پیدا کردے گا اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے وہم وگمان بھی نہ ہو اور جو خدا پر بھروسا رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا۔''

حضور ﷺ نے حضرت ابوذرؓ کو یہ آیت پڑھ کر سنائی اور پھر ان سے فرمایا ''تمام کے تمام لوگ اس آیت کریمہ کو اپنا شعار بنالیں۔ اگر اپنے اندر پورے طور پر تقویٰ اور توکل پیدا کرلیں تو یہ ان کے دینی و دنیوی سبھی قسم کے معاملات وضرورتوں کے لئے کافی ہوجائے گا۔

توکل کی اصل حقیقت یہ ہے کہ آدمی دل سے یہ یقین رکھے کہ دنیا یا آخرت کا کوئی فائدہ یا نقصان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہیں حاصل ہوسکتا، اس کے دل میں یہ عقیدہ اور بھروسا گھر کر جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہ کچھ دے سکتا ہے اور نہ اللہ کی طرف سے ملنے والی کسی نعمت وفائدہ کو روک سکتا ہے، اور کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع۔ حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کامل اور بھروسا تو ایمان کی جڑ ہے، ایسے ہی وہب بن منبہ نے فرمایا: ''مقصد اصلی تو اللہ کی ذات پر بھروسا ہی ہے (کہ اس کے بغیر ایک ذرہ نہیں حرکت کرسکتا)۔'' حضرت حسنؒ نے فرمایا بندے کے اللہ پر بھروسا کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی وہ ذات ہے جس کا وہ سہارا لے اور اس پر اعتماد کرے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، جس کو اس بات کی چاہت اور خوشی ہو کہ وہ لوگوں میں سب سے قوی ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسا رکھے۔'' آپ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے کہ ''اے اللہ میں تیری ذات عالی سے اس بات کا طالب ہوں کہ تو مجھ کو اپنی ذات سے بھروسا کی نعمت عطا فرما۔'' آپ یہ بھی دعا فرماتے تھے کہ ''اے اللہ تو مجھے ان لوگوں میں سے بنادے جنھوں نے تجھ پر بھروسا کیا اور تو ان کا ہر طرح سے نگہبان ہوگیا۔'' (جامع العلوم والحکم، ابن رجب حنبلی، ص ۲۲۸)

یہ بتانا مناسب وضروری معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پر توکل وبھروسا، اسباب وذرائع کو اپنانے کے منافی نہیں ہے کہ اپنے قویٰ اور اعضاء کے ذریعے حصول اسباب کی فکر وکوشش کرنا اطاعت خداوندی ہے اور دل سے یقین اور بھروسا کرنا یہ اللہ پر ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے، ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَکُمْ'' (النساء:۷۱) مومنو! (جہاد کیلئے) ہتھیار لے لیا کرو۔

دوسری آیت میں فرمایا :

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ۔
(الانفال:۶۰)

''اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لئے مستعد رہو۔''

دوسری جگہ فرمایا:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ (الجمعہ:۱۰)

''پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور خدا کا فضل تلاش کرو۔''

دین اسلام میں اسباب و وسائل کا اپنانا بجائے خود بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس پر پورا زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد میں اسی بات کی تعلیم دی کہ جب مسلمانوں نے اسباب ظاہری کی طرف سے کوتاہی برتی اور اپنے قائد کے مشورے پر عمل کرنے میں غلطی کا شکار ہوئے تو مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ظاہری اسباب اپنانا ضروری ہے کہ یہ کامیابی کیلئے لازمی اور قطعی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

اَوَلَمَّا اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ۔ (آل عمران:۱۶۵)

''(بھلا یہ) کیا (بات ہے کہ) جب (احد کے دن کفار کے ہاتھ سے) تم پر مصیبت واقع ہوئی حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دو چند مصیبت تمہارے ہاتھ سے ان پر پڑ چکی ہے تو تم چلا اٹھے کہ (ہائے) آفت (ہم پر) کہاں سے آ پڑی، کہہ دو کہ یہ تمہاری ہی شامت اعمال ہے (کہ تم نے پیغمبر ﷺ کے حکم کے خلاف کیا۔)''

امت مسلمہ نے اسباب اختیار کرنے کی اہمیت کو صرف الفاظ و زبان یا ملامت کرنے کی وجہ سے نہیں سیکھا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تکلیفیں اٹھا کر، اور اپنا خون بہا کر اور غلبہ و فتحیابی کے بعد شکست کی قیمت ادا کر کے سیکھا ہے، مال غنیمت جمع کرنے کے بعد نقصان اٹھا کر اس کا سبق یاد کیا

ہے اور بہت سے شہیدوں کی لاشیں گر جانے کے بعد جن میں سید الشہداء عمِ رسول ﷺ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ اسباب ووسائل اپنانے کا سبق پڑھا ہے۔

(السیرۃ النبویۃ: ابوالحسن علی ندوی)

حضرت سہل تستری فرماتے ہیں، جس نے کسب معاش اور حوائج زندگی کے حصول کی فکروکوشش پر ملامت اور طعن کیا اس نے اسوۂ رسول اللہ ﷺ اور جس نے خدا پر توکل اور بھروسا پر ملامت وطعن کیا اس نے ایمان پر طعن وملامت کیا۔ توکل حضور اکرم ﷺ کا حال تھا اور کسب معاش اور ضروریات زندگی کے حصول کی فکروکوشش یہ آپ ﷺ کی سنت تھی۔ جو شخص آپ کے حال پر عمل کرے وہ آپ کی سنت مبارکہ کو نہ چھوڑے۔ (کہ اس کے خلاف عمل کرنے کا نام غلو اور بے اعتدالی ہے اور یہ بات ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو دین کی روح کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں، بقول مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی رحمۃ اللہ علیہ :

اب نہ افراط باقی نہ تفریط ہے
عشق کامل ہوا معتدل ہوگیا

حدیث مذکور کہ" اگر تم اللہ تعالیٰ پر کما حقہ توکل کرو تو تم کو اس طرح رزق ملے جس طرح پرندوں کو ملتا ہے" یہ بتاتی ہے کہ لوگوں کو روزی ان کے خدا پر توکل اور بھروسا، کمزور ہونے اور اسباب کو اپنانے اور اس پر یقین رکھنے کی وجہ سے بڑی محنت ومشقت سے حاصل ہوتی ہے اور اس کے لئے انتھک کوشش کرنی پڑتی ہے، تاہم ملتا اتنا ہی ہے جتنا مقدر میں ہے۔ لیکن اگر وہ دل سے اللہ تعالیٰ پر بھروسا کریں تو معمولی اسباب اختیار کرنے پر بھی اس طرح ان کو رزق حاصل ہو جائے، جس طرح صبح وشام آنے والے پرندوں کو حاصل ہو جاتا ہے۔ گویہ صبح وشام کا آنا جانا بھی کوشش واسباب میں شامل ہے لیکن یہ کوشش آسان ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا! کسی کی موت اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک کہ وہ اپنے حصے کا رزق پورا نہ کرلے، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کے حکموں کا پاس ولحاظ رکھو اور حصول رزق کا اچھا اور بہتر طریقہ اپناؤ، حلال کو حاصل کرو، حرام سے دور رہو"۔

بعض اسلاف نے فرمایا: تم خدا پر بھروسا رکھو، روزی تو دوڑ کر تمہارے پاس آئے گی۔ سالم بن ابو جود نے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمایا کرتے تھے۔ ''تم اللہ کے لئے کام کرو، اپنے پیٹ کی خاطر نہ کرو، ضرورت سے زیادہ جمع کرنے سے بہت دور رہو کہ اس کا زیادہ جمع کرنا عذاب ہے۔ ان اڑنے والے پرندوں کو دیکھو جو صبح وشام آتے جاتے ہیں لیکن کچھ لے کر نہیں آتے۔ بس چگ لیا پیٹ بھر گیا، شام کو اپنے آشیانوں کو واپس آگئے۔ اور کل پھر نکلیں گے۔ کچھ جمع نہیں کرتے ان کی کوئی کھیتی باڑی نہیں ہے۔ اب اگر تم یہ کہو کہ ہمارے پیٹ پرندوں کے پیٹ سے بڑے ہیں تو جانوروں کو دیکھو، گائے، بیل، اور گدھے، صبح چراگاہوں کو جاتے ہیں اور واپس ہوتے ہیں تو کل کے لئے کچھ لے کر نہیں آتے، ان کی کوئی کھیتی نہ باڑی مگر اللہ تعالیٰ ان کو روزی عطا کرتا ہے۔

(جامع العلوم والحکم: ص ۵۳۰، ۵۳۱ (ملخص)

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا ارشاد پاک حقیقت توکل کو بیان کرنے میں کتنا جامع اور مبنی بر حقیقت ہے آپ کے ارشاد کہ ''اگر تم کما حقہ اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرو'' کا مطلب یہ ہے کہ دل سے پورا یقین رکھو کہ جو کچھ ہوگا اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ہوگا۔ اس کے سوا کوئی کچھ نہیں دے سکتا ہے، اور جب وہ دینا چاہے تو کوئی روک بھی نہیں سکتا۔ اس یقین واعتماد کے بعد اسباب اپنانے کا نمبر آتا ہے اس لیے کہ شریعت نے اس کا حکم دیا ہے۔ اس لئے نہیں کہ نتائج کا انحصار اسباب پر ہے۔

اسباب کا اختیار کرنا عبادت ہے اور انجام کا سامنے آنا یہ اللہ کے فیصلے اور تقدیر پر منحصر ہے۔ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد بندۂ مومن اسباب ووسائل کی غلامی اور اس سے دل اٹکانے اور اسی پر بھروسا کرنے سے آزاد ہو جاتا ہے، کہ جتنا کرنے کا ہم کو حکم تھا، اتنا ہم نے کیا آگے اللہ تعالیٰ کی مرضی۔ جب بندے کی یہ کیفیت ہوتی ہے، تب اس کو پرندوں کی طرح بے سان وگمان طریقے پر رزق حاصل ہوتا ہے۔ بندۂ مومن اس کو خوب جانتا ہے کہ توکل کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ زمین کو خالی چھوڑ دے۔ اس پر کھیتی یا باغبانی نہ کرے۔ اسی طرح دوسرے دیگر وسائل کو بھی نہ اپنائے بلکہ دین اسلام نے بندۂ مومن کو تو مردہ وبنجر زمینوں کو آباد اور کارآمد

بنانے کا مکلّف بنایا ہے۔ توکل کا مطلب یہ ہے کہ اپنے دل کو ان چیزوں میں نہ لگائے۔ بقول حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ: دنیا ہاتھ میں رکھنا جائز، جیب میں رکھنا جائز لیکن دل میں رکھنا ناجائز ہے مقصود یہ ہے کہ زمین میں لگ کر اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہو جائے۔ بلکہ محنت زمین پر کرے اور نظر آسمان کی طرف رکھے۔ وہ اسباب کو تو اختیار کرے لیکن یہ نہ سمجھے کہ یہ اسباب ہی روزی فراہم کردیں گے۔ بلکہ ان کا رزق آسمان سے مقدر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ فَوَ رَبِّ السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ أَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ (الذاریات:۲۲،۲۳)

''اور تمہارا رزق اور جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے، تو آسمانوں اور زمین کے مالک کی قسم یہ (اسی طرح) قابل یقین ہے جس طرح تم بات کرتے ہو۔''

حقیقی مسلمان وہی ہے جو توکل کی اس حقیقت کو سمجھتا ہے، جو اس کے ایمان اور عقیدے کا جزو ہے۔ اس لئے سبھی جائز اسباب کا اپنانا ضروری ہے تاکہ یہ مقصد پورا ہو۔

مسلمان کے نزدیک توکل کا لب لباب یہ نکلا کہ دل کے سکون و اطمینان کے ساتھ کام میں لگا رہے اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دے اور یقین کامل رکھے کہ جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا، اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اچھا عمل کرنیوالے کے اجر کو ضائع نہیں فرماتا۔ لہٰذا مسلمان اپنے رزق کے معاملے میں مطمئن ہو کر زندگی گزارتا ہے اس لیے کہ روزی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو وعدہ خلافی نہیں کرتا اور نہ اپنے بندے کو ضائع کرتا ہے۔ اس نے زمین کو گہوارہ اور فرش بنایا ہے اس کو پھیلایا ہے۔ اس میں برکت رکھی ہے اور اسی میں اس کی ضروریات مقدر فرما رکھی ہیں۔ اس کے ذرائع معاش بھی اسی میں رکھے ہیں۔ اور بندوں سے روزی پوری کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس کی ذمہ داری لی ہے بار بار اس کا یقین دلایا ہے، تاکید فرمائی ہے اور اس کی قسم کھائی ہے۔ فرمایا:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (ھود:۶)

''اور زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق خدا کے ذمہ ہے۔''

دوسری آیت میں فرمایا:

وَكَأَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَ إِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ (العنکبوت:۶۰)

''اور بہت سے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے خدا ہی ان کو بھی رزق دیتا ہے اور تم کو بھی، اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

ان خدائی وعدوں پر بندۂ مؤمن اپنے رزق کے معاملے میں امن واطمینان سے زندگی گزارتا ہے، اسے یقین رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھوکا نہ مارے گا۔ اللہ تعالیٰ تو پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں اور درندوں کو جنگلوں میں رزق عطا کرتا ہے۔ سمندر کی تہہ میں مچھلیوں کو غذا فراہم کرتا ہے۔ کیڑوں مکوڑوں کو پہاڑوں کی چٹانوں کے اندر کھلاتا ہے۔

مناوی نے حدیث توکل کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ صبح پرندے بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ واپس آتے ہیں، دوڑ دھوپ سے رزق نہیں ملتا۔ رزق تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ توکل کا مطلب ہاتھ باندھ کر بیکار بیٹھ رہنا نہیں ہے، بلکہ حدیث پاک کے اندر لام کا لفظ کوئی وسیلہ اپنانے کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ اس لئے کہ پرندہ کو کوشش کے بعد صبح کو نکلنے اور اِدھر اُدھر اڑنے ہی سے رزق میسّر آتا ہے۔ اس لئے امام احمدؒ نے فرمایا: حدیث کے اندر ایسے الفاظ یا معانی نہیں ہیں جو روزی کے لئے کوشش کے ترک کا مفہوم رکھتے ہوں بلکہ اس میں تو طلب رزق کی فکر کے معنی پائے جاتے ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی: ج ۷)

آپ ﷺ نے امت کو توکل کی تعلیم و تربیت اس کے وسیع معنی میں دی ہے۔ اسی لئے چڑیوں کی انوکھی مثال بیان کی ہے کہ وہ صبح جلد بیدار ہو کر خدا کی تسبیح بیان کرتی ہیں بولتی اور چہچہاتی ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ۔ (بنی اسرائیل:۴۴)

''اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔''

اس پاک و پسندیدہ عبادت کے بعد پرندے اپنے گھونسلوں سے نکل کر تلاش رزق میں کھیتوں، باغوں اوران جگہوں کی طرف اڑ نکلتے ہیں، جہاں کہیں بھی ان کو دانہ اور سامان رزق میسر آتا ہے، وہ اس کی تلاش میں دن بھر سرگرم عمل رہتے ہیں اور جب سورج ڈوبنے لگتا ہے تو اپنے گھونسلوں کی طرف پرے بنا کر ایک لائن سے اڑتے ہوئے واپس آجاتے ہیں، اس طرح کہ ان کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے، یہ گویا اس قرآنی آیت کی عملی تفسیر ہوتی ہے۔

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاساً وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشاً (النبا:۱۰،۱۱)

''اور رات کو پردہ مقرر کیا اور دن کو معاش (کا وقت) قرار دیا۔''

پرندے کی زندگی اس اعتبار سے توکل کے ساتھ اسباب کو اپنانے میں نشاط وحرکت پر عمل پیرا رہنے کی ایک عملی مثال اور شان امتیاز رکھتی ہے۔

بندۂ مومن بھی اسی طرح سے جب اسباب کو اختیار کرتا ہے اور اس پر عبادت کا جو بار امانت رکھا گیا ہے، حقوق وواجبات کی جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے اس کو ادا کرتے ہوئے خدا پر بھروسا رکھتا ہے اور دل میں اس کے وعدہ کا یقین جمائے رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو پرندوں کی طرح روزی دیتا ہے، اور من حیث لا یحتسب ہر ضرورت اپنے اپنے وقت پر پوری ہوتی رہتی ہے۔

ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ یہ توکل ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ '' (الفاتحہ:۴) (اے پروردگار ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔) کے درجوں میں سے عبادت کا ایک درجہ ہے۔ ''وَعَلَى اللهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ '' (المائدہ:۲۳) (اور خدا ہی پر بھروسہ رکھو بشرطیکہ صاحب ایمان ہو۔ دوسری آیت میں فرمایا: ''رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ '' (الممتحنہ:۴) (اے ہمارے پروردگار تجھ ہی پر ہمارا بھروسا ہے اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور تیرے ہی حضور میں (ہمیں) لوٹ جانا ہے''۔

ایک اور آیت میں فرمایا:

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ

(آل عمران:۱۵۹)

''اور جب (کسی کام کا) عزم مصمم کرلوتو خدا پر بھروسا رکھو۔ بے شک خدا بھروسا رکھنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کے توکل کے بارے میں فرماتا ہے:

''وَمَا لَنَآ أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا''

(ابراھیم:۱۲)

''ہم کیوں کر خدا پر بھروسا نہ رکھیں حالانکہ اس نے ہم کو ہمارے (دین کے سیدھے) رستے بتائے ہیں۔''

اپنے محبوب نبی محمد ﷺ کے صحابہؓ کے بارے میں فرمایا:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَاناً وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (آل عمران:۱۷۳)

''(جب) ان سے لوگوں نے آکر بیان کیا کہ کفار نے تمھارے (مقابلے کے) لئے (لشکر کثیر) جمع کیا ہے تو ان سے ڈرو۔ تو ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور کہنے لگے ہم کو خدا کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔''

دوسری آیت میں فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَاناً وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔ (الانفال:۲)

''مومن تو وہ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔ اور جب انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔ اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے ہیں۔''

صحیحین کی اس حدیث میں جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ستر ہزار ایسے لوگ ہوں گے جو

بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے۔

هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَسْتَرِقُوْنَ وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ وَلَا يَكْتَوُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔

''وہ، وہ بندگان خدا ہوں گے جو منتر نہیں کراتے اور شگونِ بد نہیں لیتے اور نہ داغتے ہیں اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں۔''

صحیحین ہی کی ایک روایت میں ہے، آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَكَ أَسْلَمْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْكَ أُنِبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ۔

اے اللہ میں نے تیری اطاعت کے لئے سر جھکایا اور میں تجھ پر ایمان لایا۔ اور میں نے تجھ پر بھروسا کیا۔ اور میں تیری طرف رجوع ہوا۔ اور تیری قوت سے میں نے (دشمنوں سے) جھگڑا کیا۔

سنن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اپنے گھر سے نکلتے وقت یہ الفاظ کہے ''**بسم الله توكّلت على الله ولا حول ولا قوّة إلا بالله يقال له هديت ووقيت وكفيت**'' (میں اللہ کا نام لے کر نکل رہا ہوں، اللہ ہی پر میرا بھروسا ہے، کسی خیر کے حاصل کرنے یا کسی شر سے بچنے میں کامیابی اللہ ہی کے حکم سے ہو سکتی ہے) تو عالم غیب میں اس آدمی سے کہا جاتا ہے (یعنی فرشتے کہتے ہیں) اللہ کے بندے تیرا یہ عرض کرنا تیرے لئے کافی ہے، تجھے پوری رہنمائی مل گئی اور تیری حفاظت کا فیصلہ ہو گیا''۔

توکل نصف دین ہے دوسرا نصف دعا و اِنابت (یعنی اللہ تعالیٰ سے مانگنا اور رونا و گڑگڑانا) دین اللہ سے مدد طلب کرنے اور عبادت کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسا و توکل مدد طلب کرنے ہی کے مترادف ہے اور اِنابت و توجہ اِلی اللہ تو عبادت ہے ہی۔ اولیاء اللہ بالخصوص ایمان باللہ، اس کے دین کی مدد اور اعلاء کلمۃ اللہ اور جہاد میں اس کے حکموں کو نافذ کرنے میں، غرض ہر چیز میں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسا کرتے ہیں یعنی ان کی نظر اسباب سے زیادہ نصرت

خداوندی اور غیبی مدد پر ہوتی ہے۔

توکل کی بہترین صورت واجبات وحقوق کی ادائیگی کی فکر ہے۔ یعنی حقوق اللہ، حقوق العباد، خود اپنے نفس وذات کے حقوق۔

کسی دینی یا دین سے کسی خرابی کو دور کرنے کے سلسلے میں ظاہری وخارجی طور پر اپنا اثر دکھانے کے اعتبار سے سب سے زیادہ وسیع اور نفع بخش توکل انبیاء کرام کا توکل ہوتا ہے جس کو وہ دین کو قائم کرنے، زمین سے فسادیوں کے فساد کو دور کرنے کے سلسلے میں ذات باری پر اعتماد و بھروسہ کر کے انجام دیتے ہیں۔ یہ اعلیٰ درجہ کا توکل انھیں حضرات کی شان ہے، انبیاء کرام اور رسولوں کے بعد مومن بندوں کا توکل ان کی ہمت و مقاصد عمل کے اعتبار سے ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ کوئی حصول ملک کے لئے توکل سے کام لیتا ہے، کوئی حصول رزق میں توکل اپناتا ہے۔

توکل کے معنیٰ اور اس کے درجات

امام احمدؒ فرماتے ہیں توکل قلب کی کیفیت عمل سے تعلق رکھتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ احساس وشعور قلب سے تعلق رکھتا ہے، اس کا زبان سے تعلق نہیں کہ زبان سے توکل کا لفظ ادا کر دیا جائے، نہ اس کا تعلق اعضاء انسانی ہی سے ہے اور نہ یہ علم وادراک سے تعلق رکھتا ہے۔

بعض حضرات توکل کا تعلق حصول معرفت رب سے جوڑتے ہیں کہ دل کا یہ جان لینا کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی کفایت کرے گا یعنی ہر طرح سے بندہ اس کی نگہبانی میں ہوگا۔

یحیٰ بن معاذ سے پوچھا گیا کہ کوئی شخص (متوکل اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسا رکھنے والا) کب ہوسکتا ہے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا: جب بندہ اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا کارساز سمجھ لے اور اسی پر یقین رکھے۔ بعض توکل کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد واطمینان اور اسی پر سکون قلب کا ہونا یہ توکل ہے۔

ابن عطا فرماتے ہیں کہ جب شدید فاقے کی حالت میں بھی دل کا سکون برقرار رہے اور اسباب اختیار کرنے میں گھبراہٹ سے کام نہ لو تو یہی توکل کہلائے گا۔

ابن قیمؒ کی رائے

ابن قیمؒ توکل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ توکل کئی باتوں سے ملی

جلی کیفیت ہے۔ان باتوں کے بغیر حقیقتِ توکل نہیں حاصل ہوسکتی، اور سبھی بزرگوں نے ان میں سے ایک دوسرے سے زائد باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پہلی چیز اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی صفات کی معرفت، یعنی اس کا قادر مطلق ہونا، ہر چیز میں اس کا خود کفیل ہونا، کسی کا کسی حال میں محتاج نہ ہونا، پورے نظام عالم کو ٹھیک ٹھیک چلانے کی قدرت یعنی قیوم ہونا، ساری باتوں کا اس کو علم ہونا، ان کا اس کی قدرت وارادہ سے پیش آنا ان چیزوں کی معرفت ہی وہ پہلا زینہ ہے کہ جس سے توکل کی راہ کھلتی ہے۔

(مدارج السالکین۔ابن قیم۔ج ۲/۱۱۲/۱۱۹)

اس وسیع مفہوم میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل اور بھروسا وہ سعادت وخوش بختی ہے، جس سے بندۂ مؤمن زندگی میں سکون نفس کی دولت سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔اس کو شرح صدر اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں بلاشبہ آمدنی اور کمائی پر اچھا اثر پڑتا ہے۔جو آدمی پریشان اور کھویا کھویا سا رہتا ہے، بے چینی اور مایوسی کا شکار ہوتا ہے وہ اس کام کو جو اس کے حوالے کیا جاتا ہے کم ہی صحیح طریقے پر انجام دے پاتا ہے۔اپنے مقصد میں اتنی کامیابی حاصل کر پائے کہ جس سے وہ مطمئن ہو سکے ناممکن سا ہوتا ہے۔توکل کی ایک علامت اور پہچان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جو اور جتنی روزی عطا فرما رکھی ہے، اس پر راضی رہے اور جو صلاحیت اور قوتِ عمل دے رکھی ہے، اس پر قناعت کرے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اپنے لطف سے مقدر فرمادیا ہے، اس پر شکر گزار رہے۔اس لئے بندۂ مؤمن کا یہ ایمان وعقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جو رزق اور صلاحیت عطا فرمائی ہے اس میں عدل وحکمت سے کام لیا ہے، آپ ﷺ نے جس توکل پر ابھارا اور آمادہ کیا ہے اس توکل کے یہی معنیٰ ہیں۔

انسان اپنی ساخت ومزاج کے اعتبار سے بڑا لالچی واقع ہوا ہے۔اس کے دل میں دنیا کی ایسی حرص رکھ دی گئی ہے کہ کسی حد پر جا کر اس کا دل بھرتا ہی نہیں۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس حدیث کے ذریعے حصول مال وغنیٰ کے سلسلے میں اعتدال ومیانہ روی اختیار کرنے کی رہنمائی فرمائی ہے اور حصول رزق کے لئے محنت اور جدوجہد کا حکم دیا ہے اور اس رہنمائی کے ذریعے اس کے نفس وزندگی میں توازن قائم فرماتا ہے اور اس کو غلو اور کوتاہی سے دور رکھتا ہے جس کی وجہ سے انسان کا دل اور بدن دونوں ہی مشکلات وپریشانی کا شکار ہوجاتے ہیں۔

اگر انسان کو اس کی حرص و لالچ کی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور اس کو اس کے حال پر رہنے دیا جائے تو وہ خود اپنے اور اپنی جماعت کے لئے مصیبت بن جائے، لہٰذا ضروری تھا کہ اس کی چاہت و خواہش کو بلند اقدار و کردار کی طرف موڑا جائے اور اس کی رہنمائی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجاً مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقىٰ (طٰہٰ:۱۳۱)

''اور کئی طرح کے لوگوں کو جو ہم نے دنیا کی زندگی میں آرائش کی چیزوں سے بہرہ مند کیا ہے تاکہ ان کی آزمائش کریں، ان پر نگاہ نہ کرنا اور تمہارے پروردگار کی (عطا فرمائی ہوئی) روزی بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔''

حدیث کا فقہی پہلو

یمن کے لوگ حج کو آتے تھے تو زادراہ کا اہتمام نہیں کرتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ بس ہم تو اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کرتے ہیں اور جب مکہ پہنچتے تو مجبور ہو کر لوگوں سے مانگتے اور سوال کرتے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَتَزَوَّدُوْا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوىٰ (البقرہ:۱۹۷)

''اور زادراہ (یعنی راستے کا خرچ) ساتھ لے جاؤ کیوں کہ بہتر (فائدہ) زادراہ (کا) پرہیزگاری ہے۔''

یہی بات مجاہدؒ، عکرمہؒ، نخعیؒ اور دیگر بہت سے سلف نے فرمائی ہے۔ یہ حضرات اسباب اختیار کرنے کو بالکل ہی چھوڑ دینے کی اجازت نہیں دیتے، سوائے اللہ کے ان خاص الخاص بندوں کے جو رجوع و انابت اور محبتِ خداوندی کے اس مرتبہ کو پہنچ گئے ہوں کہ مخلوق سے کوئی امید و لالچ دل میں باقی نہ رہی ہو (دل اِشراف سے بالکل پاک ہو چکا ہو اور جس حال میں بھی ہوں اس پر راضی و صابر ہوں، کسی قسم کا کوئی شکوہ و شکایت زبان پر نہ آتا ہو بلکہ ''ہر چہ از دوست می رسد نیکوست''، محبوب کی طرف سے جو کچھ بھی پیش آئے وہ بہتر و پسندیدہ ہے۔ ہر ادا محبوب کی محبوب

ہے۔ یہ ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہو۔ بہت سے لوگ ان خواص کو دیکھ کر دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں اور ان کی نقل میں دینی زندگی کی غلط تصویر پیش کرتے ہیں، توکل کے نام پر دوسروں کے دست نگر بنے رہتے ہیں، یہ اسلامی تعلیم کے سراسر خلاف ہے جیسا کہ توکل کے بیان میں واضح کیا گیا)۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ سے منقول ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ: اگر کوئی شخص گھر میں بیٹھا رہے کچھ کرے دھرے نہیں بلکہ یہ خیال کئے بیٹھا رہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ پر بھروسا ہے تو کیا اس کا رزق اس کے پاس خود آئے گا؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ انبیاء کرام نے یہ اُسوہ نہیں چھوڑا۔ بلکہ وہ محنت مزدوری کرتے تھے، کام کاج اور کاروبار میں مشغول ہوتے تھے، خود رحمۃ للعالمین ﷺ کام کاج اور کاروبار کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے کبھی نہیں فرمایا کہ ہم بیٹھے رہیں گے اللہ تعالیٰ خود سے ہم کو رزق پہنچائے گا، اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے ''فانتشروا فی الأرض وابتغوا من فضل اللہ''۔ تلاش معاش میں لگنا ضروری ہے (جامع العلوم والحکم: ۵۳۲)

ان ساری مذکورہ تفصیلات سے حصول رزق کی کوشش کے ساتھ توکل کی ضرورت و اہمیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱)　اس پر پورا یقین رہے کہ رازق حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ اور زبان و عمل دونوں سے اس کا ثبوت دیا جائے۔

(۲)　توکل کا یہ مطلب نہیں کہ حصول رزق کے لئے جن اسباب کو اپنانا ضروری ہے ان کو ترک کر دیا جائے۔

(۳)　توکل سے دل کو سکون واطمینان رہتا ہے۔

حدیث - ۹

اصرار کے ساتھ سوال کا معاشرے پر اثر

عن ابی هريرة رضی الله عنه عن النبی ﷺ قال : دعونی ما ترکتم، انما هلك من كان قبلكم بسوالهم و اختلافهم علی انبيائهم ، فاذا نهيتكم عن شئ فاجتنبوه، وا ذا امرتكم بامر فاتوا منه ما استطعتم.

(فتح الباری ۲۶۶/۱۳۔ صحیح مسلم شرح نووی)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جتنا تم سے کہہ دوں اسی پر عمل کرو، خاموش رہو، تم سے پہلی قومیں اپنے (بے جا) سوالوں اور اپنے نبیوں سے اختلاف ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں۔ لہذا جب میں تم کو کسی چیز سے روک دوں تو اس سے بچو اور پرہیز کرو اور جب کسی چیز کا حکم دوں تو اپنی قوت و استطاعت بھر اس پر عمل کرو۔''

محمد بن زیاد حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اس حدیث کو آپ ﷺ نے اس مناسبت سے ارشاد فرمایا کہ ایک دن آپ نے ہم لوگوں کے سامنے تقریر فرمائی، تقریر میں آپ نے فرمایا: ''لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض فرمایا ہے، لہذا حج کرو۔ ایک شخص (اقرع بن حابس۔ جو مولفته القلوب میں سے تھے) نے کہا! اللہ کے رسول کیا ہر سال؟ اس شخص کے سوال پر آپؐ خاموش رہے، یہاں تک کہ اس نے تین مرتبہ دہرایا۔ تب اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا: اگر میں ہاں کہہ دیتا تو (ہر سال) حج واجب ہو جاتا اور تم ایسا کرنہ پاتے، پھر آپ نے فرمایا: جتنا کہہ کر تم کو چھوڑ دوں (خاموش ہو جاؤں) اتنے ہی پر ہم کو چھوڑ دو (خاموش رہو) تم سے پہلے کے لوگ اپنے سوالوں اور اپنے نبیوں سے اختلاف ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں، جب میں تم کو کسی بات کا حکم کروں تو اس کو حتی المقدور کرو اور جب کسی بات سے تم کو منع کروں تو اس کو چھوڑ

دو!''۔(صحیح مسلم)

حدیث مذکور میں تربیتی پہلو سے کئی باتیں قابل غور ہیں، اس آدمی نے سوال کیا ''یا رسول اللہ کیا ہر سال'' اور حضور ﷺ جواب دینے کے بجائے خاموش رہتے ہیں لیکن سائل برابر اپنا سوال دہرائے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ تین مرتبہ سوال کیا، سوال کا بار بار کرنا یہ بتاتا ہے کہ امت کو زندگی کے مختلف گوشوں میں مزید تعلیم وہدایت کی ضرورت ہے اور یہ کہ آپ نے جس بات کو نہیں بتایا اس کے سلسلے میں آپ کے ادب واحترام میں سوال نہ کرنا واجب ہے اور ایسی بات میں سوال کہ اگر آپ سائل کو اس کے سوال پر جواب دیتے تو اس سے سائل کو تکلیف ہوتی اور وہ مشکل میں پڑ جاتا اور ایسی بات کا مکلّف کر دیا جاتا جس کو وہ کر نہ سکتا یا جن باتوں میں اللہ تعالیٰ نے توسع و گنجائش رکھی ہے ان میں وہ تنگی میں پڑ جاتا یا اس کو چھوڑ بیٹھتا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر لطف وکرم کے سبب اس کی تحدید نہیں فرمائی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْأَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۔ (المائدۃ:۱۰۱)

''مومنو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوال مت کرو کہ اگر (ان کی حقیقتیں) تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں بری لگیں اور اگر قرآن کے نازل ہونے کے ایام میں ایسی باتیں پوچھو گے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی (اب تو) خدا نے ایسی باتوں (کے پوچھنے) سے درگذر فرمایا ہے اور خدا بخشنے والا بردبار ہے۔''

ابن کثیر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں اپنے مومن بندوں کو ادب سکھایا ہے اور ایسی چیزوں کے بارے میں سوال کرنے سے منع فرمایا ہے، جن کے بارے میں سوال کرنے سے ان کو کوئی فائدہ نہیں بلکہ ایسی چیزوں کے بارے میں سوال کرنے کو سختی سے منع کیا ہے اس لئے کہ اگر وہ باتیں ان پر ظاہر کر دی جائیں تو بہت ممکن ہے کہ اس سے ان کو تکلیف پہنچے اور اس کا سننا ان کو ناگوار اور باعث مشقت ہو۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایک دن ایسی غیر معمولی تقریر فرمائی کہ اس جیسی تقریر ہم نے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس تقریر میں آپ نے فرمایا:

''اگر تم کو وہ معلوم ہو جائے جو مجھے معلوم ہے تو بلا شبہ ہنسو کم اور روؤ زیادہ''۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اس تقریر کا صحابۂ کرامؓ پر ایسا اثر ہوا کہ اپنے چہروں کو کپڑوں سے ڈھک لیا اور سسک سسک رونے لگے۔ ایک شخص کے سوال کے نتیجہ میں یہ بات پیش آئی کہ ایک شخص نے یہ بے تکا سوال کیا کہ میرا باپ کون ہے؟ اس پر آیت بالا نازل ہوئی، یہ حدیث تربیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ آپ ﷺ کچھ دیر توقف فرماتے ہیں جیسا کہ ایک مربی، ڈرانے اور خوشخبری سنانے والا، رہنمائی اور ہوشیار کرنے والا مقرر کرتا ہے اور فرماتے ہیں ''اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو یقیناً ہنسو کم اور روؤ زیادہ'' جس کا اثر یہ ہوا کہ تمام صحابۂ کرام پر ان جذبات کو ابھار دینے والے انداز کلام نے گریہ کی کیفیت طاری کر دی اور ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور دل تاثر میں ڈوب گئے، صورت حال اس بات کی متقاضی ہوئی کہ خطبۂ مذکور کے وسیع مفہوم کے اعتبار سے دوسرے سوالات سامنے آ جائیں۔ ایک شخص یہ بے تکا سوال کر بیٹھتا ہے کہ میرا باپ کون ہے؟ اس طرح کے سوالات برابر پیش آتے رہتے تھے اس لئے کہ امت ابھی تربیت کے مراحل سے گزر رہی تھی اور اس میں ابھی جاہلیت کی عادات اور دیہاتی پن کے بہت سے اثرات باقی تھے، جیسا کہ آنے والی روایتوں سے ان باتوں کا اندازہ ہوگا۔

صحیحین میں مروی ہے کہ حضرت انسؓ حضرت قتادہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: لوگوں نے حضور ﷺ سے سوال کیا اور بار بار سوال کو دہرایا جس پر حضور ﷺ کو غصہ آ گیا حتیٰ کہ آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا: آج تم مجھ سے جو سوال بھی کرو گے اس کی حقیقت کو بیان کر دوں گا۔ اس پر ایک شخص نے سوال کیا: جب کوئی شخص نا معلوم نسب کا ہوتا ہے تو اپنے باپ کے علاوہ سے منسوب کیا جاتا ہے چنانچہ اس نے سوال کیا اے اللہ کے رسول میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا تمہارا باپ حذافہ ہے۔

ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں آیت ذیل کے تحت اس حدیث کی تشریح کی ہے ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ'' حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے: آپ ﷺ غصے کی حالت میں تشریف لائے غصے سے چہرۂ انور سرخ تھا۔ منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور پوچھ بیٹھا میں کہاں ہوں؟ آپ نے فرمایا آگ میں، دوسرا شخص کھڑا ہوا اس نے سوال کیا میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تمھارا باپ حذافہ ہے،

صورت حال کا جائزہ لے کر حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ہم نے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانا اور اسلام کو دین تسلیم کیا اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر یقین کیا اور قرآن کریم کو اپنا امام و پیشوا مانا، اللہ کے رسول ہم لوگ ابھی ابھی جاہلیت و شرک سے نکل کر اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے باپ دادا کو خوب جانتا ہے، راوی فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی اس درخواست و گزارش سے آپ ﷺ کا غصہ تھما اور اس کے بعد یہ آیت شریفہ نازل ہوئی۔ ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ۔ (المائدہ:۱۰۱)

اس قسم کے واقعات وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے تھے، اس انداز کی بہت سی روایتیں ہیں، جو اس طرح کے واقعات کو پیش کرتی ہیں۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ حضور ﷺ سورج ڈھلے تشریف لائے اور نماز ظہر ادا فرمائی، سلام پھیرنے کے بعد آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور قیامت کا بیان و ذکر فرمایا۔ اور اس دن جو نا قابل قیاس چیزیں پیش آئیں گی ان کا ذکر فرمایا، اس کے بعد آپ نے فرمایا: جو شخص کچھ پوچھنا چاہے پوچھے، جس چیز کے بارے میں بھی پوچھو گے جب تک منبر پر ہوں اس کا جواب دوں گا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ لوگ بے تحاشہ رونے لگے۔ اور آپ بار بار اپنا قول دہراتے رہے پوچھو۔ پوچھو: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص آپ کے سامنے کھڑا ہوا، اور پوچھا: اللہ کے رسول ﷺ میرا ٹھکانا کہاں ہے؟ آپ نے جواب دیا جہنم۔ اتنے میں عبداللہ بن حذافہ اٹھے اور سوال کیا کہ یا اللہ کے رسول میرا باپ کون ہے؟ آپ نے جواب دیا تمھارا باپ حذافہ ہے، راوی کہتے ہیں کہ پھر آپ برابر اپنا سوال سلونی دہراتے رہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عمرؓ مودب ہو کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور فرمایا ہم اللہ تعالیٰ کو اپنا رب ماننے پر راضی ہیں۔ اسلام کو اپنا دین مان لیا۔ حضرت محمد ﷺ کو خدا کا نبی اور رسول مان لیا۔ راوی کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا تو حضور خاموش ہوئے، پھر آپؐ نے فرمایا: خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ مجھے نماز پڑھنے کی حالت میں ابھی ابھی اس دیوار پر جنت و جہنم دونوں دکھائے گئے۔ آج جیسی اچھائی (نعمتیں) اور برائی (عذاب) ہم نے نہیں دیکھی۔ حدیث بالا سنجیدگی و وقار کے ساتھ تربیتی پہلوؤں پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے، حدیث پاک مسجد نبوی کے اندر تعلیم و تربیت اور مختلف النوع کاموں کی تصویر پیش کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک قائد و رہنما کی ذمہ داریوں کو

اجاگر کرتی ہے۔ آپ ﷺ کس طرح منبر پر کھڑے ہوکر لوگوں کی اصلاح اور انجام بد سے ڈرانے کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ روایت نہایت نازک صورت حال کو سامنے لاتی ہے۔ آپ نے قیامت کا ذکر فرمایا اور بیان فرمایا کہ قیامت کے وقت ایسے ہیبت ناک حالات پیش آئیں گے پھر اخیر میں قسم کھا کر فرمایا کہ ابھی ابھی میرے سامنے جنت و جہنّم دونوں پیش کئے گیے۔ آج سے بڑھ کر نہ نعمتیں اور اچھائیاں دیکھیں نہ عذاب اور برائیاں۔ یہ تمام تفصیلات دل کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ چنانچہ لوگوں پر غیر معمولی اثر پڑا۔ اور ندامت میں ڈوب گئے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ لوگ بلک بلک کر رونے لگے، کیوں نہ ہو اس طرح کی صورت حال تو ندامت اور رونے ہی کی کیفیت پیدا کرتی ہے اور ہر بات کو سنجیدگی و متانت سے سوچنے اور مناسب انداز بیان کے ذریعہ دلوں کو خوش کرنے کا سبق پڑھاتی ہے۔ حضرت عمرؓ جلد اس صورت حال کو بھانپ گئے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر نہایت ادب و محبت کے ساتھ عرض کیا۔ ہم اللہ تعالیٰ کے رب ہونے اور اسلام کے دین ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہیں، حضرت عمرؓ کے یہ عرض کرنے پر آپ ﷺ خاموش ہو گئے پھر اس کے بعد عمرؓ نہایت ادب کے ساتھ محبت بھرے الفاظ میں اللہ کے رسول کا دل خوش کرنے والی باتیں کرنے لگے درمیان درمیان میں معذرت کے الفاظ بھی فرماتے جاتے: ''ہم لوگ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے ہیں''۔ پھر ملامت کرتے ہوئے فرماتے ''اے اللہ کے رسول ﷺ ہم ابھی ابھی جاہلیت سے نکل کر اسلام لائے ہیں۔ آپ ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو معاف فرما دیجیے اور اس طرح کے سوالات کہ میرا داخلہ کہاں ہوگا؟ میرا باپ کون ہے؟ اللہ کے رسول میری اونٹنی کہاں ہے؟ درگزر فرمایئے''۔ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نا مناسب سوالات تربیت و تزکیہ کے ابتدائی زمانہ میں پیش آئے تھے، اس لیے کہ حضرت عمرؓ کے قول کہ: ''ہم لوگ ابھی نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں'' سے یہی معلوم ہوتا ہے، اسی وجہ سے حضور ﷺ اس تربیتی منزل کے شروع زمانہ میں جلد بازی اور اصرار کرنے سے ڈرایا ار۔ سوال کا طریقہ اور اس کے آداب بتائے، حضرت عامر بن سعد بن ابی وقاص اپنے والد کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے کسی ایسی چیز کے حرام و حلال ہونے کے بارے میں سوال کیا جو حرام نہیں کی گئی تھی اور اس کے سوال کی وجہ سے حرام کر دی گئی۔ آپ ﷺ بلا وجہ کی باتوں قیل و قال اور بہت زیادہ

سوال کرنے اور مال کو بلا وجہ ضائع کرنے سے منع فرماتے تھے، آپ نے صحابۂ کرامؓ کو نصاریٰ کی طرح سوال کرنے سے منع فرمایا کہ ان لوگوں نے اپنے نبی (عیسیٰ علیہ السلام) سے آسمان سے دستر خوان یعنی کھانے کی چیزوں کے اترنے کا مطالبہ کیا کہ ایسا ہو جائے تو ہم کو یقین آئے اور ہم ایمان لائیں اور جب آسمان سے دستر خوان اترا تو ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ اس واقعہ کو قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے:

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يَا عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (المائدۃ:۱۱۲)

(وہ قصہ بھی یاد کرو) جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا تمھارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے (طعام کا) خوان نازل کرے؟ انھوں نے کہا کہ اگر ایمان رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو!

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ''لا تسالوا عن أشياء'' سے بحیرہ، وصیلہ، سائبہ اور حام ہے۔ اور حضرت عکرمہؓ سے مروی ہے کہ سوال سے روکنے کا مطلب اللہ تعالیٰ کی آیات کے بارے میں سوال کرنا ہے کہ کوئی معجزہ و نشانی لایئے تو ایمان لائیں، مثلاً قریش کا سوال کہ آپ ﷺ پانی کی نہر جاری کر دیں اور صفا پہاڑی کو سونے کی کر دیں۔ یعنی پوری پہاڑی سونا بن جائے۔ آپ ﷺ آیت کریمہ ''لا تسألوا عن أشياء ان تبد لكم تسؤكم'' کی حکمت و مصلحت کو سمجھنے کی طرف برابر متوجہ کرتے رہے، اس بارے میں بزار نے حضرت ابوالدرداء کی حدیث مرفوعاً نقل کی اور فرمایا کہ حدیث کی سند صحیح ہے حاکم نے بھی حضرت ابوالدرداء کی حدیث کو صحیح کہا ہے، حدیث یہ ہے:

''ما أحل الله فهو في كتابه فهو حلال وما حرم فهو حرام وما سكت عنه فهو عفو فاقبلوا من الله عافيته فان الله لم يكن ينسى شيئاً. ثم تلا هٰذه الآية (وما كان ربك نسيا).

''اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو چیز حلال فرمائی ہے وہ حلال ہے اور جس چیز کو حرام

کیا ہے وہ حرام ہے اور جس چیز سے سکوت فرمایا ہے وہ جائز ہے (معاف ہے) اللہ تعالیٰ کی معاف اور اختیار دی ہوئی باتوں کو قبول کرلو! اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ کسی چیز کو بھول جائے پھر یہ آیت ذکر کی ہے۔ ''وما کان ربک نسیاً''۔

دار قطنی نے ابوثعلبہ کی حدیث ذکر کی ہے:

''ان اللّٰه فرض فرائض فلا تضيعوها وحدّ حدوداً فلا تعتدوها وسكت عن أشياء رحمة لكم غير نسيان فلا تبحثوا عنها''۔ (فتح الباری ج ۱۳ ص ۳۶۶)

بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں فرض فرمائی ہیں ان کو ضائع نہ کرو (یعنی ان پر عمل کرو) اور کچھ حدود مقرر فرمائی ہیں ان سے آگے نہ بڑھو اور کچھ چیزوں کے بارے میں تم پر اپنے لطف و کرم کی بنا پر نہ کہ بھول کر سکوت فرمایا ہے، ان چیزوں کی تحقیق میں نہ پڑو۔

سوال کرنے میں صحابہ کرامؓ کا ادب

پھر وقت آیا کہ حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی تربیت پختہ فرمادی اور صحابہ کرام میں جن کو آپ سے قریب رہنے اور برابر ملنے جلنے کا شرف حاصل تھا اور وہ منتخب چیدہ اصحاب میں سے تھے، انھوں نے سوال کے سلسلے میں ایک خاص انداز اپنایا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ فرمایا ''ہمیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کرنے سے منع کردیا گیا تھا۔ لہٰذا اس انتظار میں ہوتے کہ کوئی سادہ لوح اور بھولا بھالا آدمی آئے آپؐ سے سوال کرے، ہم جواب سن کر استفادہ کریں۔'' احمدؒ نے ابوامامہ سے تخریج کی ہے کہ جب آیت (يا ايها الذين آمنوا لا تسئلوا عن اشياء) نازل ہوئی تو ہم لوگ حضور ﷺ سے سوال کرنے میں احتیاط کرنے لگے، ہم کسی دیہاتی (اعرابی) کے پاس آتے اور اس سے کہتے کہ حضور ﷺ سے سوال کرو۔ کچھ پوچھو ((فتح الباری ج ۱۳ ص ۳۶۶)) یہ ادب رسول اور اسوۂ نبوت کے اپنانے اور اطاعت حکم کا نیا اور مبارک انداز تھا۔ ایک اور مثال منقول ہے جو اس ادب ولحاظ کو اور نمایاں کردیتی ہے۔ (فتح الباری ج ۱۳ ص ۳۶۶)

حضرت مسلم نواس بن سمعان سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بیان کیا کہ میں

نے ایک سال تک حضور ﷺ کے ساتھ مدینہ منورہ میں قیام کیا، سوال کے علاوہ کوئی بات مجھے ہجرت سے نہیں روکتی تھی۔ ہم میں سے جب کوئی ہجرت کرتا تھا تو حضور ﷺ سے پوچھتا نہیں تھا، آپ کا مطلب یہ تھا کہ ہجرت کے ارادے سے نہیں بلکہ ملنے کی غرض سے آئے تھے۔ اس طرح سال بھر ٹھہرے رہے کہ مسائل معلوم کریں، لیکن ہجرت کی نیت نہیں کی کہ وفد کی صورت باقی نہ رہے اور عرصے تک قیام کرنے کی وجہ سے مہاجر بن جائیں اور سوال کرنا ممنوع ہو جائے۔ اس واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوال کرنے کی ممانعت دیہاتیوں کے لیے نہیں تھی، چاہے وفد کی صورت میں آئے ہوں یا مقیم ہوں۔

یہ معلوم ہے کہ نواس بن سمعان شام کے رہنے والے تھے اور فیضان نبوی سے فیض حاصل کرنے اور نبوت کے چشمۂ صافی سے براہ راست سیراب ہونے کی غرض سے مسافرانہ حاضر ہوئے تھے، مستقل قیام کی نیت نہیں تھی کہ مہاجرین میں شمار ہونے لگیں اور ان پر سوال کرنے کی ممانعت کے شرائط جاری ہو جائیں۔ یہ واقعہ ادب کا اعلیٰ ترین نمونہ اور حصول علم کے شوق وحرص کی زندہ جاوید مثال ہے جو علم کے شائق اور پیاسے طالب علم کے لئے جو علم وعمل کے مختلف میدانوں میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے روشنی کا کام دیتا ہے۔

اس تربیتی مرحلے اور صالح ومثبت ذہن سازی کے بعد جو سوالات کو صحیح رخ دینے کے بعد ظاہر ہوا۔ اب غزوات اور آزمائش کے وقت اس نئے اسلامی معاشرے میں جو سوالات ہوئے وہ علمی اور دعوتی سوالات تھے، مثلاً یتیموں کے بارے میں سوال کرنا جو دور جاہلیت میں ظلم کا شکار ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتَامىٰ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ۔ (البقرہ:۲۲۰)

اور تم سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ کہہ دو ان کی (حالت کی) اصلاح بہت اچھا کام ہے۔

ایسے ہی حلال وحرام کا سوال ''يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ (المائدہ:۴)

تم سے پوچھتے ہیں کہ کون سی چیزیں ان کے لئے حلال ہیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ۔ (البقرۃ:۱۸۹)

(اے پیغمبر) لوگ تم سے شراب اور جوئے کا حکم دریافت کرتے ہیں۔

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّۃِ قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ۔ (البقرہ:۱۸۹)

(اے محمد) لوگ تم سے نئے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے) کہہ دو کہ وہ لوگوں کے (کاموں کی میعادیں) اور حج کے وقت معلوم ہونے کا ذریعہ ہے۔

انفاق کے سلسلے میں بہت سی آیات نازل ہوئیں، اسلئے کہ لوگ پرانے رسم اور رواج کے مطابق انفاق کے عادی تھے، لیکن اب انفاق اسی تیزی سے بدلتے ہوئے اسلامی معاشرے کے لیے جس کا اسے سامنا کرنا پڑ رہا تھا ایک اہم ضرورت بن گیا جو ایک دوسرے کی کفالت وتعاون کا متقاضی تھا۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ آیت کریمہ ''یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ.'' (بقرہ۔۲۱۹) اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کون سا مال خرچ کریں۔ عمرو بن جموح انصاری کے بارے میں نازل ہوئی جو بہت عمر دراز اور مالدار تھے، انھوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا اللہ کے رسول! کتنا خرچ کریں اور کن لوگوں پر خرچ کریں؟ اس طرح کے مختلف نوع کے نئے نئے سوالات برابر پیش آنے لگے جو اس دین متین کی ہمہ گیری اور وضاحت، اور نئی اسلامی اقدار سے متعلق ہوتے تھے، یہ اس بڑھتے ہوئے نئے معاشرے میں ہر وقت پیش آتے تھے اور مسلمان ان کے بارے میں اپنے نبیؐ سے اسلام کے مختلف معاملات کے بارے میں پوچھا کرتے تھے، یہ وہ معاملات ہوتے تھے جو ان کی جاہلیت کے بعد والی نئی اسلامی زندگی میں پیش آیا کرتے تھے، مثلاً ''یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ قُلْ ھُوَ اَذیً'' (بقرہ،۲۲۲) اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دو وہ نجاست ہے۔

یہ نئے نئے سوالات اس ترقی پذیر معاشرے کے نقوش اور معاشرتی واجتماعی تعلقات کی دلیل تھے کہ مسلمانوں کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے تصور اور عقیدے کے مطابق صاف صاف واضح احکام معلوم کریں۔

اکثر صحابہ کرام اور تابعین مسائل پیش آنے سے پہلے ان کے بارے میں سوال کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور ایسے سوالات کا جواب نہیں دیتے تھے۔

ایک دن حضرت عمرؓ لوگوں کے پاس آئے اور فرمایا! ہم تمہارے لئے یہ مناسب نہیں سمجھتے کہ جو بات پیش نہیں آئی ہے اس کے بارے میں مجھ سے سوال کرو کہ جو باتیں معلوم ہو چکی ہیں ہم اسی پر عمل کرنے میں مشغول ہیں (مزید کیا بوجھ اٹھائیں) ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو چیز پیش نہیں آئی اس کے بارے میں سوال نہ کرو، ہم نے حضرت عمرؓ کو ایسے شخص پر لعنت کرتے سنا ہے جو ایسی چیز کے بارے میں سوال کرے جو ابھی پیش نہیں آئی ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ سے جب کسی چیز کے بارے میں سوال کیا جاتا تو پوچھتے کیا یہ بات پیش آئی ہے؟ جب جواب ملتا کہ نہیں، پیش تو نہیں آئی ہے تو فرماتے کہ پھر چھوڑو جب پیش آئے تو سوال کرنا۔ حضرت صلت راشد سے مروی ہے فرمایا، ہم نے حضرت طاؤس سے ایک چیز کے بارے میں پوچھا تو جھڑک دیا اور پوچھا کیا ایسا پیش آیا ہے؟ ہم نے عرض کیا ہاں، تو فرمایا کیا سچ کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا ہاں بالکل اسی کے قریب قریب مبہم بات پیش آئی ہے۔ صنابحیؒ نے حضرت امیر معاویہؓ کے حوالہ سے بیان کیا کہ انھوں نے کہا حضور ﷺ نے مبہم باتوں کے سلسلہ میں سوال کرنے سے منع فرمایا ہے، اسی کی تخریج امام احمدؒ نے کی ہے۔ اس کی وضاحت امام اوزاعیؒ نے اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ مشکل مسائل ہیں۔

حضرت ثوبانؓ کی ایک حدیث آپ ﷺ سے بیان کی جاتی ہے، "**سیکون قوم من امتی یغلطون فقھاء ھم بعضل المسائل اولئک شرار امتی۔**"

ہماری اُمت میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو مفتیوں اور فقہاء کے سامنے مسائل مبہم اور غیر واضح کر کے پیش کریں گے، یہ لوگ ہماری امت کے بدترین لوگ ہوں گے۔ امام اوزاعیؒ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو علم کی برکت سے محروم کرنا چاہتا ہے تو اس کی زبان سے مہمل ولغو سوالات کرواتا ہے۔ ہم نے اس قسم کے لوگوں کو سب سے کم علم پایا، یہ بھی فرمایا، ہم نے امام مالکؒ کو فرماتے سنا ہے کہ بہت زیادہ باتیں کرنے اور فتویٰ لینے کو عیب کی بات فرماتے تھے۔

شرف وبلندی اور علم کی قدر وعزت کے بارے میں اسلاف کے یہ چند نمونے ہیں، موجودہ دور میں ہمیں ان آداب واخلاق کو اپنانے کی کتنی شدید ضرورت ہے، اس لئے کہ اس

طرح کے لغو ومبہم سوالات حصول علم اور عمل کا جذبہ پیدا کرنے کے سلسلہ میں رکاوٹ بنتے ہیں، بلکہ مصیبت ودشواری میں ڈالتے ہیں۔ جہاں تک طلبہ کا تعلق ہے ان میں سے اکثر اس بارے میں سوءِ ادب کا شکار ہوجاتے ہیں، بحث چھیڑنے اور ریاکاری کے طور پر سوال کرتے ہیں۔ حضرت وہب کا قول ہے کہ ہم نے امام مالکؒ کو فرماتے سنا ہے کہ علم کے بارے میں ریاکاری دل کو سخت بنادیتی ہے اور کینہ کا سبب بن جاتی ہے۔ (جامع العلوم والحکم ص ۱۰۸-۱۱۷)

ان علمی نزاکتوں کے سبب امام نووی اس حدیث کو اسلام کے اہم اصولوں اور جوامع الکلم (یعنی کم الفاظ کا بہت سے معنی ادا کرنا) میں شمار کیا ہے جو آپ ﷺ کو عطا کیا گیا تھا۔ اس کے اندر بے شمار احکام آجاتے ہیں۔ مثلاً نماز کی تمام شکلیں کہ اگر بعض ارکان کو یا شرائط کو نہ ادا کرسکتا ہو تو جتنا کرسکتا ہو اتنا کرے۔ (شرح مسلم نووی، ج۹ ص۱۰۰)

حدیث کا فقہی پہلو

حدیث پاک کا یہ حکم کہ جب میں تم کو کسی بات کا حکم دوں تو اس کو اپنی استطاعت بھر جتنا کرسکتے ہو کرو یہ حکم استحبابی ہے۔ امام نوویؒ نے فرمایا، آپ کے الفاظ جوامع الکلم اور اسلام کی ان اصولی باتوں سے ہیں جن سے جزئیات کا استنباط کیا جاتا ہے اور اس میں بہت سے احکام داخل ہوجاتے ہیں، مثلاً اس شخص کی نماز جو نماز کے بعض ارکان کو ادا کرنے پر قادر نہیں۔ مثلاً آنکھوں میں تکلیف کے سبب سجدہ نہیں کرسکتا، پاؤں میں کمزوری کے سبب قیام نہیں کرسکتا۔ یا اسی طرح بعض شرائط پوری کرنے پر قادر نہیں، ایسی صورت میں وہ جتنا کرنے پر قادر ہو اتنا کرے، اسی طرح وضو ہے۔ ستر عورت ہے (یعنی جسم کے جتنے حصہ ڈھکنا ضروری ہے) حتی الامکان سورہ فاتحہ کا یاد کرنا اور حتی المقدور صدقہ ادا کرنا۔ رمضان المبارک میں کسی عذر کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے اور دن کے کسی حصہ میں اس کی معذوری ختم ہوجائے تو اسے چاہئے کہ روزہ داروں کی طرح کھانے پینے سے گریز کرے۔ گو اس کا روزہ نہ ہوگا لیکن احترام کا ثواب ملے گا۔ اسی طرح کے اور مسائل۔ (فتح الباری)

اسی طرح پاکی وطہارت کا مسئلہ ہے تو جتنے پر قادر ہو اتنی طہارت حاصل کرے اور جتنے پر قادر نہیں اس کی تکمیل تیمّم سے کرے، خواہ وہ پانی نہ ہونے کے سبب سے ہو۔ یا بعض اعضاء

[illegible]

حدیث - ۱۰

تین قسم کے لوگ جنت میں نہیں داخل ہوں گے

عن ابی بکر الصدیق عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ''لا یدخل الجنۃ خب ولا بخیل ولا منان۔'' (تحفۃ الاحوذی۔ م ۶ ص ۹۸)

''حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں نہ دھوکہ باز داخل ہوگا، نہ بخیل اور نہ احسان جتانے والا۔''

مفہوم

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں کے معاشرے میں طرح طرح کے رسوم، رواج اور زندگی کے مختلف اقدار کا چلن تھا، جس سے ذہنوں کو صاف اور دلوں کو پاک کر کے زندگی کے اس میل اور جاہلیت کے اثرات کو دور کرنے کی ضرورت تھی۔ اس مدنی معاشرے میں کچھ ایسے لوگ پائے جاتے تھے، جو مال کے بارے میں بخیل تھے، حتیٰ کہ کسی کو قرض ادھار بھی دیتے تو سود پر دیتے۔ دوسری طرف کچھ ایسے لوگ تھے جو ناپسندیدگی کے ساتھ شرماشرمی یا محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے تھے، کچھ ایسے کم ظرف لوگ تھے کہ اگر کسی کو کچھ دیتے دلاتے اور اچھی اور عمدہ چیز روک کے رکھتے، کچھ وہ فتنہ پرور لوگ تھے جو چغلخوری کر کے دوستوں میں پھوٹ ڈال دیتے تھے۔ یہ ساری باتیں جاہلیت کی بیماریوں میں سے تھیں، جن کا اثر ابھی تک باقی تھا۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ ایسے لوگ بھی موجود تھے، جو صرف رضائے خداوندی کے لئے اپنا مال خرچ کرتے تھے۔ ان دونوں ہی قسم کے لوگوں کو نبوی تربیت کی ضرورت تھی۔ ان کے لئے کچھ اصول وقواعد ضروری تھے، جو زندگی کو منضبط و منظّم کر کے صرف رضائے الٰہی کے رُخ پر ڈال دیں۔

مالی معاملات کے احکام پہلے ہی پہل فرض اور ذمہ دار بنا کر نہیں شروع کیے جاتے ہیں بلکہ اول اول خرچ کا شوق دلا کر فضائل بتا کر خرچ کرنے کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَّاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَآءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ'' (البقرہ:۲۶۱)

''جولوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے مال کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بالی میں سو سو دانے ہوں اور خدا جس (کے مال) کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے وہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

انسان کی نفسیاتی اور مزاجی بیماریوں کا علاج اسی طرح ہمت بڑھا کر نرمی اور مخاطب کے اکرام کا خیال رکھتے ہوئے اس کے ساتھ ہمدردی ظاہر کر کے کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''ان احبکم الیّ احابتکم اخلاقا، المؤطئون اکنافا الذین یألفون ویؤلفون وان ابغضکم الیّ المشاء ون بالنمیمة المفرقون بین الأحبة، الملتمسون للبراء الغیبة''۔ ''تم میں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، خاکسار و متواضع ہو جو لوگوں سے انس رکھتا ہو۔ اور لوگ بھی اسے دل سے چاہتے ہوں۔ (ظاہر ہے محبت اسی سے کی جائے گی جو اچھے کردار کا مالک ہو) اور تم میں مجھ کو سب سے ناپسندیدہ وہ لوگ ہیں جو چغلخوری کرتے ہیں، دوستوں میں پھوٹ ڈال دیتے ہیں، بے گناہ شخص کی غیبت کرتے ہیں۔

فریبی آدمی لوگوں میں پھوٹ ڈالتا ہے۔ جس شخص کی یہ عادت ہوتی ہے، وہ بزدل و بخیل ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کسی بندۂ مومن میں دو باتیں جمع نہیں ہوسکتیں: ایک بخل دوسرے بد اخلاقی۔'' حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں اس شخص میں اس درجہ بڑھی ہوئی ہوں کہ اس کا مزاج وطبیعت بن جائیں۔ اس سے جدا نہ ہوں، اس میں اس کو مزہ آتا ہو، لیکن جو شخص کبھی کبھی بخل کا مظاہرہ کرتا ہے، وقتی طور پر اس سے بد اخلاقی کا مظاہرہ ہو جاتا، یا بعض بعض

معاملات میں کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے، مگر پھر وہ نادم وشرمندہ ہوتا ہے اور اپنے نفس کو ملامت کرتا ہے یا ملامت کا احساس پیدا ہوتا ہے جو اس کے دل میں خلجان پیدا کرتا ہے وہ اس حدیث کا مصداق نہیں ہے۔ (تحفۃ الاحوذی۔م٦ص٩٨۔)

اس کا سبب یہ ہے کہ فریب کاری اور لوگوں میں بگاڑ پیدا کرنے اور دوستوں میں پھوٹ ڈالنے، مالی، عملی اور دعا میں بخل سے کام لینا بندۂ مومن کے شایانِ شان نہیں۔ اس لئے کہ مومن کی اصل شان وصفت شرافت وخوش خلقی اور سخی ومہربان ہونا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بندۂ مومن سادہ مزاج اور کریم النفس ہوتا ہے یعنی وہ اپنی شرافت نفس کی وجہ سے چشم پوشی کے سبب دھوکا کھاتا ہے اور فاجر یعنی بے دھڑک گناہ کرنے والا فریبی اور کمینہ ہوتا ہے۔ بخیل، ضدی اور بداخلاق ہوتا ہے، آپ کی مراد یہ ہے کہ مومن اپنی سادگی اور بھولے پن کی وجہ سے دھوکے کو نہیں سمجھ پاتا نہ اس کی ٹوہ میں لگتا ہے اور یہ بات اس میں لاعلمی کے سبب نہیں بلکہ اس کی شرافت نفس اور حسن اخلاق کی وجہ سے ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنی پاک دلی اور خوش گمانی کی وجہ سے دھوکا کھاتا ہے۔

(تحفۃ الاحوذی۔م٦ص٩٨۔)

بخیل جنت میں نہیں داخل ہوگا۔ اس لئے کہ وہ اپنی جان ومال لگانے میں آخری درجے کے بخل کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس لئے وہ فساد اور بگاڑ کا شکار ہوتا ہے اور اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے لغزشوں کے دروازے کھول دے اور برائی وتنگی اس پر مسلط ہوتی جائے اور اس کو مشکل وپریشانی کی راہ چلائے اور ہر آسانی ونرمی سے محروم کردے، اللہ تعالیٰ اس ارشاد کی وجہ سے ''وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى'' (اللیل:۸-۱۰) ''اور جس نے بخل کیا اور بے پرواہ رہا اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا اسے سختی میں پہنچائیں گے۔'' یہ شخص ابتدا میں جنت میں نہیں داخل ہوگا۔ بلکہ اس کے بخل وفریب دہی اور کمینہ پن کا حساب لیا جائے گا، اس کا محاسبہ ہوگا یہ ان لوگوں میں داخل ہوگا جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت ابوذرؓ کی حدیث میں مذکور ہے کہ ''تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے اور تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ وہ

تین قسم کے لوگ جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا بہت قسمیں کھانے والا تاجر یا فرمایا بہت قسمیں کھانے والا خرید وفروخت کرنے والا، اور دوسرا احسان جتانے والا بخیل، تیسرا وہ فقیر جو تکبر کرتا ہے۔'' (مسند احمد: ج۵ص۱۵۱)

حدیث شریف کا آخری لفظ ''بہت احسان جتانے والا'' اس حدیث میں یہ بات سب سے زیادہ خطرناک ہے اس لئے کہ احسان جتانا بہت ناپسندیدہ اور کمینہ پن کا مظہر اور نفس انسانی کی رذالت، اس کی پستی، گھٹیاپن اور ناپسندیدہ جذبہ ہے، اس لئے کہ جو کچھ اس نے دیا ہے اس کا اظہار اور احسان محض اپنی جھوٹی بڑائی یا جس کو کچھ دیا ہے اس کو ذلیل کرنے کی غرض سے ایسا کرتا ہے یا لوگوں میں شہرت کی غرض مقصود ہوتی ہے اور یہ وہ تمام صفات ہیں جو اسلام کی اس روح سے میل نہیں کھاتیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اس طرح بیان فرمایا: ''انما المؤمنون اخوۃ '' مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ایسے ہی حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ'' کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان وہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

احسان جتانے کے نتیجے میں ''صدقہ'' صدقہ دینے والے اور صدقہ لینے والے دونوں کے لئے تکلیف کا باعث بن جاتا ہے۔ دینے والے کے لئے تو اس لئے کہ اس کے اندر غرور اور گھمنڈ پیدا کردیتا ہے اور لینے والے کے لئے اس لئے تکلیف کا سبب بنتا ہے کہ اس کے اندر احساس کمتری اور ذلت پیدا کرتا ہے، جس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں اس کے دل میں کینہ اور جذبۂ انتقام پیدا ہوجاتا ہے۔

بعض ماہرین نفسیات انسانی کا کہنا ہے کہ احسان جتانے کا طبعی ردّعمل کبھی نہ کبھی صدقہ لینے والے کے دل میں دشمنی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اس لئے کہ وہ اپنے دینے والے کے سامنے کمزوری وکمتری محسوس کرتا ہے۔ اس لئے یہ احساس اس کے دل میں برابر باقی رہتا ہے اور اپنے محسن پر برتری حاصل کرنے اور اظہار ناراضگی کی فکر وتدبیر میں لگا رہتا ہے اور دل میں اس کی دشمنی سمائی رہتی ہے۔'' (فی ظلال القرآن۔ سید قطب۔ (البقرہ: ج۳/۳۰۷)

اسلام نے ان انسانی بیماریوں کو ختم کرنے کی تدبیر بہت دوررس اور باریک ضابطوں

کے ذریعے کیا ہے۔ اسلام یہ بتاتا ہے کہ انسان کے پاس جو مال ہے وہ اس کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا مال ہے۔ مالداروں کو جو روزی حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے تو جب کوئی مالدار اپنے مال میں سے دیتا ہے تو وہ اپنے نہیں بلکہ اللہ کے مال میں سے دیتا ہے۔ (پھر اللہ تعالیٰ کے کرم بے پایاں کا یہ عالم ہے کہ) بندہ اللہ کے نام پر جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ قرض سے تعبیر فرماتا ہے کہ اس قرض کو کئی گنا کر کے واپس کرے گا۔ حدیث پاک کہ:

''فریبی، بخیل اور احسان جتانے والا جنت میں نہیں داخل ہوگا۔''

اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے اور راہِ خدا میں اس لطیف انداز میں خرچ کرنے اور دینے کی تاکید کرتی ہے کہ اس کا مقصود اصلی دل و ضمیر کی تربیت و اصلاح ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَّاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ'' (البقرہ:۲۶۳)

''جس خیرات کو دینے کے بعد (لینے والے کو) ایذا دی جائے اس سے تو نرم بات کہہ دینی اور (اس کی بے ادبی سے) درگزر کرنا بہتر ہے اور خدا بے پرواہ اور بردبار ہے۔''

اس لئے کہ وہ صدقہ جس کے بعد تکلیف پہنچائی جائے اس کی کوئی ضرورت اور حاصل نہیں، بلکہ اس سے بہتر وہ اچھی بات ہے جو دلوں کے زخموں کو جوڑے، مندمل کرے اور خوشی و بشاشت سے شاد کرے، عفو و درگزر کرے، جو دلوں کے کینہ کو دھوڈالے اور اس کی جگہ بھائی چارہ اور دوستی ہو۔ یہ ہے حقیقی اسلام اور اس دین کی اصل روح یہ ہے کہ ''مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔

حدیث کا فقہی پہلو

آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس صفت کے ساتھ مومن جنت میں نہ داخل ہوگا یہاں تک کہ اس سے پاک کر دیا جائے، خواہ دنیا ہی میں توبہ کے ذریعہ یا اسی کے بقدر سزا کے ذریعہ یا پھر آخرت میں اللہ تعالیٰ سزا دے کر جنت میں داخل کرے۔ یا محض اپنے لطف و احسان سے معاف فرمادے جس کی تائید آیت پاک سے ہوتی ہے:

"وَنَزَعْنَا مَافِی صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ."

''اوران کے دلوں میں جو کدورت ہوگی اس کو ہم نکال کر صاف کردیں گے۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) یہ حدیث دھوکا، چالبازی، بخل، احسان جتانے والی جیسی نفسانی بیماریوں کا مداوا کرتی ہے اوراس کو معصیت کے میل کچیل سے پاک کرتی ہے تا کہ بندۂ مومن ایسے اسلامی معاشرہ کا ایک صالح جز بن سکے۔

(۲) یہ حدیث انفاق پر آمادہ کرتی ہے جو انسانی احساسات کو بلند کرتا ہے۔ اس طرح کہ اس میں خلوص کے علاوہ کوئی اور جذبہ نہ شامل ہو۔ اس کی شرافت نفس تکلیف دینے پر آمادہ نہ کرے نہ ہی مخلصانہ جذبات میں کوئی داغ لگا سکے۔

حدیث-۱۱

دورُخاپن

عن ابی هریرةؓ قال قال رسول الله ﷺ تجدون شر الناس یوم القیامة ذا الوجهین الذی یأتی هؤلاء بوجه وهؤلاء بوجه. (فتح الباری صحیح مسلم شرح نووی)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم قیامت کے دن سب سے برے حال میں اس آدمی کو پاؤ گے جو لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور۔''

یہ حدیث منافقین کی بعض عادتوں کا پردہ فاش کرتی ہے۔ دین اسلام اور دعوت اسلامی کے خلاف چلنے والی سازشوں اور تحریکوں میں منافقانہ سازش وسرگرمی سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ دعوت اسلامی کو اس منافقانہ خطرے سے ہر ملک اور ہر زمانے میں برابر سابقہ پڑتا رہا ہے۔ قرآن کریم نے منافقین کے جھوٹ اور ان کی مکاریوں پر کاری ضرب لگائی ہے اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جو کینہ و بغض، پستی وسفلہ پن پایا جاتا تھا، ان کے دل ونگاہ کی بینائی جس بری طرح ختم ہوچکی تھی، اور مسلمانوں کی صفوں میں وہ نفاق واختلاف کا بیج بونے کی کوششیں کررہے تھے۔ اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ نے منافقین کو بدترین خلائق قرار دیا ہے اور فرمایا کہ تم لوگوں میں سب سے بدترین اس شخص کو پاؤ گے جس کا شعار دورخاپن ہے۔ ایک گروہ سے ملتا ہے تو کچھ کہتا ہے اور پھر جب دوسرے لوگوں سے ملتا ہے تو کچھ اور کہتا ہے۔ یہ دورخاپن منافقین کی سب سے نمایاں صفت ہے۔ اسی وجہ سے قرآن پاک نے مسلمانوں کو منافقین کی ہر عادت سے ہوشیار رہنے کی تعلیم دی ہے۔ نفاق کی کم سے کم درجہ کی پہچان یہ ہے کہ اللہ کے نام پر مال واولاد کا لگانا اس پر بہت بھاری ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کو اللہ کے نام اور اس کی عطا کے ذکر

سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے مسجد جانے سے اس کی جان نکلتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَلَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنفِقُوْنَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُوْنَ (التوبہ:۵۴)

''اور (وہ) نماز کو آتے ہیں تو سست و کاہل ہو کر اور خرچ کرتے ہیں تو ناخوشی سے۔''

نفاق نے ایک خفیہ تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی اور اس نے مسلمانوں کی طاقت وتوانائی کا بڑا حصہ ضائع کر دیا تھا۔ اسی لئے قرآن کریم میں منافقون کے نام سے ایک سورہ نازل ہوئی۔ اس میں ان کے طریقہٗ کار اور ان کے دلوں میں چھپے ہوئے کفر سے آگاہ کیا گیا۔

إِذَا جَآءَكَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكَاذِبُوْنَ إِتَّخَذُوْا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ إِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (المنافقون:۱،۲)

''(اے محمد ﷺ) جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ بیشک خدا کے پیغمبر ہیں۔ اور خدا جانتا ہے کہ درحقیقت تم اس کے پیغمبر ہو، لیکن خدا ظاہر کئے دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے، اور ان کے ذریعہ سے (لوگوں کو) راہ خدا سے روک رہے ہیں، کچھ شک نہیں کہ جو کام یہ کرتے ہیں برے ہیں۔''

منافقین حضور ﷺ کی خدمت میں آنے تو آپ کے سامنے زبانی طور پر آپ کی رسالت کو تسلیم کرتے اور اس کی گواہی دیتے اور دل سے دور کا بھی تعلق نہ ہوتا اور نہ اللہ کی رضا مقصود ہوتی۔ اپنا اصل چہرہ چھپانے کے لئے بطور تقیہ مسلمانوں کے سامنے ایمان کا دعویٰ اور مظاہرہ کرتے۔ یہ آیت کریمہ حدیث مذکور کے بعض معانی ومفاہیم کی تشریح اور منافقین کے قلبی امراض کی نشاندہی کرتی ہے۔ چونکہ منافقین کی یہ چال نہایت خطرناک تھی اس لئے مسلمانوں کو اس سے واقف ہونا ضروری تھا تاکہ منافقین سے دوستی نہ رکھیں کہ ان کے فریب میں

پھنس جائیں اور راہ نجات سے دور جا پڑیں، اسی لئے قرآن پاک نے ان کی بہت سی صفات بیان کیں تاکہ وہ پہچانے جا سکیں، چنانچہ ایک اور آیت میں فرمایا:

وَلَوْ نَشَآءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيمَاهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ. (محمد:۳۰)

''اور اگر ہم چاہتے تو تم کو ان کا پورا پتا بتا دیتے اور تم ان کو ان کے چہرے ہی سے پہچان لیتے اور تم انھیں (ان کے) انداز گفتگو ہی سے پہچان لو گے اور خدا تمہارے اعمال سے واقف ہے۔''

منافقین کی حرکتیں ہمیں ان کی سرگرمیوں کا پتا دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی زبانی باتوں کو قرآن کریم میں بار بار ذکر فرمایا ہے، ان کی کھلی ہوئی پہچان کا بھی ذکر فرمایا ہے اور بہت کھلے ہوئے الفاظ میں بتایا ہے جو ان کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور کہیں ان کی ان ناشایستہ حرکتوں اور بزدلانہ صفات کا مذاق اڑاتا ہے۔ چنانچہ ایک آیت میں فرمایا:

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُسَنَّدَةٌ. يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ. (المنافقون:۴)

''اور جب تم ان کو دیکھتے ہو تو ان کے جسم تمہیں اچھے معلوم ہوتے ہیں اور جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو تم ان کی تقریر توجہ سے سنتے ہو ہر زور کی آواز کو سمجھیں (کہ) ان پر یہ (تمہارے) دشمن ہیں۔ ان سے بے خوف نہ رہنا۔ خدا ان کو ہلاک کرے یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں۔''

بس وہ صورتیں ہیں جو دیکھنے میں اچھی لگتی ہیں اور ان کے دعوے اور باتیں محض الفاظ اور زبانی جمع خرچ کی آئینہ دار ہیں، حقیقت سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جسم صرف دیکھنے کے اور الفاظ بے معنی اور بے شعور۔ تم ان کی باتیں سنو گے تو اس طرح جیسے کوئی لکڑی سہارے سے کھڑی کر دی گئی ہو۔ نہ اس میں کوئی جان ہے، نہ ایمان کا کوئی شائبہ۔ اور نہ اخلاص نام کی کوئی چیز ہے۔ قرآن کریم ان کی اس طرح تصویر کشی اس لئے کر رہا ہے تاکہ مسلمانوں کو ان کی فریب

کاریوں سے باخبر کردے یہ ان مکارانہ سرگرمیوں کے سبب اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور پھر مسلمانوں کے اولین لشکر اور صفوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہ چھپے ہوئے دشمن کھلے اور علی الاعلان دشمنی کرنے والوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ لہٰذا ان چھپے دشمنوں سے ہوشیار رہو۔

ذرا یہ آیت پڑھئے اللہ تعالیٰ ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ. (البقرۃ:۱۱)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔''

اور بھی ایسی آیات ہیں جو ان کی مکارانہ صفات کو کھول کر بیان کرتی ہیں۔ مثلاً:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيَاطِيْنِهِمْ قَالُوْآ اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُوْنَ. اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ. اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ. (البقرۃ:۱۴-۱۶)

''اور یہ لوگ جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں تو (ان سے) کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ہم (پیروان محمدؐ سے) تو ہنسی کیا کرتے ہیں۔ ان (منافقوں) سے خدا ہنسی کرتا ہے اور انھیں مہلت دیئے جاتا ہے کہ شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی تو نہ ان کی تجارت ہی نے کچھ نفع دیا اور نہ وہ ہدایت یاب ہوئے۔''

اس تفصیل سے آپ ﷺ کے الفاظ ''تجدون شر الناس ذا الوجھین'' کے اعجاز بیانی اور اس کے دور رس اثرات و نتائج کا پتا چلتا ہے۔

تاریخ کے مختلف زمانوں میں ہم بہت سے سیاسی قائدین کے اندر یہی دو رخا پن

دیکھتے ہیں۔ جب ووٹ لینا ہوتا ہے تو وہ اسلام کا نام لیتے ہیں اور اسلام سے وفاداری کی رٹ لگاتے ہیں لیکن جب کامیاب ہو جاتے ہیں تو اسلام مخالف سرگرمیاں شروع کر دیتے ہیں۔ انھیں آیات سے ملتی جلتی سورۂ نور کی بھی آیتیں ہیں۔ فرمایا:

يَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ۔ (النور: ۴۷، ۴۸)

''اور (بعض لوگ) کہتے ہیں کہ ہم خدا پر اور رسول پر ایمان لائے اور (ان کا) حکم مان لیا پھر اس کے بعد ان میں سے ایک فرقہ پھر جاتا ہے اور یہ لوگ صاحب ایمان ہی نہیں ہیں اور جب ان کو خدا اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ (رسول ﷺ خدا) ان کا قضیہ چکا دیں تو ان میں سے ایک فرقہ منہ پھیر لیتا ہے۔

قرطبی اس کی تشریح میں کہتے ہیں کہ دو چہروں والا اس لئے بدترین شخص ہے کہ اس کا حال بالکل منافقوں جیسا ہے کہ وہ غلط، جھوٹ اور چاپلوسی کو اپنا شعار بنا کر لوگوں میں فساد اور بگاڑ پھیلاتا ہے، اصحاب جاہ و منصب کی خوشامد میں اپنی ہی قوم و ملت کو نقصان پہنچاتا ہے۔

امام نووی ذوالوجہین کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں، دو چہروں والا وہ شخص کہلاتا ہے جو ہر پارٹی اور فرقہ کے سامنے اس کی جیسی باتیں کرتا ہے اور اس کو یہ باور کراتا ہے کہ وہ پوری طرح اس کے ساتھ ہے اور اس کے مخالف کا یہ بھی مخالف ہے۔ اس کا یہ عمل کھلا ہوا نفاق ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

منافقین کا نفاق اور ان کی مکاریاں بڑے دوررس اثرات رکھتی تھیں۔ جس کا مدنی آیات سے اندازہ ہوتا ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے سختی برتی اور مسلمانوں کو اس سے ڈرایا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ''دو چہروں والا کبھی امانت دار نہیں ہوسکتا'' ابوداؤد میں حضرت عمار بن یاسر سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا 'جس شخص کے دنیا میں دو چہرے رہے ہوں گے قیامت کے دن اس کے آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔''

(فتح الباری، ج ۱۱، ۴۵۷)

حدیث کا فقہی پہلو

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ غلط اور جھوٹ کے سلسلہ میں اپنی جماعت کی بری باتوں کو بھی کسی کے سامنے بنا سنوار کر بیان کرے مگر دوسری جماعت کی برائی اور اس کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کرے اور ہر جماعت کی دوسری جماعت کے سامنے مذمت کرے، یہ دورخا پن اور ناجائز ہے۔ بخلاف اصلاح کے جو درست و پسندیدہ ہے۔ ہر جماعت سے وہ بات کہے جس میں دوسری جماعت کی بھلائی ظاہر ہو رہی ہو اور خامیوں کے سلسلے میں ہر جماعت کی دوسری جماعت کے سامنے معذرت اور صفائی کا معاملہ کرے اور صرف اس کی خوبیوں کا تذکرہ کرے اور اس سلسلہ میں کچھ منہ دیکھی بات بھی کرنی پڑے تو جائز ہے۔ (مختصر سنن ابی داوٗد (منذری) تہذیب ابن القیم، ج ۷، ۲۱۱)

حدیث - ۱۲

کسی کے شر سے بچنے کی غرض سے اخلاق کا رویہ

عن عروة بن الزبيرؓ ان عائشةؓ اخبرته انه استاذن على النبى صلی اللہ علیہ وسلم رجل۔ قال: ائذنوا له، فبئس ابن العشيرة۔ او بئس اخو العشيرة۔ فلما دخل ألان له الكلام، فقلت له: يا رسول اللهّٰ! قلت ما قلت، ثم ألنت له فى القول؟ فقال: اى عائشة ان شرالناس منزلة عند الله من تركه او ودعه۔ الناس اتقاء فحشه۔ (فتح الباری: ج ۱۰ ص ۴۸۶۔ صحیح مسلم شرح النووی: ج ۱۶ ص ۲۱۷۔ مسند الامام احمد بن حنبل: ۶ ص ۳۸)

”حضرت عروہ بن زبیرؓ سے مروی ہے کہ ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے بتایا کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کی اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا اس کو آنے کی اجازت دے دو۔ اپنے قبیلہ کا بدترین آدمی ہے۔ یا یہ فرمایا کہ قبیلہ کا برا فرد ہے۔ لیکن جب وہ آپ کے پاس پہنچا تو آپ نے اس سے نرمی سے بات کی۔ میں نے عرض کیا اللہ کے رسول! آپ نے تو اس کے بارے میں اچھے الفاظ نہیں فرمائے۔ لیکن بات نرمی کے ساتھ کی۔ آپؐ نے جواب دیا۔ عائشہ! اللہ کے نزدیک وہ بدترین شخص ہے جس کو لوگوں نے اس کی بدکلامی اور شر سے بچنے کے لیے نظر انداز کر دیا ہو۔“

مفہوم

اسلام نے اخلاقی پہلو پر بہت زور دیا ہے۔ جائز حدود کے اندر ملنے والے کے ساتھ لطف و مہربانی، دلداری اور خوش اخلاقی برتنے کو ترجیح دی ہے۔ اس لئے کہ اخلاق جمیلہ دعوت کا بہترین ذریعہ ہیں۔ حتیٰ کہ اللہ رب العالمین نے اپنے حبوب نبیؐ کو ان الفاظ میں مخاطب فرمایا ہے:

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم: ۴) (اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو)

اس قرآنی اعزاز کا ظہور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور بڑائی کو اجاگر کرنے کے لئے مختلف

پہلوؤں سے سامنے آتا ہے۔ ایک تو یہی کیا کم ہے کہ اللہ بزرگ و برتر کی طرف سے یہ ارشاد ہو رہا ہے، پھر یہ کہ ملأ اعلیٰ میں اس کا برابر ذکر اور چرچا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس خلق عظیم کا اپنے کو اہل ثابت فرمایا۔ آپ یہ دیکھ رہے ہیں اتنا بڑا اعزاز آپ کو اللہ رب العالمین کی طرف سے مل رہا ہے اور اعزاز کی اہمیت وگرانباری کو بھی خوب سمجھ رہے ہیں۔ اور اس کی وسعت و گیرائی بھی آپ کی نظر میں ہے اور یہ محسوس کر رہے ہیں کہ دعوت کے راستے میں اس کی کیا قدر و قیمت اور تاثیر ہے۔ اسی رحمت و نرمی اور اخلاق کریمانہ کی بنا پر آپ کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ اپنے صحابہ کو اس مفہوم و معنی کے سانچے میں ڈھالیں تاکہ وہ دوسروں کے لئے منارۂ نور ہوں۔ چنانچہ ام درداء ابو درداء سے روایت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

> ''قیامت کے دن کی ترازو میں حسن اخلاق سے بڑھ کر مومن کا زیادہ بھاری اور باوزن کوئی اور عمل نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فحش گو اور بدکلام شخص سے بہت غصہ ہوتا ہے۔''

صحابہ کرام اور سلف صالحین انہیں اچھے اخلاق اور عمدہ صفات کے سانچے میں اپنے کو ڈھالتے اور اس کی جیتی جاگتی تصویر بنا کر پیش کرتے تھے اور تعلیم و تربیت کے میدان میں اس کے فوائد و اثرات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے اخلاق کی تعریف میں فرمایا: چہرہ کی بشاشت، نیک برتاؤ، ایذا رسانی سے پرہیز۔

قرآن وحدیث کو پڑھنے والا شخص یہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ حسن اخلاق دین اسلام کی نمایاں خصوصیت اور امتیاز ہے۔ اوہام وخرافات اور شرک سے پاک وصاف عقیدہ ہے۔ اس دین کی دوسری نمایاں خصوصیات پاکیزگی، صفائی ستھرائی، سچائی وانصاف پسندی، رحمت و نیکی، عہد کا پاس ولحاظ، ظلم و زیادتی، دھوکا اور فریب دہی سے روکنا ہے۔ غرض یہ کہ ان تمام چیزوں سے بچنا اور دور رہنا ہے جو دعوت کی راہ میں لوگوں کی نفرت کا سبب بنیں، لہٰذا اسی کے پیش نظر بعض وقت بدگو اور بدکردار کے ساتھ بھی اچھی طرح پیش آنا جائز و مباح ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایسا کرنا ہی مطلوب و پسندیدہ ہے۔ جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوا۔

حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں ''میری بعثت کا مقصد ہی اچھے اخلاق کی تکمیل ہے'' آپ نے ان چند الفاظ میں اپنی رسالت کا لب لباب بیان فرمادیا۔ اخلاق کریمہ کے سلسلہ میں

آپ کی بہت سی حدیثیں وارد ہیں۔

حدیث کا فقہی پہلو

(۱) حدیث سے معلوم ہوا کہ اچھے مقصد کی خاطر غیبت کرنا شرعاً جائز ہے جبکہ اس مقصد تک پہنچنے کی صورت متعین و معلوم ہو۔ مثلاً مظلوم کا ظالم کی شکایت کرنا اور اس سلسلے میں مدد چاہنا کہ منکر کو ختم کیا جاسکے۔ مفتی سے بیان کر کے فتویٰ لیا جاسکے، عدالت میں مسئلہ کو پیش کیا جائے، اور برائی سے ڈرایا جائے، اس بنا پر راویوں اور گواہوں پر جرح بھی درست ہے۔ اسی طرح وہ برا شخص جس کی ماتحتی و نگرانی میں ہے اس کو بتایا جائے تا کہ وہ اصلاح کی فکر کرے۔

(۲) اسی طرح اس شخص کی غیبت بھی درست ہے جو کھلے عام غلط کاری، ظلم اور بدعت کا ارتکاب کرتا ہو۔

(۳) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کی بدکلامی سے بچنا پیش نظر ہو، اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا جائے۔

(۴) قرطبی نے بھی کہا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ علی الاعلان برے کام کرنے اور فحش گوئی کرنے والے کی غیبت درست ہے اور اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا بھی جائز ہے تا کہ اس کے شر سے بچا جاسکے، لیکن یہ بات اسی حد تک درست ہے کہ اس میں چاپلوسی نہ پائی جائے بلکہ شر سے بچنا اور اس کو مانوس کرنا مقصود ہو تا کہ اس سے اس پر اچھا اثر پڑے۔ تاریخ میں برے لوگوں کو مانوس کر کے ان کی اصلاح کرنے کے بے شمار واقعات ہیں جو گویا اسی حدیث پر عمل کا نتیجہ ہیں۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے معلوم ہوا کہ اخلاق کریمہ اور عادات جمیلہ سے متصف ہونا مومن کامل کی علامت ہے۔

(۲) یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ امت کی اصلاح کے لئے کتنے فکر مند تھے کہ کس طرح ان کے اندر خوبیاں اور نیکیاں پیدا کی جائیں۔

(۳) حدیث سے یہ بھی جواز معلوم ہوتا ہے کہ ناسمجھوں اور بے وقوفوں سے اچھی طرح پیش آنا

یہ مطلب نہیں رکھتا کہ گھٹیا پن کو تسلیم کرلیا گیا۔ بے وقوف اور برے آدمی کے ساتھ اچھی طرح پیش آنے میں بڑا فرق ہے۔ پہلی صورت میں صبر وضبط سے کام لیکر طبیعت کے زور وزبردستی کے تقاضہ کو دبانا اور مانوس کر کے سمجھانا یا سبق دینا مقصود ہے۔ دوسری صورت بے وقوفی پر محمول کر کے اس سے چشم پوشی مقصود ہے۔

(۴) اسلام نے کلام کو جذباتیت اور نفسانیت سے محفوظ رکھنے کے لئے جو تحفظات اختیار کئے ہیں، انہیں میں سے بحث ومباحثہ کو خواہ وہ حق ہو یا باطل، حرام قرار دیتا ہے اور اس کے راستوں کو بند کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے بحث مباحثہ کو غلطی پر ہوتے ہوئے چھوڑ دیا تو اس کے لئے جنت کے کنارے ایک گھر بنایا جائے گا۔ اور جس نے اس کو حق پر ہوتے ہوئے چھوڑ دیا اس کے لئے جنت کے درمیان میں گھر بنادیا جائے گا اور جو محاسن اخلاق سے متصف ہوا تو اس کے لئے جنت کے بلند حصہ میں گھر بنایا جائے گا۔

(۵) حدیث سے شر اور برائی کو دور کرنے کے لئے نرم رویہ اختیار کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

حدیث - ۱۳

گناہوں کو چھپانے کا حکم

عن سالم بن عبدالله قال:سمعت أباهريرة يقول:
سمعت رسول اللهﷺ يقول: كل أمتي معافى
الاالمجاهرين وان من المجاهرة ان يعمل الرجل بالليل
عملاً ثم يصبح وقد ستره الله فيقول يافلان عملت
البارحة كذا كذا. وقد بات يستره ربه ويصبح يكشف
ستر الله عنه. (فتح الباری: ج ۱ ص ۴۸۶۔ صحیح مسلم ۱۱۹)

''سالم بن عبداللہؒ کا بیان ہے کہ ''میں نے حضرت ابو ہریرہ سے سنا وہ فرماتے ہیں میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میری پوری امت معاف کردی جائے گی سوائے مجاہر کے۔ مجاہر اس کو کہا جاتا ہے کہ آدمی نے رات میں کوئی گناہ کیا، اللہ تعالیٰ نے تو اس کو چھپایا اور یہ شخص صبح خود ہی لوگوں سے اپنے گناہ کو بیان کرتا پھرتا کہ میں نے رات اس اس طرح کا کام کیا۔ اللہ تعالیٰ تو اس کے اس برے فعل کو چھپا رہا تھا اور یہ خود ہی صبح کو اپنے پوشیدہ گناہ کھول دیتا ہے اور لوگوں سے بیان کرتا ہے۔''

مفہوم

اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو خیر امت کے شرف سے نوازا ہے۔ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کی معافی کی سعادت بخشی ہے۔ اس امت کے لئے زندگی کی اچھی اور پاکیزہ چیزیں پیدا فرمائی ہیں کہ وہ ان سے فائدہ حاصل کرے۔ اس سے اور لوگوں کو آرام وراحت پہنچائے تاکہ لوگ روئے زمین پر ہمیشہ انسانوں کی بہتری اور باہم معافی تلافی کے بڑھانے اور عام کرنے کے کام میں لگے رہیں۔ اور روئے زمین پر خلافت انسانی عملی شکل اختیار کر سکے۔ اس لیے اللہ کے رسول ﷺ نے امت کو ان باتوں سے منع فرمایا ہے جو خلافت کے مفہوم و معنی کو عملی جامہ پہنانے میں رکاوٹ بنتی ہوں۔ اسی لئے آپ نے فرمایا: ہماری پوری امت معاف کردی جائے گی، سوائے ان لوگوں

کے جو اپنے چھپے ہوئے گناہوں کو بھی ظاہر کر کے ڈھٹائی اور بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آپ نے ایسی حرکت کرنے والوں کو ڈرایا کہ وہ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ ان کی یہ جرأت و بے حیائی ان کو مہلت دے گی اور وہ چھوٹ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔ (العنکبوت:۴)

''کیا وہ لوگ جو برے کام کرتے ہیں یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے؟ جو یہ خیال کرتے ہیں برا ہے۔''

ایک آیت پاک سے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے علی الاعلان گناہ کرنے کی تصویر سامنے آجاتی ہے، جو کھلے عام اور بے دھڑک رذالت و بے حیائی اور انسانیت سوز حرکات میں مبتلا تھی۔ اور یہی بات اس قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بنی۔

اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزاً مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ۔ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَا اٰيَةً بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ (العنکبوت:۳۴،۳۵)

''ہم اس بستی کے رہنے والوں پر اس سبب سے کہ یہ بدکرداری کرتے رہے ہیں آسمان سے عذاب نازل کرنیوالے ہیں اور ہم نے سمجھنے والوں کیلئے اس بستی سے ایک کھلی نشانی چھوڑ دی۔''

دوسری جگہ فرمایا:

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ مُّسَوَّمَةٍ عِنْدَ رَبِّكَ وَمَاهِيَ مِنَ الظَّالِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ۔ (ھود:۸۲،۸۳)

''جب ہمارا حکم آیا ہم نے اس (بستی کو الٹ کر) نیچے اوپر کر دیا اور ان پر پتھر کی تہہ بہ تہہ (یعنی پے درپے) کنکریاں برسائیں، جن پر تمھارے پروردگار کے ہاں سے نشان کئے ہوئے تھے، اور وہ (بستی ان) ظالموں سے کچھ دور نہیں۔''

ان واقعات و تجربات کی روشنی میں جن سے پہلی قومیں اور انبیاء کرام کو واسطہ پڑا ہے، آپ ﷺ نے مناسب وضروری سمجھ کر کھلے عام گناہ کرنے والوں کے اس عمل کو نہایت برا بتایا

اوراس سے سختی کے ساتھ منع فرمایا تا کہ امت محمدیہ، اپنے خیرامت اورامت وسط ہونے کے شرف پر قائم رہے اگر بھول چوک سے کسی بندۂ مومن سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو قرآن کریم نے اس کا یہ علاج بتایا ہے:

وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِّنَ اللَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ۔ (ھود:۱۱۴)

''اوران کے دونوں سروں (یعنی صبح وشام کے اوقات میں) اوررات کی چند (پہلی) ساعات میں نماز پڑھا کرو کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کودور کردیتی ہیں۔''

پھر جب دوبارہ غلطی کر بیٹھے اور گناہ ہوجائے تو اس گناہ کو بیان نہ کرے بلکہ چھپائے۔ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا:''اذابلیتم فاستتروا'' (جب کسی گناہ میں مبتلا ہوجاؤ تواس کو چھپاؤ)۔مگر ایسا انسان جودن دہاڑے لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے، اسلامی قدروں اور پیمانوں کو خاطر میں نہیں لاتا،محرمات کی پردہ دری کرتا ہے،اس کی شرم وحیااور ایمان والے حرام کام کرنے سے اس کوروکتے نہیں، حدیث پاک میں ایسے شخص کومجاہر کھلے عام گناہ کرنے والا کہا گیا ہے۔ جوشخص اس طرح کھل کرنافرمانی کرتا ہے بیک وقت دوگناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ایک گناہ کا کرنا دوسرے اس کو مذاق بنالینا، حیاوشرم سے بالکل خالی ہوجانا) لہٰذا اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ شرعی قانون کے مطابق بے حیائی کی باتوں کے علم میں آنے پراس شخص پرحد جاری کرے اور یہ حد کھلے عام سب کے سامنے جاری کی جائے (تا کہ دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو۔ اسلامی قانون رجم (زنا کے مرتکب کوپتھروں سے اتنامارنا کہ وہ مرجائے) کوڑے لگانا، قید کردینا،شہر بدر کردینا غرض کہ جیسا جرم ہوویسی سزادی جائے تا کہ اسلامی معاشرہ ہرعیب اورشرم کی بات سے پاک اورمحفوظ ہو۔

گناہوں کو چھپانے کے سلسلے میں ایک حدیث ایسی وارد ہوئی ہے جو بخاری کی شرط پر نہیں ہے وہ حدیث ہے ابن عمررضی اللہ عنہ کی، جس کوانھوں نے مرفوعاً بیان کیا ہے، حدیث یہ ہے:

اجتنبوا هذه القاذورات التی نهی اللّٰهعنها فمن الم بشئ منها فليستتر بسترالله۔

''ان گندی باتوں سے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا بچواور جوشخص ان باتوں میں

سے کسی بات کا مرتکب ہو جائے تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈالا ہے یہ بھی اس کو چھپائے لوگوں سے بیان نہ کرے۔"

حاکم نے بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے اور موطا میں حضرت زید ابن اسلم سے مروی ہے کہ ابن بطال کہتے ہیں کہ کھلے عام گناہ کرنا، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کی مصلحت عامہ کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ اس میں ایک طرح کی سرکشی پائی جاتی ہے۔ گناہ کو چھپانے، سے اللہ، اللہ کے رسول اور مصالح عامہ کا مذاق اڑانا ظاہر نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ گناہ گناہ کرنے والے کو ذلیل کر دیتا ہے، اگر گناہ ایسا ہے کہ اس پر حد جاری ہو تو اس سے رسوائی ہوتی ہے۔ اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے حق کا خیال رکھے گا جو سارے کرم کرنے والوں سے زیادہ کرم کرنے والا ہے، اس کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔ تو یہ کریم آقا جب دنیا میں اس گناہ کو چھپائے گا تو آخرت میں بھی چھپائے گا اس کو رسوا نہ فرمائے گا لیکن جو شخص علی الاعلان گناہ کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے اس کرم سے محروم رہے گا۔ (فتح الباری: ج ۱۰ ص ۴۸۷)

حدیث کا فقہی پہلو

جو شخص کھلے عام گناہ کرتا ہے یا اپنے کئے کو بیان کرتا ہے، وہ اچھے اور غیر سنجیدہ لوگوں میں شمار نہیں ہوگا۔ ایسا شخص سماج اور معاشرے میں بھی سخت ناپسندیدہ ہے اسلامی شریعت کی نگاہ میں بھی۔ امام نوویؒ نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا کہ جس شخص نے اپنی بدکرداری کو ظاہر کیا یا دین میں کوئی نئی بات پیدا کی تو پھر اس کا تذکرہ دوسروں سے کرنا جائز ہے اس لئے کہ اس نے تو خود ہی اس کا اعلان کر دیا ہے، ہاں جس عیب کو اس نے نہ ظاہر کیا ہو اس کا لوگوں سے بیان کرنا درست نہیں۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث ان لوگوں پر سخت نکیر کرتی ہے جو اپنے گناہوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۲) حدیث زمانۂ جاہلیت کے بچے کھچے اثرات، پرانی بری عادتوں اور فحش باتوں سے روکتی ہے اور شرم وحیا اور پاکدامنی کی تربیت دیتی ہے۔

حدیث - ۱۴

والدین کی نافرمانی

عن المغيرة بن شعبة عن النبی ﷺ قال: ان الله حرم عليكم حقوق الامهات، ومنعاً وهات ووأدالبنات وكره لكم قيل وقال، وكثرة السؤال واضاعة المال.
(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

''حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے مروی ہے حضور ﷺ نے تم پر ماؤں (والدین) کی نافرمانی، اپنے ذمہ جو حقوق ہیں ان کی ادائی میں کوتاہی اور جس چیز کا تمھیں حق نہیں ہو اس کو مانگنے اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کو حرام فرمایا ہے۔ بلا وجہ سوال کرنے اور بہت زیادہ سوال کرنے اور مال کو ضائع کرنے کو ناپسند فرمایا ہے۔''

مفہوم

یہ حدیث بندۂ مومن کے بلند مقام اور کردار کو افق اعلیٰ یعنی حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ (جن کی تربیت خود اللہ رب العالمین نے فرمائی ہے اور خوب فرمائی ہے جس کی گواہی خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پاک میں یہ فرما کردی ہے کہ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم: ۴) (اور بے شک اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو) کی روشنی میں اسلام اور قرآن کے افق اعلیٰ پر پیش کرتی ہے۔ آپ ﷺ آخری درجے کی یہ خواہش رکھتے تھے کہ اپنی امت کی تربیت قرآن کریم کے بیان کردہ ''خلق عظیم'' کے معیار پر فرمائیں۔ آپ اپنی جماعت کی تربیت ،فضیلت و برتری اور عمدہ اخلاق کی بنیاد پر کریں، اور اس حدیث میں ہم آخری درجے کی بلندی، دعوت کی خوبی اور مقصد کی وہ پاکیزگی پاتے ہیں، جس کی اسلام مختلف ذرائع سے تاکید کرتا ہے، جس میں سب سے نمایاں ماں کی خدمت، اس کا احترام اور ماں باپ دونوں کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ اس

لئے کہ اسلامی معاشرہ عقیدہ کی درستی کے بعد جس بات میں سب سے زیادہ ممتاز ہے، وہ اس کا خاندانی اور گھریلو نظام ہے۔ اسی لئے سب سے پہلے والدین کی نافرمانی سے روکتا ہے اور ان کی نافرمانی کو کبیرہ گناہوں میں شمار کرتا ہے۔ اور زبان نبوت سے ادا ہونے والے ''ان اللّٰہ حرم علیکم عقوق الامھات' 'الفاظ اس خوبی سے ادا کئے گئے ہیں کہ اولاد کے دل میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور مہربانی کا جذبہ شوق پیدا فرما دیں۔ یہ اس لئے کہ زندگی کا سفر زندوں سے جاری ہے اسی لئے وہ ان کو آگے بڑھنے کے فکر و اہتمام کی طرف پورے زور کے ساتھ توجہ دلاتی ہے۔ اس لئے مادہ پرستانہ زندگی تعلق پدری کی طرف بہت کم توجہ دیتی ہے۔ اسی لئے زبان نبوت کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ بندۂ مومن کے جذبات کو پوری طاقت کے ساتھ ابھارے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ''حرم'' کا لفظ استعمال فرمایا اور اسکے بعد ''عقوق'' کا لفظ لائے اور اس کو (یعنی والدین کی نافرمانی کو گناہ کبیرہ میں شمار فرمایا) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: گناہ کبیرہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک اور والدین کی نافرمانی اور یمین غموس ہے۔

حدیث میں ماں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ام (ماں) کا لفظ لا کر اس کی اہمیت وعظمت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ معنی کے اعتبار سے اس سے ماں باپ دونوں ہی مراد ہیں۔ اس لئے کہ اولاد کی پرورش میں دونوں تکلیف اٹھاتے ہیں اور فطری طور پر دونوں ہی اولاد کی دیکھ بھال دلی محبت کے ساتھ کرتے ہیں اور ان پر ہر چیز قربان کرنے کے لئے حتیٰ کہ جان تک نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مگر بچے ماں باپ کی اس قربانی کو بہت جلد بھول جاتے ہیں، اور بیوی، اپنی اولاد یعنی نئی نسل کی طرف ان کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ اور اس نئے خاندان کو وہ ہر اعتبار سے اولیت دیتے ہیں۔ ماں باپ پر اس کو مقدم رکھتے ہیں۔ مثلاً اس سے انس ومحبت، عزت وتکریم ہر طرح کے ایثار وفدائیت کا معاملہ کرتے ہیں، ان ساری باتوں اور بشری کمزوریوں کے پیش نظر والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم خدائی فیصلہ کی صورت میں آتا ہے جو تاکیدی فرمان کا درجہ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً إِمَّا

يَبۡلُغَنَّ عِنۡدَكَ الۡكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوۡ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنۡهَرۡهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوۡلًا كَرِيۡمًا ۔ وَاخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِىۡ صَغِيۡرًا

(بنی اسرائیل: ۲۳، ۲۴)

''اور تمھارے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمھارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہنا اور نہ انھیں جھڑکنا اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا اور عجز و نیاز سے ان کے آگے رہو اور ان کے حق میں دعا کرو کہ اے پروردگار ان پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے مجھے بچپن میں رحمت وشفقت کے ساتھ پالا تھا۔''

''اگر تمھارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔'' بڑھاپے کا معاملہ بالکل الگ ہے، بڑھاپے کی عظمت وشان، اس کے تقاضے اور اس کے احساسات جلد متاثر ہونے کی کیفیت، جوانی کے احساسات سے جداگانہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا لڑکے کو ان کی نزاکتوں کو سمجھنا چاہیے۔ اور حسن سلوک اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ فرماں بردار بیٹا محترم والدین سے پورے ادب ولحاظ کے ساتھ بات کرے، لڑکے سے کوئی ایسی بات نہ سرزد ہو جس سے اکتاہٹ اور بے رخی کا مظاہرہ ہو، یا اس میں توہین و بے ادبی کا شائبہ پایا جاتا ہو۔

ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا۔'' یہ ادب کا اعلیٰ درجہ ہے کہ ماں باپ سے گفتگو کے انداز میں ادب و تعظیم کی ادا پائی جاتی ہو۔

''عجز و نیاز سے ان کے سامنے جھکے رہو۔'' ان الفاظ میں ان کے ادب ولحاظ کو نہایت لطیف انداز میں بیان کیا گیا ہے، جو دل کے پردوں پر دستک دیتا اور احساسات محبت کو بیدار کرتا ہے۔ رہی دوسری بات جس کی طرف حدیث رہنمائی کرتی ہے کہ بندہ مومن کی شخصیت بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ وہ خاموش، باوقار، کم بات کرنے اور سوال میں اصرار کرنے اور بلا وجہ کی باتوں سے دور رہنے میں اوروں سے ممتاز ہوتا ہے۔

''منعاً وھات'' روکنا اور طلب کرنا یعنی خود پر جو حقوق واجب ہیں ان کے ادا کرنے سے پہلو تہی کرنا اور جس کا اسے حق نہیں پہونچتا اسے مانگنا، آیت پاک ویمنعون الماعون برتنے کی چیزیں عاریۃً نہیں دیتے۔ اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ حافظ کہتے ہیں: روکنے کا مطلب جس چیز کے دینے کا اسے حکم دیا گیا ہے اسے روکنا اور جس کا اسے حق نہیں پہنچتا اسے مانگنا یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ مطلق سوال ہی سے روکا گیا ہو، جس کا ذکر یہاں اس کے مدمقابل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ (فتح الباری۔ ج ۱۰ ص ۴۰۷۔)

یہ حدیث بلند اقدار، فضل وشرف، گھٹیا اور رذیل باتوں سے دوری اور ایسی متعدد صفات اور آداب بیان کرتی ہے جن کا اپنانا بندۂ مومن کے لیے ضروری ہے۔ کچھ مالی ذمہ داریاں ہیں کچھ معاشرتی حقوق اور خاندانی فرائض ہیں جن کو اچھی طرح ادا کرنے کا بندۂ مومن میں شوق وجذبہ ہونا چاہئے تاکہ وہ گھر، خاندان میں دوسروں کیلئے نمونہ ہو۔

انھیں ناپسندیدہ باتوں اور بری عادتوں میں زمانۂ جاہلیت میں بعض عرب قبیلوں میں لڑکیوں کو زندہ دفن کردینا بھی تھا، بعض لوگ تو شرم کی وجہ سے دفن کردیتے اور بعض لوگ محض بے وقوفی اور جہالت کی وجہ سے دفن کرتے تھے، مثلاً ایک یہی بیوقوفی کی بات فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا الْمَوْؤُدَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ۔ (التکویر: ۸،۹)

اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنادی گئی ہو پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی۔

اور ایمسکه علیٰ هون أم یدسه فی التراب ألا ساء ما یحکمون (فتح الباری: ج ۱۰ ص ۴۰۷۔) کہ آیا ذلت برداشت کرکے لڑکی کو زندہ رہنے دے یا اسے زمین میں گاڑدے، دیکھو یہ جو تجویز کرتے ہیں بہت بری ہے۔ اس میں عربوں کی دو قسمیں تھیں ایک قسم تو عار کی وجہ سے اور ایک فقر کے ڈر سے لڑکیوں کو قتل کردیتی تھی اور ایک قسم ایسے لوگوں کی تھی جو اس بری اور گھناؤنی عادت سے دور رہتی تھی۔ (ایضاً)

حدیث میں (قیل وقال) فضول باتیں کرنے کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔ جوہری کا کہنا ہے کہ حدیث سے بہت زیادہ بات کرنے کی ممانعت کا اشارہ ملتا ہے کہ ایسی صورت میں

غلطی کا امکان ہے۔ اس کو مکرر لانے سے ممانعت میں شدت وتاکید پیدا کرنا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ فلاں نے یہ کہا اور جواب میں یہ کہا گیا۔ ممانعت کثرت کلام کی مقصود ہے جس کی حدیث صحیح ''کفی بالمرء إثماً أن یحدث بکل ماسمع۔'' (آدمی کے گناہ کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہر سنی ہوئی بات کو بیان کرے) ایسے ہی آپ کے ارشاد کہ'' إنما الدنیا قیل وقال '' (دنیا نام ہے فضول گوئی کا) سے تصدیق ہوتی ہے۔

یہ ناپسندیدہ باتیں اور عادتیں اس بندۂ مومن کے شایان شان نہیں جو خلافت ارضی یعنی دنیا کو آباد کرنے کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ اس پر بہت سے فرائض وواجبات کی ذمہ داری ہے جو وقت سے زائد ہیں، پھر بندہ مومن کو فرصت کہاں کہ مہمل ولغو باتوں میں لگے۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان صفات کے شروع میں جن سے بندہ مومن نمایاں وممتاز ہوتا ہے فرمایا:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْناً وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَاماً (الفرقان:۶۳)

''اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں۔''

دوسری آیت میں فرمایا:

وَاِذَا سَمِعُوْا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِيْنَ (القصص:۵۵)

''اور جب بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو ہمارے اعمال اور تم کو تمھارے اعمال، تم کو سلام، ہم جاہلوں کے خواستگار نہیں ہیں۔''

بندہ مومن اپنی ان مومنانہ صفات کے سبب جس اسلامی عقیدہ پر یقین رکھتا ہے، اس کا نمائندہ اور ترجمان ہوتا ہے اس کی زندگی کے شب وروز اور اس کا عمل وکردار اسلام کا ایک روشن وتابندہ ورق ہوتا ہے جو لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگ اس کو عملی طور پر آئینہ حقیقت نما میں دیکھتے ہیں اور اس کو اپنے درمیان اسلام کی اصل تصویر پاتے ہیں، ان کے دلوں کو اپنی پیروی کی

طرف کھینچتا ہے۔

آپ ﷺ اس حدیث پاک میں بندۂ مومن کی ہمہ گیر شخصیت کو بیان فرماتے ہیں جس کا ایک نمایاں وصف خواہ مخواہ بہت زیادہ سوال کرنے سے روکنا ہے۔

لوگوں کے حالات اور پیش آنے والی باتوں کے بارے میں سوال کرنا یا کسی آدمی کا کسی کے بارے میں بار بار سوال کرنا کہ اس کے حالات کی جزئیات وتفصیلات معلوم ہوں، عام حالات میں یہ بات اس شخص کو ناگوار ہوگی جس کے بارے میں یہ سوالات کئے جا رہے ہیں۔اور حدیث سے مبہم ومحال باتوں کے بارے میں سوالات کی ممانعت ثابت ہو چکی ہے۔اس کی تخریج ابوداؤد نے حضرت معاویہؓ کی حدیث سے کی ہے اور یہ بات تو تمام سلف سے ثابت ہے کہ ایسی باتوں کے بارے میں سوال جن کا عادۃً پیش آنا محال ہو یا بہت کم پیش آتی ہو، ناپسند ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جہاں تک کثرت سے سوال کا معاملہ ہے تو اس سے مراد مسائل پیدا کرنے سے روکنا ہے۔ (فتح الباری: ج۱۰ ص ۴۰۷)

اور جو بات پیش نہیں آئی ہے اور اس کی ضرورت بھی نہیں، اس کے بارے میں کثرت سے سوال کرنا جبکہ احادیث صحیحہ میں اس سے ممانعت وارد ہوئی ہے۔اسلاف اسے ناپسند کرتے تھے اور ان چیزوں میں شمار کرتے تھے جن کے کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے اور یہ ان تحفظات میں سے ہے جن کو اسلام نے مومن کو عیش کوشی وتن توشی سے بچانے کے لئے کیا ہے اور بے جا مباحثہ سے روکا اور اس کے دروازوں کو بند کیا ہے۔

حدیث کا ایک حصہ ہے مال کا ضائع کرنا۔یعنی بلاضرورت مال کا خرچ۔حافظؒ کہتے ہیں کہ اکثر علماء نے اس سے فضول خرچی مراد لیا ہے، بعض علماء نے اس کو محل حرام میں خرچ کرنے کیساتھ مقید کیا ہے اور زیادہ درست بات یہ ہے کہ شرعاً جس جگہ مال خرچ کرنے کا حکم ہے یا اجازت ہے خواہ وہ دینی ہو یا دنیاوی اس کے علاوہ جگہ میں خرچ کرنا اضاعت مال کہلائے گا، جو منع ہے۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مال کو بندوں کی ضرورت، پوری کرنے کے لیے بنایا ہے اور فضول خرچی کرنے سے یہ ضرورت فوت ہو جاتی ہے۔ چاہے ضائع کرنے والے کی ضرورت فوت ہو رہی ہو یا دوسرے کی ضرورت فوت ہو رہی ہو۔اس میں نیکی کی راہوں میں خرچ کرنا نہیں شمار

ہوگا جس سے ثواب آخرت حاصل کرنا مقصود ہو جبکہ یہ خرچ کسی دوسرے اخروی حق کو فوت نہ کر رہا ہو۔ (شرح صحیح مسلم: ج ۱۲/ص ۱۱)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ إِذَآ اَنفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذَالِكَ قَوَاماً (الفرقان:٦٧)

''اور وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اڑاتے ہیں اور نہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں بلکہ اعتدال کے ساتھ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔''

یہ ہے اسلام کی خوبی جس کو وہ فرد و جماعت دونوں کی زندگی میں پیدا کرتا ہے اور تربیت و قانون سازی میں اس کی طرف زور دیتا ہے تا کہ اسلام کی پوری عمارت اعتدال و توازن پر قائم ہو، مسلمان اپنے ذاتی مال کو بھی خرچ کرنے میں آزاد نہیں کہ جہاں چاہے خرچ کرے۔ جیسا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہے یا انسانوں کے بنائے ہوئے دوسرے نظاموں میں ہے۔ مومن فضول خرچی یا بخل (خرچ کرنے کے موقع پر کمی کرنے) دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ اپنانے کا پابند ہے۔ فضول خرچی سے نفس و مال دونوں کا نقصان ہے اور کمی کرنا بخل اور حلال مال سے فائدہ نہ اٹھانے کی علامت اور جماعت کو اس امانت سے فائدہ اٹھانے سے محروم کرنا ہے۔ اس لئے کہ مال ''كنتم خير أمة'' کے معنیٰ کو عملی شکل دینے کا ذریعہ ہے۔ اور فضول خرچی اور بخل یہ دونوں چیزیں اجتماعی اور اقتصادی نظام میں خلل پیدا کرتی ہیں۔ مال کا روکنا بہت سے مسائل پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح اس کا بے حساب خرچ کرنا بھی مشکلات پیدا کرتا ہے۔ اسلام اس پہلو کو بہت ہی باریکی کے ساتھ منظم کرتا ہے۔

حدیث کا فقہی پہلو

امام نوویؒ فرماتے ہیں: بلا ضرورت سوال کرنے کی ممانعت پر سارے علماء متفق ہیں۔ فرمایا: جو شخص کمانے پر قادر ہو، اس کے سوال کرنے میں ہمارے لوگوں کا اختلاف ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں، زیادہ صحیح اور درست بات تو یہ ہے کہ حدیث کے ظاہر کے اعتبار سے سوال کرنا حرام

ہے، دوسری صورت تین شرطوں کے ساتھ بکراہت جائز ہے۔ سوال میں اصرار نہ کرے، سوال کرنے میں اپنے آپ کو حد سے زیادہ ذلیل و پست نہ کرے۔ جس سے مانگ رہا ہے اس کو تکلیف نہ پہنچائے، اگر ان تین شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے گی تو سوال کرنا حرام ہوگا۔ (فتح الباری ج ۱۰ر ص ۴۰۸)

حافظؒ کہتے ہیں: بہت زیادہ خرچ کرنے کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ شرعاً ناپسندیدہ جگہوں پر خرچ کیا جائے ایسی صورت میں انفاق کی ممانعت میں کوئی شک نہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ شرعاً پسندیدہ جگہ میں خرچ کر رہا ہو یہ تو شریعت میں مطلوب ہے، تیسری شکل یہ ہے کہ حصول لذت کے لئے مباح جگہوں پر خرچ کرے اس کی دو قسمیں ہیں: ایک تو یہ کہ خرچ کرنے والے کے حال کے مطابق ہو اور مال کے بقدر ہی خرچ کرے یہ اسراف نہیں کہلائے گا دوسرا جو عرف کے مطابق نہ ہو، اس کی بھی دو صورتیں ہوں گی، ایک تو یہ کہ کسی نقصان کو دفع کرنے کے لئے خواہ وہ یقینی ہو یا اس کا اندیشہ ہو اس صورت میں خرچ کرنا اسراف میں شامل نہ ہوگا۔ دوسری یہ کہ اس میں سے کوئی شکل نہ پائی جاتی ہو تب خرچ کرنا جمہور کے نزدیک اسراف ہوگا۔ (فتح الباری ج ۱۰ر ص ۲۰۸)

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) یہ حدیث بندۂ مومن کو ان مکروہ اور ممنوع کاموں کے کرنے سے روکتی ہے جن میں بہت سے عوام مبتلا ہوتے ہیں۔

(۲) یہ حدیث اس بندۂ مومن کو معتدل و متوازن شخصیت کو بتاتی ہے جو بات کرنے میں نہایت احتیاط و باریکی سے کام لیتا ہے اور معاملات میں غلط کام کرنے سے بچتا ہے۔

(۳) حدیث اس بندۂ مومن کا سراپا پیش کرتی ہے جو شرف و بلندی میں اونچا مقام رکھتا ہے عبادات اور اچھے اخلاق میں نمایاں اور ایمانی زیور سے آراستہ ہوتا ہے۔

حدیث - ۱۵

صلہ رحمی کی اہمیت

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ قال: سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول: من سرہ أن یبسط لہ فی رزقہ وأن ینسألہ فی أثرہ فیصل رحمہ۔ (صحیح بخاری۔ فتح الباری: ج ۱۰ ص ۴۱۵)

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہم نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس کو اس کی خوشی ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی کی جائے اور موت کو موخر کیا جائے تو اس کو چاہئے کہ رشتوں کو جوڑے۔''

مفہوم

اس حدیث میں بعض وہ نقوش پائے جاتے ہیں، جن کو اسلامی قانون مسلم معاشرے کی اصلاح، تطہیر اور تہذیب کے بعد ابھارنا اور روشن کرنا ہے اور ان کے ذریعے ایسا ماحول اور عملی فضا بنانا چاہتا ہے جو ان نقوش کو عملی طور پر معاشرے میں اجاگر کریں۔

یہ حدیث (الفاظ کی کمی وبیشی کے ساتھ) متعدد طریق سے بیان کی گئی ہے۔ سعید مقبری کی ایک روایت میں ہے کہ راویوں نے بیان کیا کہ جس کو رزق میں کشادگی کی خوشی ہو، اور انسؓ کی روایت میں ہے کہ جو رزق میں کشادگی پسند کرتا ہو، ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے دوسرے طریقہ سے بھی روایت کیا ہے، جس میں ہے کہ قرابت داروں سے تعلق جوڑے رکھنا متعلقین میں محبت کا سبب بنتا ہے، مال کو بڑھاتا ہے، موت کو مؤخر کر دیتا ہے۔ احمد کے نزدیک ایسی سند کے ساتھ جس کے سب راوی ثقہ ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً بیان ہوا ہے کہ ''قرابتوں کا جوڑے رکھنا، پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنا، ملک وشہر کو آباد کرتے ہیں، عمروں کو بڑھاتے ہیں، یہ تمام حدیثیں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ اسلامی معاشرے کی تصویر کشی کرتی ہیں اور اس اسلامی اتحاد کو پیش کرتی ہیں جس کو خود اس کے مالک ورب نے بنایا ہے اور جو خاندانی نظام اور رشتہ کی لڑی میں اس کو پروئے

رکھنے کے نہ صرف یہ اصول مقرر کرتی ہیں بلکہ دلوں میں ان تعلقات کو جوڑنے اور برقرار رکھنے کا جوش وجذبہ بھی پیدا کرتی ہیں، اور ان تعلقات کی بنیاد پر اسلامی معاشرہ میں نظم وضبط پیدا کرنے کو اہم ذریعہ قرار دیتی ہیں۔ جو ایک خاندان کے اندر کمزوروں کی کفالت کے ذریعہ وجود میں آتا ہے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور ﷺ سے کہا: اللہ کے رسول ﷺ آپ ہمیں کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو ہم کو جنت میں داخل کردے۔ اس کا سوال سن کر لوگوں نے کہا اس کو کیا ہو گیا؟ اس کو کیا ہو گیا؟ جیسے لوگوں نے اس کے سوال کو سمجھا نہ ہو، اسی لئے تاکید کے لئے دوبار کہا، آپ ﷺ نے فرمایا! یہ ضرورت مند ہے (معلوم ہوتا ہے آپ کا مقصود یہ تھا کہ طالب صادق ہے) چنانچہ اس کے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا: صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، پابندی سے نماز پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو، اور صلہ رحمی کرو۔ اس کو چھوڑ دو! راوی کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے آپ ﷺ سواری پر تھے اس نے سواری روک کر سوال کیا تھا لہذا جواب کے بعد فرمایا اس کو چھوڑ دو!

یہ حدیث دلِ مومن میں خوفِ خدا، شرک سے دوری اور قرابتوں کے لحاظ کا شوق پیدا کرتی ہے تا کہ اس بنیاد پر خاندان اور مسلم معاشرہ میں باہم ایک دوسرے کی کفالت اور رحم ومحبت کا جوش وجذبہ پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآ أَيُّهَاالنَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۔ (النساء:۱)

''لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا (یعنی اول) اس سے اس کا جوڑا بنایا، پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد وعورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیئے خدا سے جس کے نام کو تم حاجت براری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو اور (قطع مودت) ارحام سے (بچو) کچھ شک نہیں کہ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے۔''

آیت بتاتی ہے کہ وہ انسانیت جو ایک ہی ذات کے منشاء وارادہ سے وجود میں آئی ہے ایک ہی رشتہ سے ملی، اور ایک ہی کڑی سے جڑی ہوئی ہے ایک ہی اصل سے نکلتی اور ایک ہی نسب کی طرف منسوب کی جاتی ہے کہ (تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا) اگر لوگ اس حقیقت پر غور

کرتے، تو اس وقت جتنے طبقاتی فرق پائے جاتے ہیں سب کمزور پڑ جاتے ہیں، جنھوں نے ایک ہی جنس کے لوگوں کو منتشر کر رکھا ہے اور ایک ہی رشتہ کے بندھنوں کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ یہ سارا فرق وانتشار خارجی پیش آنے والی دھوکے کی ٹٹیاں ہیں جن کے محبت کے رشتہ اور اس کے تقاضے پر غالب آ جانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ نہ ہی نفس کی فطری محبت اور اس کے حق کے باہم ملانے اور ایسے مالک حقیقی کے حق اور اس کے خوف پر غالب آنے کا کوئی جواز تھا، اسلام قدیمی خدائی قانون کو لے کر آیا تاکہ مدت سے گمراہی میں پڑے رہنے کے بعد انسانیت کو اس آسان وسہل حقیقت کی راہ پر لگا دے، جو حدیث میں اس طرح ادا ہوا ہے ''جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں کشادگی پیدا کی جائے اور اس کی عمر بڑھا دی جائے وہ رشتوں کو جوڑے رکھے۔''

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا جب پیدا کر چکا تو رشتہ نے (اللہ تعالیٰ سے) کہا یہ قطع رحمی کے سلسلے میں آپ کی پناہ طلب کرنے کا وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہاں۔ کیا اس پر راضی نہیں کہ میں اس سے جوڑوں جو رشتہ کو جوڑے اور اس سے کاٹوں جو رشتہ کو کاٹے۔ تو رشتہ نے کہا اے میرے آقا اس پر راضی ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا تو پھر میں ایسا ہی کروں گا۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا چاہو تو پڑھ لو!

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَتَقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ (محمد:۲۲)

''اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ توقع کی جاسکتی ہے اگر تم الٹے منہ پھر گئے تو زمین میں فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے۔''

ان آیات اور حدیث میں اسلامی قانون کے اندر خاندانی نظام کی طرف توجہ وفکر کی بڑی ہدایات ہیں جن کے بغیر مضبوط خاندانی عمارت قائم نہیں ہو سکتی تھی، متعدد کتب حدیث میں بکھری ہوئی ایسی بہت سی حدیثیں ہیں، جو اسلامی نظام کے اندر رشتہ وقرابت کا پاس وخیال کرنے کی تعلیم دیتی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: رحم (یعنی رشتہ) رحمٰن سے جڑا ہوا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''جس نے تم کو جوڑا اس سے جوڑوں گا اور جس نے تم کو کاٹا اس سے کاٹوں گا۔''

جب اسلام صلہ رحمی پر اتنا زور دیتا ہے تو اس کی کڑیوں کو مضبوط کرنے اور ان کو ان تمام

چیزوں سے بچانے کی طرف بھی توجہ دیتا ہے جو صلہ رحمی کی عمارت کو کمزور کریں، اس سے اس کا منشا یہ ہے کہ ایسی بنیادیں قائم ہوں جن سے معاشرہ کا نظام اور اس کی سرگرمیاں ترقی کریں، یعنی ایک دوسرے کے تعاون کی فضا قائم ہو۔ خاندان، جماعت، کمزوروں کے حقوق کا خیال، جماعت کے اموال کی حفاظت سبھی چیزوں کا لحاظ کیا جاتا ہو۔

حدیث کے ان سارے معانی کو عملی جامہ پہنانے میں بندہ مومن کو بڑی مشکلات اور دشواریوں سے گذرنا پڑتا ہے، ان چیزوں کو عملی شکل دینے میں وہ مجسمۂ حیرت بن کر رہ جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ایک آدمی نے حضور سے کہا: ہمارے کچھ رشتہ دار ہیں ان سے رشتہ کو جوڑتا ہوں اور وہ لوگ ہم سے قطع تعلق کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہوں اور وہ ہمارے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں ان کے برے سلوک پر میں صبر وضبط سے کام لیتا ہوں اور وہ ہمارے ساتھ گنوارپن اور جہالت کا برتاؤ کرتے ہیں، آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا اگر تم ایسے ہی ہو جیسا کہ بیان کرر ہے ہو تو گویا تم ان کو گرم راکھ کھلا رہے ہو اور تمھارے لئے ان کے خلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مددگار مقرر ہے جب تک تم اپنی اس حالت پر رہو گے وہ تمھاری حفاظت کرتا رہے گا''۔ بعض حضرات نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ تم ان کے ساتھ احسان کر کے ان کو رسوا کر رہے ہو۔ اور ان کے ساتھ اپنے کثرتِ احسان اور اس کے جواب میں ان کے برے سلوک کے سبب ان کو حقیر بنا رہے ہو اور وہ اپنے تئیں ذلت وحقارت محسوس کرر ہے ہیں۔ (فتح الباری: ج ۱۰ ص ۴۱۶)

حدیث قریبی رشتہ کے حقوق کی طرف توجہ دلاتی ہے اور اس راہ کی ساری مشکلات کے باوجود جن کا بندۂ مومن کو سامنا کرنا ہوتا ہے اقدار اور انصاف کے باقی رکھنے پر زور دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا
(النساء: ۳۶)

''اور خدا ہی کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ، اور ماں باپ اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ دار ہمسایوں اور اجنبی ہمسایوں اور رفقاء

پہلو (یعنی پاس بیٹھنے والوں) اور مسافروں اور جولوگ تمھارے قبضے میں ہوں سب کے ساتھ احسان کرو کہ خدا (احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا اور) تکبر کرنے والے بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔"

بندۂ مومن کو صلہ رحمی کے قائم رکھنے کے لئے بڑی دشواریوں اور مشکلات سے گذرنا پڑتا ہے۔ اور اس لئے کہ اسلام کے سارے ضابطے اور ہدایات ایک ہی سرچشمے سے نکلتی اور ایک ہی مرکز سے جڑتی ہیں، یہ ضابطے ایک اللہ کے مالک وخالق ہونے اور اسی کے لائق عبادت ہونے اور اس کی عبادت وخدائی میں کسی اور کو شریک کرنے کے مطلق حرام ہونے کے عقیدہ سے نکلتے ہیں، اس کے معاً بعد خصوصاً والدین کے ساتھ حسن سلوک کے حکم کو بتاتے ہیں اور عمومی طور پر قریبی رشتہ داروں پھر بالترتیب دوسرے اہل حقوق کو بتاتے ہیں، آیت مذکور میں ہم دیکھتے ہیں کہ نیکی کا حکم عزیزوں سے شروع ہوتا ہے خواہ عزیز خاص ہوں یا عام، اس کے بعد اس کا دائرہ دوسرے ضرورتمندوں تک پھیل جاتا ہے، اور اجتماعی و جماعتی نظام سے کسی قدر آزاد ہو جاتا ہے تا کہ باہمی تعاون وحسن سلوک حکومتی دائرہ میں گھر کر نہ رہ جائے ، اس لئے کہ چھوٹے چھوٹے مقامی حدود دائرے مناسب وقت ضرورت کو جلد جان سکتے ہیں اور حقیقت حال ان پر زیادہ واضح ہوسکتی ہے۔ اور اس طرح محبت وتعاون کا یہ عمل جلد اور بروقت ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کریگا اور باہمی محبت و ہمدردی کو بڑھائے گا۔ (فی ظلال القرآن: ج ۲ ص ۶۵۹، ۶۵۸)

حدیث کا فقہی پہلو

ابن تین کا کہنا ہے کہ ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صلہ رحمی کرنے والے کی عمر بڑھادی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے خلاف ہے فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (النحل: ۶۱) (پھر جب وہ وقت آجاتا ہے تو اس سے کوئی ایک گھڑی بھی آگے پیچھے نہیں ہوسکتا۔) حدیث اور اس آیت مبارکہ میں تطبیق دو طرح سے دی جاسکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ عمر زیادہ ہونے سے مراد عمر میں برکت ہے اور اس طور پر کہ اطاعت واعمال خیر کی توفیق ملتی ہے اور وہ اپنے وقت کو ایسے کاموں میں صرف کرتا ہے جو آخرت میں نفع بخش ہوں، اس کے علاوہ چیزوں میں اپنے کو ضائع کرنے سے بچاتا ہے۔ جس کی مثال وہ حدیث پاک ہے جس میں آپ ﷺ کو دوسری امتوں کے مقابلہ میں آپ کی امت کی عمر کم ہونے

کی خبر دی گئی ہے، اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو لیلۃ القدر عطا فرمائی۔ حاصل یہ کہ صلہ رحمی نیکی کی توفیق اور معاصی سے بچنے کا سبب بنتی ہے۔ موت کے بعد ان اعمال خیر کی وجہ سے اس کا ذکر خیر باقی رہتا ہے گویا کہ وہ مرا ہی نہیں، دیگر نیک توفیق کیساتھ اس کو نفع بخش علم حاصل ہوتا ہے جس سے اس کو موت کے بعد بھی فائدہ پہنچتا رہتا ہے یہ اس کے لئے صدقۂ جاریہ اور اچھا جانشین ہوتا ہے۔

دوسری صورت عمر بڑھنے کی حقیقی معنی میں ہے جو ملک الموت کے علم سے تعلق رکھتی ہے جس کی طرف آیت قرآنی یَـمْحُو اللّٰهُ مَایَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِندَهٗ اُمُّ الْکِتَابِ (الرعد:۳۹) (خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے) سے اشارہ ملتا ہے۔

ان اقوال کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تقدیر میں سے جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے۔ امام احمد کی روایت اسی سے ملتی جلتی ہے جو انھوں نے حضرت ثوبانؓ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''انسان اپنے کئے ہوئے گناہوں کے سبب رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے تقدیر کو دعا ہی بدل سکتی ہے، عمر میں زیادتی نیک عمل سے ہوتی ہے۔'' اس حدیث کو نسائی نے بھی روایت کیا ہے، ابن ماجہ نے سفیان ثوری کی حدیث بیان کی ہے، صحیح میں بھی روایت ہے کہ نیکی عمر کو بڑھاتی ہے۔ (فتح الباری: ج ۱۰ ص ۴۱۶)

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) صلہ رحمی وہ بنیادی اصل ہے جو جماعت اور خاندان کو متحد رکھتی ہے اور افراد اور متعلقین میں اطمینان و اعتماد پیدا کرتی ہے، معاملات اور وعدوں پر ایک دوسرے پر یقین و بھروسہ ہوتا ہے جس کے سبب مصائب و پریشانیوں میں سکون نصیب ہوتا ہے۔

(۲) قرآن کریم میں صلہ رحمی کی اہمیت و عظمت کو بتانے کے لئے احسان کے ساتھ ذکر فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی
(النحل:۹۰)

انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔

حدیث - ۱۶

قوموں سے مشابہت

عن ابن عمر رضی الله عنهما. قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم من تشبه بقوم فهو منهم.

(ابوداؤد، کتاب اللباس، مسند الامام احمد بن حنبل ۲/۵۰ ۔مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو امام ابن تیمیہ کی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم، ص ۲۳۶، اور ۲۳۷)

''جو شخص کسی قوم کی شکل وصورت اور رویہ اختیار کرے گا وہ اسی قوم میں شمار ہوگا۔ (قیامت میں اس کا حشر بھی انھیں لوگوں کے ساتھ ہوگا)''

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تو اس وقت وہاں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے، جن کے مردوں کی تعداد اس وقت دو ہزار سے زائد تھی، وہ تین قبیلے یہ تھے قینقاع، نضیر، قریظہ۔ اس وقت مدینہ میں عربوں میں سے اوس وخزرج آباد تھے۔ یمن سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والوں کے جتھے مختلف اوقات میں الگ الگ آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے اس الگ الگ تہذیب وشعار کے ملے جلے معاشرہ میں اپنی امت کی تربیت فرما رہے تھے، اوران کی عادت کو درست فرما رہے تھے۔ قرآن کریم اورنئی اقدار کی روشنی میں ان کے لئے نئے شعائر متعین فرما رہے تھے۔ اس تربیت کی حیثیت ان نشانوں اور اصولوں کی تھی جو مرد مسلمان کی بلند شخصیت کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ قرآن کریم اس خاکے کو واضح کرتا ہے اور ان نشانیوں کو اس طرح بیان کرتا ہے:

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُوۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِىۡ صَلَاتِهِمۡ خَاشِعُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ، وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوۡنَ. (المومنون: ۱۔۴)

''بے شک ایمان والے رستگار ہوگئے جو نماز میں عجز ونیاز کرتے ہیں اور جو بیہودہ

باتوں سے منہ موڑے رہتے ہیں اورزکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔''

یہ صفات ان مومن بندوں کی پہچان بیان کرتی ہیں، جن کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فلاح وکامیابی طے ہوچکی ہے، یہ وہ صفات ہیں جومسلمان قوم کی خصوصیات اور زندگی کے اس طرز کو بیان کرتی ہیں، جو بندہ مومن اپنا تا ہے، وہ عمدہ زندگی جو بندہ مومن کے شایانِ شان ہے۔اللہ تعالیٰ نے بندۂ مومن کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں تدریج کواوراس کو دوسروں کے لئے نمونہ بننا پسند فرمایا ہے۔بندۂ مومن کے لئے یہ نہیں پسند فرمایا کہ وہ جانوروں جیسی زندگی گزارے کہ اس کی لذتوں کا مزہ لے، بغیر کسی قید وبند کے جو چاہے کھائے پیے یا پہنے اوڑھے۔اب چونکہ روئے زمین پر بندۂ مومن کی پہچان ظاہری طور پرلباس کی خاص تربیت اوراس کا سلیقہ اور وضع قطع ہے، جس میں مونچھ اور ڈاڑھی کی درستی بھی شامل ہے۔کھانے پینے کے آداب حرام وحلال کی تمیز بھی شامل ہے اوران سب باتوں کے لئے ایسی حدود، پابندیوں، اقداراور پیمانوں کے بیان کی ضرورت تھی جواس کے لئے ضروری ہیں۔لہذا آپ ﷺ نے اس کے دوررس اثرات ونتائج کو پیش نظر رکھتے ہوئے اچھی طرح واضح فرمایا تاکہ بندۂ مومن کافروں کی شکل وصورت اور طور وطریق نہ اپنائے۔(کہ جوجس قوم کی شکل اپنائے گااس کا شماراسی میں ہوگا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ، قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ، كَذَالِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔

(الاعراف:۳۲)

''پوچھوتو کہ جوزینت (آرائش) کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں ان کوحرام کس نے کیا ہے؟ کہدو کہ یہ چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کے لئے ہیں۔اور قیامت کے دن خاص انھیں کا حصہ ہوں گی۔اسی طرح خدااپنی آیتیں سمجھنے والوں کے لئے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان کولباس وپردہ پوشی کا ضابطہ بتا کراپنی بڑی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے تاکہ اس کی انسانیت ممتاز ومحفوظ اور اس کے شرف وافضلیت کا مرتبہ بلندرہے۔اس شرفِ انسانیت کے بعد پھر بندۂ مومن کو دوسری قوموں سے عبادت، امانت، بھائی چارہ، اخلاص،

وضع قطع اور سلام وتحیت کے ذریعے خاص شعار اور طور وطریق کی تعیین کر کے بندۂ مومن کی خاص پہچان متعین فرمادی ہے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انھیں میں سے ہے'' اپنے مفہوم میں بڑی گہرائی وہمہ گیری رکھتا ہے۔ اس کے اندر مشابہت کی تمام ظاہری چیزیں آجاتی ہیں۔ اس حدیث کا کم سے کم درجہ یہ ہے ان کی شکل وشباہت کو اختیار کرنے کو حرام سمجھا جاے، جب کہ ان کی مشابہت کفر میں ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (المائدۃ:۵۱)

''جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انھیں میں سے ہوگا۔''

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے قول سے اس آیت کریمہ کی مزید وضاحت ہوجاتی ہے۔ انھوں نے کہا: جس نے مشرکین کی علاقہ میں مکان بنایا، ان کا جشن منایا، ان کے جشنوں میں شریک ہوا، انھیں کی شباہت اپنائی اور اسی حال میں مرگیا تو قیامت کے دن اس کا حشر انھیں لوگوں کے ساتھ ہوگا یہ آیات اور احادیث دین کی دو بنیادی باتیں بتاتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا دوسرے سے تعلق ہے۔ آپ ﷺ کا یہ قطعی ارشاد کہ آپ ﷺ کی امت اپنے سے پہلی قوموں کی پیروی کرے گی۔ فرمایا: تم لوگ اپنے پہلے لوگوں کی جوں کی توں پیروی کروگے، یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے سوراخ میں داخل ہوں گے تو تم بھی داخل ہوگے۔ صحابۂ کرام نے دریافت کیا اللہ کے رسول ﷺ! یہود ونصاریٰ؟ آپ نے جواباً فرمایا پھر کون؟ (اقتضاء الصراط المستقیم:۲۳۷) آپ نے پیش گوئی فرمادی کہ آپ کی امت میں یہود ونصاریٰ کا چال چلن اپنایا جائے گا جو اہل کتاب ہیں۔ اور رومیوں اور فارسیوں کی تقلید کی جائے گی جو عجمی ہیں۔

آپ ﷺ نے ان دونوں ہی کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ آپ کا یہ ارشاد پوری امت کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ تواتر کے ساتھ آپ سے منقول ہے کہ آپ کی امت میں ایک جماعت قیامت تک حق پر قائم رہے گی۔

دوسری بات جس کا اس حدیث سے پتا چلتا ہے وہ یہ کہ امت مسلمہ کے کچھ لوگوں کا اس مشابہت میں مبتلا ہونا تقدیر خداوندی ہے اور آپ کا ارشاد اس مشابہت وپیروی سے منع کرنے اور ڈرانے کے لئے ہے تاکہ بندۂ مومن غیر مسلموں کی مشابہت اختیار کرنے اور ان کی پیروی کرنے سے بچے اور کتاب وسنت پر جمارہے، اس سلسلے میں سلف صالحین کی پیروی کرے۔ آپ ﷺ نے

مختلف مناسبتوں اور مواقع سے غیر مسلموں کی مخالفت کا احساس وشعور بیدار فرمایا ہے۔

عقیدہ میں مشابہت اپنانے کی ممانعت

ابو واقد لیثی سے روایت ہے کہ جب حضور ﷺ حنین کے لئے نکلے تو مشرکین کے ایک درخت سے گزر ہوا جس کو ''ذات انواط'' کہا جاتا تھا۔ مشرکین اس درخت پر اپنے ہتھیار لٹکایا کرتے تھے (یہ دیکھ کر) صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ ہمارے لئے بھی ''ذات انواط'' (نواط ایک خاص درخت کو کہا جاتا ہے) بنا دیجئے جیسے ان کے لئے ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ! یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا۔ ہمارے لئے بھی ایک خدا ایسا ہی بنا دیجئے جیسے ان کے خدا ہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم یقیناً اپنے سے پہلوں کے طریقہ کو اپنا کے رہو گے۔ یہ حدیث حسن وصحیح ہے۔

(تحفۃ الاحوذی: م ۶ ص ۴۰۸)

ابن بطال نے کہا کہ آپ ﷺ نے مطلع کر دیا کہ آپ کی امت کے لوگ بھی بدعات اور نئی چیزوں کو اپنائیں گے اور خواہشوں کی پیروی کریں گے۔ جیسا کہ پہلی امتوں نے کیا ہے۔ دین اپنی اصل شکل میں خاص لوگوں میں باقی رہے گا۔ میں نے کہا کہ جن باتوں سے آپ ﷺ نے ڈرایا تھا ان میں سے بہت سی باتیں پیش آ چکی ہیں، جو نہیں پیش آئی ہیں وہ بھی آ کے رہیں گی (فتح الباری شرح بخاری کتاب الاعتصام۔ ص ۳۰۱)۔ علماء سلف نے اس حدیث کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا اور مسلمانوں کو غیر قوموں کی ان تمام چیزوں میں مشابہت اختیار کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے سے منع کیا تھا جن کو آج مسلمان اختیار کر رہے ہیں۔

عبادت میں مشابہت اختیار کرنے کی ممانعت

امام احمد نے حضرت ابن عباس ؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: عاشورا کے دو روزے رکھو اور اس میں یہود کی مخالفت کرو (اس طرح) کہ اس سے ایک دن پہلے یا ایک ایک دن بعد بھی روزہ رکھو (مسند الامام احمد۔ ج ا ص ۲۴۱)

غیر قوموں کی ہر چیز میں مخالفت کی یہ کھلی ہوئی دلیل ہے۔ ''غور کیجئے کہ جب عاشورہ جیسے فضیلت والے دن جس دن کا روزہ گذشتہ پورے سال کا کفارہ بن جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے

اس دن روزہ رکھا بھی ہے اور رکھنے کا حکم بھی دیا ہے۔ اس کی ترغیب بھی دی ہے لیکن جب آپ کی وفات سے کچھ دنوں پہلے آپ سے کہا گیا کہ اس دن یہود ونصاریٰ بھی تعظیم کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا دوسرے دن کا بھی روزہ رکھ کر ان کی مخالفت کرو۔ اور آپ نے خود بھی پختہ فیصلہ کرلیا کہ آئندہ اسی پر عمل فرمائیں گے۔ (اقتضاء الصراط المستقیم۔ص ۲۴۹)

امت مسلمہ کی تربیت کے نبوی طریقے کی یہ زندہ جاوید مثالیں ہیں کہ مشرکین اور یہود ونصاریٰ کی مخالفت کی جائے عقیدے میں بھی، عبادت میں بھی، اور اسلامی خصوصیات میں بھی، تاکہ وہ عقیدہ وعبادت اور اپنے ضابطہ حیات، عادات ہر چیز میں دوسری قوموں سے نمایاں ہوں۔

لباس میں مشابہت

لباس اور ظاہر میں مشابہت اختیار کرنا اندرونی محبت دوستی کی صورت ہے، جس سے ان لوگوں سے تعلق اور لگاؤ کا پتا چلتا ہے لہذا مسلمان اگر غیر مسلموں کی صورت اپناتا ہے خواہ وہ لباس میں ہو یا عادات اور طور وطریق میں، تو وہ گویا ان غیروں کے شعار وعادات کی برتری کے احساس کا نتیجہ ہوتا ہے، بہت سے ان یہود ونصاریٰ کو جنھوں نے مسلمانوں کے ماحول میں زندگی گزاری ہے، ان کے ساتھ رہے سہے ہیں۔ دوسرے یہودیوں اور نصرانیوں کے مقابلے میں ان کے کفر میں شدت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جن مسلمانوں نے یہود ونصاریٰ کے ماحول ومعاشرت میں زندگی گزاری ان کا ایمان دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں کمزور ہوتا ہے، ظاہری بود وباش بھی تعلق اور لگاؤ پیدا کردیتا ہے۔

حدیث مذکور کہ ''جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ اسی میں سے ہے'' لباس اور ظاہری مشابہت کے بارے میں زیادہ واضح ہے اسی بنیاد پر بعض علماء نے غیر مسلموں کے حلیے میں سے بہت سی چیزوں کو ناپسند قرار دیا ہے۔ محمد بن ابی کا بیان ہے کہ امام احمد سے ''سندی'' جوتے کے بارے میں پوچھا گیا...... تو اس کو مرد وعورت دونوں ہی کے لئے ناپسند فرمایا اور کہا: اگر وہ استنجا خانہ کے لئے استعمال کیا جائے، صرار (جو عجمیوں کا ایک قسم کا جوتا ہوتا ہے، سے منع کیا کہ) یہ عجمیوں کا شعار ہے۔ (اقتضاء الصراط المستقیم۔ص ۲۳۹)

خلال نے احمد بن ابراہیم دورقی کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ہم نے سعید بن عامرؒ سے بغیر بال والے جوتے پہننے کے بارے میں معلوم کیا، فرمایا: تمھارے نبی کا پہناوٴ

ہندوستان کے بادشاہ ''باکھن'' کے پہناوے سے زیادہ ہم کو پسند ہے۔ اگر مدینہ کی مسجد میں ہو تو لوگ اس کو مدینہ سے نکال دیں گے۔ (اقتضاء الصراط المستقیم۔ ص ۲۴۷، ۲۴۸)

کپڑے کا ٹخنوں سے نیچے لٹکانا بعض لوگوں کے ساتھ مخصوص تھا، اسی لئے اسلام نے اس کی تقلید سے روکا ہے۔ حضرت سالم بن عبد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: ''جس نے تکبر کی وجہ سے اپنے ازار کو ٹخنے سے نیچا رکھا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نہ دیکھے گا'' حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا اللہ کے رسول ﷺ! ہمارے ازار کا ایک حصہ نیچا ہو جایا کرتا ہے الا یہ کہ برابر دھیان رکھوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو بر بنائے تکبر ازار کو نیچا رکھتے ہیں۔ (فتح الباری۔ م۱۰ کتاب اللباس۔ ص ۲۵۴)

لباس کی مختلف صورتیں واضح ہو جانے اور مباح قسموں کو اختیار کرنے کے جواز کو صاف صاف بیان کرنا ضروری ہے کہ اس میں کوئی اشتباہ نہ باقی رہے، اس سلسلہ میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، جو مستحب اور قابل ترجیح کو کھول کر بیان کرتی ہیں۔ ان میں سے یہاں ہم کچھ کا ذکر کریں گے تا کہ اس میں اشتباہ کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

مثلاً مردوں اور عورتوں کا فرق چونکہ ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے مطلوب ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو مردوں کی صورت بناتی ہیں ایسے ہی ان مردوں پر لعنت فرمائی ہے، جو عورتوں کی شکل اختیار کرتے ہیں، اور فرمایا کہ ان کو اپنے گھروں سے نکال دو مخنث کے جلاوطن کرنے کا حکم دیا جب کہ وہ مرد ہو اور ظاہر میں اپنی اصل جنس کے علاوہ دوسری شکل اپنائے۔ (اقتضاء الصراط المستقیم۔ ص ۲۴۷، ۲۴۸)

لباس چونکہ مشابہت کی بہت کھلی ہوئی صورت ہے۔ اس لئے اسلام نے مباح لباس کی وضاحت کر دی ہے اور مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے جو چیزیں منع ہیں، ان کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔

ریشمی لباس کے بارے میں اسلام کا حکم

نافعؒ حضرت عبداللہؓ سے روایت کرتے ہیں ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ریشمی دھاری کا جوڑا بکتے دیکھا تو عرض کیا اللہ کے رسول! اگر آپ اس کو خرید لیتے تو وفود سے ملنے کے وقت اور جمعہ کے دن اس کو زیب تن فرماتے، آپ ﷺ نے فرمایا اس کو وہ پہنتا ہے، جس کا آخرت میں کوئی

حصہ نہیں۔ (صحیح البخاری حاشیہ السندی۔ ج ۳ ص ۳۲)

یہ وہ نبوی تربیت ہے جو لباس اور ریشم کے سلسلہ میں نئے مفہوم رکھتی ہے، بہت سے مخفی اور پوشیدہ معانی کو بیان کر دیتی ہے۔ بہت سی چیزیں جو ذاتی استعمال کے لئے نہیں ہدیہ کی جاتیں ہیں بلکہ ان سے دوسرے طریقے سے فائدہ اٹھانا مقصود ہوتا ہے وہ ہدیہ کی جاتی ہیں اور بیچ دی جاتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لباس عورتوں کے لئے مناسب ہوتا ہے مردوں کے لئے اس کا استعمال ممنوع ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس ریشمی جوڑے کو اسے مکہ میں رہنے والے ایک مشرک بھائی کو ہدیہ کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے جن صاحب کو ہدیہ کیا تھا وہ ان کے ماں جائی بھائی تھے۔ نسائی میں بہت واضح طور پر آیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا نام عثمان تھا۔ آپ ﷺ مختلف انداز میں ذہن سازی اور کھول کر بیان کر کے امت مسلمہ کے امتیاز و تشخص کو برابر نمایاں فرماتے رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا: حضور ﷺ نے مجھ کو سونے کی انگوٹھی ریشمی کپڑا اور سرخ ریشم سے منع فرمایا ہے۔ (مختصر سنن ابوداؤد، کتاب اللباس، ج ۵ ص ۳۴)

ریشم اور سونا عورتوں کے لئے مخصوص ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ریشم لیا اور اس کو دائیں ہاتھ میں رکھا، سونا لیا اور اسکو بائیں ہاتھ میں رکھا، پھر فرمایا یہ دونوں ہماری امت کے مردوں کے لئے حرام ہیں۔ (مختصر سنن ابوداؤد للمنذری، کتاب اللباس، ج ۵ ص ۳۵)

وہ ظاہری چیزیں جو مردوں کے لئے مخصوص ہیں

آپ ﷺ نے اسلامی شعار اور امتیاز کی باریک سے باریک چیزوں کو بیان فرما کر واضح کر دیا ہے ان سب چیزوں میں یہود و مشرکین کی مخالفت مقصود تھی، تا کہ اسلام اپنے حسن و جمال، بلندی و مردانگی، وقار و دبدبہ میں معتدل ہو، سب سے الگ و ممتاز ہو، کسی بات میں کسی دوسری قوم کی مشابہت نہ پائی جائے، بلکہ لوگ حیرت سے دیکھیں اور اشارہ کریں کہ ایسا ہوتا ہے مسلمان۔ حضرت ابن عمرؓ حضور ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مشرکین کی مخالفت کرو ڈاڑھیوں کو بڑھاؤ، مونچھوں کو کترو۔'' ابن عمرؓ جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی

ڈاڑھی کو مٹھی سے پکڑتے جو بال مٹھی سے بڑھے ہوتے ان کو کاٹ دیتے۔

(صحیح البخاری بحاشیہ السندی۔ ج ۴ ص ۳۹)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو ڈاڑھی سے زینت بخشی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کا ڈاڑھی کو درست رکھنے اور اس کا اہتمام اس زینت کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے، حضرت ابن عمرؓ اس زینت کے مفہوم کو اس طرح واضح فرماتے ہیں، حضرت نافعؒ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''موئے زیر ناف کا صاف کرنا، ناخن کاٹنا، مونچھوں کا تراشنا فطرت (پیدائشی عمل) میں شامل ہے۔ (صحیح البخاری بحاشیہ السندی، ج ۴ ص ۳۵)

یہود ونصاریٰ کی مخالفت کا یہ بہت کھلا ہوا مظہر اور ثبوت ہے۔ آگے کی روایت یہود ونصاریٰ کی مخالفت اور ان کی مشابہت اختیار کرنے سے ممانعت کو مزید واضح کر دیتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''یہود ونصاریٰ اپنی ڈاڑھیوں کو رنگتے نہیں ہیں۔ تم ان کی مخالفت کرو۔ اسلام چاہتا ہے کہ اسلامی خصوصیت وامتیاز سب سے الگ اور نمایاں صورت میں رہے۔ دوسری امتوں کی تقلید نہ کرے نہ دوسری قوموں کی مشابہت اپنائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان اسلامی اقدار کو تازہ کرنے کے بڑے خواہاں تھے اور اپنی فوجوں کو عجمیوں کی مشابہت اور وضع قطع اپنانے سے ڈراتے تھے۔ ''حضرت قتادہ نے بیان کیا کہ میں نے ابو عثمان سے سنا کہ ہمارے پاس حضرت عمر کا خط آیا اس وقت ہم لوگ عتبہ بن فرقد کے ساتھ آذربائیجان میں تھے خط میں تحریر تھا کہ حضور ﷺ نے ہم لوگوں کو ریشم سے منع فرمایا ہے مگر اس طرح انگھوٹھے سے ملی ہوئی دونوں انگلیوں کی طرف اشارہ فرمایا: کہتے ہیں ہم نے اس سے یہ سمجھا کہ ان کی مراد جھنڈے سے ہے'' حضرت ابو عثمان سے مروی ہے، ہم لوگ عتبہ کے ساتھ تھے، ان کو حضرت عمر نے خط لکھا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: دنیا میں ریشم پہنا جائے گا تو آخرت میں نہیں نصیب ہوگا۔

مجاہدین کو دوسری قوموں کی مشابہت اپنانے کی ممانعت

مدینہ منورہ کی نئی نئی حکومت کے حالات میں اس نوخیز حکومت کو استحکام حاصل کرنے اور اس کی دعوت کو پھیلانے کے لئے جہاد ایک اہم رکن قرار پایا۔ مجاہدین کا مختلف قوموں اور قبیلوں سے ملنا جہاد کا ایک حصہ بن گیا تھا، لہذا اس کا یہ امکان واندیشہ تھا کہ صحرا کی زندگی گزارنے والے مجاہدین شہر کی ٹیم ٹام وہاں کے بیل بوٹوں والے خوبصورت کپڑوں کو دیکھیں تو ان کی

آنکھیں خیرہ ہوکر رہ جائیں اور ان میں بھی نقل وتقلید کا شوق پیدا ہو، گویا آپ ﷺ نے اپنی دور اندیشی سے اس اندیشہ کو پہلے سے بھانپ لیا، حضرت براءؓ سے مروی ہے کہا کہ حضور ﷺ کو ریشمی کپڑا ہدیہ کیا گیا، ہم لوگ اس کو چھونے لگے اور تعجب کرنے لگے یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم کو اس سے تعجب ہو رہا ہے؟ ہم لوگوں نے جواب دیا ہاں، آپ نے فرمایا: جنت میں سعد بن معاذؓ کے رومال اس سے بہتر ہوں گے۔ (صحیح البخاری بحاشیہ السندی)

اس حدیث سے ہمیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ انسانی نفوس کے اندر گہرائی میں پائے جانے والے امراض اور کمزوریوں کے علاج کا اسلوب اور طریقہ کار کیا ہونا چاہئے۔ گویا آپ کو معلوم ہو گیا کہ جہاد کا دائرہ کتنا وسیع ہوگا اور کیسی کیسی متمدن قوموں سے مجاہدین کو سابقہ پڑے گا جن میں ان کی جاہلی اور چال چلن اور مادی معیار اور پیمانوں کا سامنا ہوگا اور بندۂ مومن ان باتوں سے بہت بلند ہوتا ہے اس کے سامنے آخرت کی بلندیاں ہوتی ہیں وہ دنیا کو مقصود نہیں بلکہ آخرت کی کھیتی سمجھتا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَامَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجاً مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌوَّاَبْقٰى (طٰہٰ:۱۳۱)

''اور کسی طرح کے لوگوں کو جو ہم نے دنیا کی زندگی میں آرائش کی چیزوں سے بہرہ مند کیا ہے تاکہ ان کی آزمائش کریں ان پر نگاہ نہ کرنا، اور تمھارے پروردگار کی (عطا فرمائی) روزی بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔''

حضور ﷺ دنیا کے مقاصد اور مومن کی ذمہ داریوں کو اس طرح واضح فرماتے ہیں، حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا۔ بیمار کی عیادت کرنا، جنازوں کے ساتھ جانا، چھینکنے والے کا جواب دینا، ہم کو ریشم، دیباج، قسی، استبرق اور سرخ ریشم سے منع فرمایا ہے۔ (صحیح البخاری بحاشیہ السندی)

عاصم کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت علیؓ سے پوچھا قسی کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا شام یا مصر سے ہمارے پاس کچھ کپڑے آئے ان میں ریشم کی دھاریاں تھیں ان میں اترنج ریشم کی سرخ دھاری جیسی چیزیں بنی ہوئی تھیں جن کو عورتیں اپنے شوہروں کے لئے بنایا کرتی تھیں، کمان کی شکل کی اس کو وہ لوگ زرد رنگ میں رنگ لیا کرتے تھے۔ جریر نے زید کے حوالے سے روایت

کی ہوئی اپنی حدیث بیان کیا ہے کہ قسیس دھاری دار کپڑے ہوتے تھے، جو مصر سے آتے تھے ان میں ریشم ملا ہوتا تھا۔

اس طرح اسلام مسلمان کی خصوصیات کو نمایاں کرنے، اس کی پہچان کا خاکہ پیش کرنے، اس کے لباس ونشان کو بیان کرنے میں جس سے وہ دوسری قوموں کے درمیان بالکل الگ وممتاز ہو، سب سے الگ ومنفرد رہے، تاکہ لوگوں میں اس کی پہچان کا ایک معیار ونمونہ ہو، جہاد کے میدان اور اس کے مختلف شعبے مختلف قوموں اور قبیلوں کے سامنے جانے اور ملنے کا ذریعہ زیادہ بنتے ہیں اور صورت میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ مذکورہ حدیث کہ ''جس نے ان کی مشابہت اختیار کی وہ انھیں میں سے ہے'' جہاد کے بیان کے سلسلے میں آئی ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے حضورﷺ نے فرمایا: میں تلوار کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں۔ یہاں تک کہ اللہ اکیلے کی عبادت کی جائے، اس کا کوئی شریک نہ ہو، میرا رزق میرے نیزے کے سایہ میں رکھا گیا۔ ذلت ورسوائی اس کے لئے ہے جو میرے حکم کی مخالفت کرے اور جس نے کسی (اور) قوم کی مشابہت اختیار کی وہ اسی میں سے شمار ہوگا؟

(مسند الامام احمد بن حنبل، ج ۲ ص ۵۰)

اس نبوی تربیت نے صحابہ کرام کے دلوں میں بڑا گہرا اثر چھوڑا لہذا وہ اس معاملے میں بڑے ذکی الحس تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دوسری قوموں سے مشابہت کی جملہ چیزوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے، اس سلسلے میں امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بڑے روشن اور نمایاں واقعات ہیں۔

حضرت عمرؓ نے مجاہدین کو غیروں کی مشابہت سے منع فرمایا

حضرت عمرؓ کی ذات زندگی کے مختلف میدانوں میں اسلام کی ظاہری چیزوں کو نمایاں کرنے اور اس کی پوری قوت کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ وہ ذلت وکمتر کی باتوں کا کھل کر مقابلہ کرتے ہیں۔ انھوں نے ذیل کی حدیث جو شخص ہمارے طریقہ کی مخالفت کرے اس کے لیے ذلت ورسوائی طے ہے کو عملی جامہ پہنایا، مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھا، وہ اپنی فوج کو بھی بلند اسلامی اقدار کو اپنانے اور دوسروں کی مشابہت اختیار کرنے سے بچنے کی تربیت پر بڑی توجہ فرماتے تھے، وہ اپنے جنرلوں کو عین جہاد کے موقع پر خط لکھتے تھے کہ دوسروں کی خوبو، وش اور مشابہت اختیار

کرنے سے بہت دور رہیں، ہر حال میں اسلامی اقدار پر جمے رہیں اور اسلامی شکل وصورت اختیار کرنے میں فخر محسوس کریں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں سنت نبوی کو نمایاں کریں، اور اس پر عمل پیرا رہیں۔

عثمان نہدی حضرت عمرؓ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ازار پہنو، چادر اوڑھو، جوتے پہنو، موزے اور پاجامے چھوڑ دو۔ رکاب بھی نہ استعمال کرو بلکہ گھوڑوں پر اچھل کر سوار ہو، (مراد یہ ہے کہ سعد بن عدنان جو خالص عرب ہیں ان کا حلیہ اختیار کرو۔) بنوسعد کا حلیہ اپناؤ، تیر نشانوں پر چلاؤ، عیش کی زندگی چھوڑ و، عجمی لوگوں کا حلیہ بھی نہ اپناؤ، ریشم نہ استعمال کرو کہ آپ ﷺ نے تاکیداً اس سے منع فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا ریشم نہ پہنو مگر جو اس طرح ہو اور اپنی دونوں انگلیوں کی طرف اشارہ فرمایا، غالباً تانابانا کی طرف اشارہ تھا کہ جو اس طرح ہو کہ تانا بانا دونوں میں سے کوئی سوت کا ہو) (مسند الامام احمد بن حنبل، ج ا ص ۴۳)

حضرت عمرؓ نے یہ تربیتی ہدایت نامہ ابوعثمان نہدی کو اس وقت بھیجا تھا جب وہ آذربائیجان میں جہاد میں، مصروف تھے۔ (الفروسیہ، ابن قیم، ص ۱۲۱) یہ خط اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت عمرؓ طریقہ رسول ﷺ کو تطبیق دینے کی کتنی کوشش کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جہاد اور دور دراز مما لک میں بھی اس کا خیال رکھتے تھے۔ وہ ذاتی طور پر اسلامی دار السلطنت سے باہر اپنے اوپر بھی عملاً اس اسوۂ نبوی کو منطبق فرماتے تھے اور لشکر کو بھی اس کا حکم دیتے تھے۔

حضرت ابوشعیب سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ جابیہ میں تھے پھر انھوں نے بیت المقدس کی فتح کا تذکرہ کیا، حماد بن سلمہ بیان کرتے ہیں ہم سے ابوسنان نے اور انھوں نے عبید بن آدم کے حوالے سے بیان کیا کہ ہم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو کعبؓ سے کہتے ہوئے سنا کہ تمھاری کیا رائے ہے نماز کہاں پڑھوں؟ میں نے عرض کیا کہ اگر مجھ سے پوچھتے ہیں تو میری رائے تو یہ ہے کہ صخرہ کے پاس پڑھئے۔ اس طرح پورا اقدس آپ کے سامنے ہوگا، حضرت عمرؓ نے جواب میں فرمایا تم نے تو یہودیوں کی نقل کی، میں تو وہاں نماز پڑھوں گا جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی ہے قبلہ کی طرف بڑھے پھر اپنی چادر بچھائی کوڑا کرکٹ صاف کیا، لوگوں نے بھی اس جگہ کو صاف کیا۔ (مسند الامام احمد بن حنبل، ج ا ص ۳۸)

حضرت عمرؓ نے کعب کے یہودیوں کی مشابہت اپنانے کو ناپسند کیا اسلئے کہ صرف صخرہ کی طرف رخ کرنے میں یہودیوں کی مشابہت تھی، اس سلسلے میں حضرت عمرؓ حکیمانہ و پختہ تدابیر اپناتے تھے۔ ان کو حکومت اسلامی کی قوت اور دبدبہ کے مکمل اظہار کا ہر طرح خیال تھا۔ جو گہرے

مطالعہ کا متقاضی ہے۔اس کے بغیر اس حقیقت کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ انھوں نے اسلام کو طاقت بخشی اور کفر کو پست کیا اور دین اسلام کو اللہ و رسول ﷺ کے تابع بنادیا، قرآنی حکم کے سامنے آجانے کے بعد اپنا فیصلہ بلاتردد بدل دیتے تھے۔سنت نبوی پر عمل کرتے اور صاحبین کے طریقے پر چلتے۔ معاملات میں جو حضرات صحابہ پہلے ایمان لاتے تھے، ان سے مشورہ کرتے، غیروں کی مشابہت اختیار کرنے کی پوری مخالفت کرتے، وہ دین کے غلبہ و بلندی ہی کو پسند کرتے، مثلاً جہاد، ذمیوں پر جزیہ لگانا اوران پر دبدبہ قائم رکھنا۔

غیر مسلموں سے مشابہت کب مباح ہے

اسلام ایک عالمی دین ہے۔ جو پورے عالم میں پھیل گیا ہے۔ لہذا کبھی مسلمان کو ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ جس ماحول وسوسائٹی میں رہ رہا ہے۔ بعض مصالح کے پیش نظر جو عقیدۂ اسلام اور اصول اسلام سے نہ ٹکراتے ہوں مصلحتاً بعض ظاہری چیزوں کو اپنانا درست ہے۔

مثلاً کچھ مسلمان دارالحرب یا کفار کے ملک میں رہتے ہیں تو ان کی ظاہری وضع قطع کی مخالفت کا حکم نہ ہوگا کیوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو نقصان اٹھانے کا اندیشہ ہے بلکہ بعض حالات میں تو ان کے ظاہری طور وطریق میں شامل ہونا مستحب بلکہ واجب ہے۔ جبکہ اس کے ذریعے ان کو دین کی دعوت دینے یا اور کوئی دینی فائدہ اٹھانے کا امکان ہو۔ یا ایسے ہی ان کے اندرونی حالات سے واقفیت حاصل کرنا مقصود ہو تاکہ دوسرے مسلمانوں کو اس سے باخبر رکھیں، یا ان سے جن نقصانات کا اندیشہ ہے ان کو دفع کرسکیں۔ مثلاً ان کے حملہ وغیرہ کرنے یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والے منصوبوں کا توڑ اپنا سکیں۔ (اقتضاء الصراط المستقیم۔م ا ص ۴۱۸)

مغربی تہذیب اختیار کرنے کا خطرہ

مسلمان بدعت و خرافات، الحاد و بے دینی جیسے خطرات کا برابر نشانہ بنتے رہے ہیں مگر ان میں سب سے خطرناک بات مغربی تہذیب پر فریفتگی اور لباس اور دوسری ظاہری نشست و برخاست، اندازِ فکر اور طور وطریق کو اپنانے میں فخر محسوس کرنا اور اسلامی اقدار کو حقیر اور گھٹیا سمجھنا ہے۔

لیکن مصلحین، داعیوں اور اسلامی مفکرین کا مسلمانوں کی بڑی تعداد کو مغربی تہذیب کے طوفان سے بچانے اور اسلامی اقدار پر باقی رکھنے میں بڑا حصہ رہا۔ گو سب کے انداز جداگانہ

تھے، کسی نے کسی انداز سے کسی نے دوسرے انداز سے اس خدمت کو انجام دیا۔ لیکن یہ معرکہ برابر جاری ہے۔ ختم نہیں ہوا۔ انداز بدلتے رہتے ہیں وہ چیلنج جس کا مسلمانوں کو سامنا کرنا پڑا۔ (مغربی تہذیب کی مشابہت ہے) یہ خطرہ انیسویں صدی عیسوی سے بڑھ گیا ہے اور یہ معرکہ اب تک جاری ہے گو اب اس کا بھرم دن بدن کھلتا جا رہا ہے۔ استعماری طاقتیں مغربی تہذیب کی چمک دمک کو پھیلانے اور رواج دینے کی نگرانی کر رہی تھیں اور اپنی چال ڈھال اور وضع قطع اپنانے والوں کو اونچے اونچے عہدے دیا کرتی تھیں اور ایسے لوگوں کو ملازمت دینے کو ترجیح دیتی تھیں۔ حدیث مذکور جس کی شرح کی جا رہی ہے اس کو برابر پڑھتے رہنے اور ذہن میں تازہ رکھنے کی بڑی ضرورت ہے۔ خصوصاً اس ماحول وفضا میں جس سے مسلمان اس وقت گزر رہے ہیں۔

حدیث کا فقہی پہلو

جو چیزیں ہمارے دین میں نہیں ہیں، ان میں دوسروں کی مشابہت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) یہ جانتے ہوئے کہ یہ بات ان کے دین کی خصوصیات میں سے ہے اس پر عمل یا تو صرف ان کی موافقت کی غرض سے کیا جائے گا جو بہت کم پیش آتا ہے یا خواہش وپسند کی بنا پر کیا جائے گا اور یا اس شعبہ میں کہ اس پر عمل دنیا وآخرت دونوں جہان کے لئے مفید ہے۔ ان سب صورتوں کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ان کو قطعاً نہ اپنانا چاہئے۔ لیکن بعض صورتوں کی حرمت گناہ کبیرہ ہے جو کبھی کبھی شرعی دلائل کی روشنی میں کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

(۲) ایسا کوئی عمل جس پر عمل کرنے والے کو یہ علم ہی نہیں کہ یہ غیر مسلموں کا عمل ہے اس کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: یہ کہ ہو تو غیر مسلموں کی چیز (یعنی ان کی کتاب کا حکم) لیکن دین اسلام میں بھی اس کی مشروعیت باقی رکھی گئی ہو، خواہ اسی طرح جیسا وہ عمل کرتے تھے یا حالات اور جگہ کی مناسبت سے تغیر کر کے لیا گیا ہو، یا وہ لوگ جو اپنے تہواروں کے موقعوں پر جو کچھ کرتے ہیں اس میں مشابہت ان سب صورتوں میں مفتی سے فتویٰ لے کر عمل کرنا چاہئے اور اپنے زمانہ اور شہر کے علماء سے پوچھنا چاہئے۔

دوسری صورت: یہ ہے کہ اصل میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کہ ان کی کوئی چیز اس میں شامل کی گئی ہو، لیکن وہ لوگ بھی ایسا کرتے ہیں تو اس میں مشابہت ممنوع تو نہیں، لیکن اس سے ان کی مخالفت کرنے کا فائدہ فوت ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس عمل کا مکروہ یا حرام ہونا کسی شرعی دلیل پر موقوف ہوگا۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث مذکور غیر مسلموں اور عجمی لوگوں کی مشابہت اختیار کرنے سے روکتی ہے خواہ وہ لباس میں ہو یا عادات ورسم ورواج میں، حتیٰ کہ زبان اور عجمی بول چال اور ان کے تہوار اور میلے ٹھیلے ہر چیز میں مشابہت سے بچا جائے۔

(۲) حدیث اعتقادی وعملی بدعات، مغربی تہذیب پر فریفتگی سب کی مخالفت کرتی ہے۔

(۳) یہ حدیث جاہلیت کے اطوار وعادات کو دوبارہ رواج دینے سے روکتی ہے، اس زمانے کے رسم ورواج، اور دنیا میں پھیلے ہوئے غیر اسلامی تہذیب وتمدن سب سے روکتی ہے۔

(۴) حدیث بتاتی ہے کہ مشابہت اہل کتاب اور عجمی لوگوں سے ایک قسم کی محبت کو ظاہر کرتی ہے یا کم از کم درجہ یہ ہے کہ ان سے محبت کا شبہ پیدا کرتی ہے۔ لہذا ایسی صورت میں مشابہت حرام ہوگی، تا کہ یہ سبب ہی ختم ہو جائے، کافروں سے محبت ودوستی کی جڑ کٹ جائے، یہ ظاہری محبت ودوستی کبھی کبھی اعتقادی، فکری اور باطنی مشابہت تک پہونچ جاتی ہے۔ اس لئے حضور ﷺ نے غیروں کی مشابہت سے شدت کے ساتھ منع فرمایا کہ جس نے جس قوم کی مشابہت اختیار کی وہ اسی کے ساتھ ہوگا۔

حدیث - ۱۷

صلہ رحمی اور اخوت ومحبت

حدثنا ابونعیم حدثنا زکریا عن عامر قال سمعته یقول سمعت النعمان بن بشیر یقول: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "تری المؤمنین فی تراحمھم وتوادھم وتعاطفھم کمثل الجسد إذا اشتکیٰ عضوتداعی له سائر جسده بالسھر والحمّیٰ" (فتح الباری،۱۰،ص ۳۴۸)

"حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم مسلمانوں کو باہم رحم ومحبت اور لطف ومہربانی میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے کہ اگر اس کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو اس کا پورا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

حدیث کے الفاظ کہ تم مسلمانوں کو باہم رحم، محبت اور مہربانی میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے۔ بھائی چارہ، باہمی میل، محبت اور ایک بلند کردار اور صاف ستھرا معاشرہ وجود میں لانے کی باہم ایک دوسرے سے ملی ہوئی کڑیاں ہیں، جو ایسے اصول وقواعد اور طریق عمل میں قائم ہیں، جن پر خدائی معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ ایسا معاشرہ جو اس قابل ہوتا ہے کہ اس میں اخوت، بھائی چارہ پایا جائے۔ ایسا معاشرہ جس میں دل پاک ہوں اور پاکیزہ احساسات پائے جاتے ہوں۔ ایسا معاشرہ جس میں اللہ ورسول کے حکموں کا پاس ولحاظ کیا جاتا ہو، اپنے ساتھ بھی انصاف پایا جاتا ہو اور دوسروں کے ساتھ بھی، دل کے خیالات وتصورات میں خوبی اور اچھائی ہو اور اعضاء کی حرکات وسکنات میں بھی محبت کی چاہت اور اس سے لگاؤ میں بھی سلیقہ پایا جاتا ہو۔ اسی لئے امام نوویؒ نے یہ لکھا ہے کہ یہ حدیث مسلمانوں میں باہم ایک دوسرے کے حقوق پہچاننے اور ان کی تعظیم وتکریم کے سلسلے میں بہت واضح ہے۔ حدیث نے مسلمانوں کو باہم رحمت ومحبت اور لطف ومہربانی اور ایک دوسرے کو سہارا دینے پر آمادہ کیا ہے۔ بشرطیکہ یہ بات گناہ وناپسندیدہ باتوں کے سلسلے میں نہ ہو۔ (صحیح مسلم، مسند الامام احمد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کے تحت ایک متحد

وباہم مربوط معاشرے کے مفہوم کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنا پسند فرمایا ہے، لہٰذا آپ ﷺ اس کو مختلف مناسبتوں سے بلیغ انداز میں بیان فرماتے رہتے تھے، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: مسلمان مسلمان کے لئے دیوار کی طرح ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو جوڑے رکھتا ہے۔ (صحیح مسلم شرح النووی ج۱۶)

اس حدیث کے ذریعے آپؐ نے مسلمان معاشرے کو فوری تاثر وجذباتیت سے متاثر ہوکر لڑائی جھگڑے اور باہمی انتشار وخلفشار سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک عملی وشرعی قانون وضع فرمادیا۔

آپ ﷺ نے ''مسلمان مسلمان کے لئے عمارت کی طرح ہے'' کی تعبیر استعمال کرکے مسلمانوں کے دلوں میں جوشِ محبت اور باہمی تعلق کو مضبوط فرمادیا۔ آپ ﷺ نے باہمی رحم ومحبت کو ایک دوسرے انداز سے بیان فرمایا اور اس لفظ نے ان میں باہم جوڑ پیدا کردیا۔

ابن ابو جمرہ کہتے ہیں، حدیث کے الفاظ تراحم، توادد، تعاطف اگرچہ بظاہر قریب قریب معنی کے الفاظ ہیں لیکن ان سب میں بڑا نازک ولطیف فرق ہے۔ تراحم کا مطلب ہے ایمانی بنیاد پر باہم ایک دوسرے کے ساتھ رحم کا معاملہ کرنا اس میں کوئی اور مقصد نہ ہو۔ اس طرح کہ اپنے بھائی کے لئے نرم پڑے، اس کی تکلیف سے تکلیف محسوس کرے، اس کی خوشی وغم میں شریک ہو اور یہ شرکت مومنانہ بھائی چارے کی بنیاد پر ہو، نہ کہ تعصب اور جذباتیت کی بنیاد پر اور توادد کے معنی ہیں ایسا میل ملاپ جو محبت پیدا کرنے والا ہو مثلاً ایک دوسرے سے ملنے جانا ایک دوسرے کو ہدیہ کرنا کہ ہدیہ محبت پیدا کرنے اور برادرانہ تعلقات کو بڑھانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ''ایک دوسرے کو ہدیہ کرو تو آپس میں محبت پیدا ہوگی اس لئے کہ ہدیہ دل کے کینہ کو ختم کرتا ہے۔''

آپ ﷺ ہدیہ کے بدلے میں اس سے اچھا ہدیہ پیش فرماتے تھے، پڑوسیوں اور ساتھیوں میں ہدیہ کا تبادلہ فرماتے تھے، اس لئے کہ 'تہادوا' کے معنی اس وقت پورے ہوتے ہیں جب دونوں طرف سے ہدیہ کیا جائے، اس کے بغیر ''تہادوا' کے معنی نہیں ہوتے، اور 'تعاطف' کے معنی ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنا جیسے کپڑا موڑ دیا جاتا ہے کہ اس کو مضبوط بنائے، یہی اخوت ہے، جو باہم رحم، محبت اور ایک دوسرے کی اعانت کو اپنے اپنے موقع پر پورا کرتی ہے، تینوں کے الگ الگ مواقع ہیں، آپ ﷺ نے اس ہمہ گیر بھائی چارے کی تشبیہ مومن کے جسم سے دی ہے، چنانچہ آپؐ نے فرمایا ''المسلمون کرجل واحد اذا اشتکی عینه اشتکی کله'' تمام مسلمان ایک آدمی کی طرح ہیں کہ اگر اس کی آنکھ کو تکلیف ہو تو پورے جسم کو تکلیف ہوتی

ہے۔ آنکھ جسم کا سب سے نازک حصہ ہے اس میں سب سے زیادہ حساسیت ونزاکت پائی جاتی ہے، کہ اگر آنکھ میں تکلیف ہو تو جسم کے کسی حصہ کو کل نہیں پڑتی، بلکہ جسم کا ہر حصہ بے چین و بے کل ہو جاتا ہے کسی طرح چین نہیں آتا، اسی طرح مومن کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بھائی چارگی اپنے خدا واسطے بھائیوں کے لئے عام ہو کر فکر وروح جسم وقلب ہر اعتبار سے ان کے ساتھ رہے۔ ان کے حالات معلوم کرے، ان کے آرام کے لئے جاگے، یہ آپ کے پیرایۂ بیان کی خوبی ہے کہ اسی حدیث میں آپ اس معنی کو دہراتے ہیں اور فرماتے ہیں ''اذا اشتکی راسه اشتکی کله'' اگر اس کے سر میں تکلیف ہوتی ہے تو پورے جسم کو تکلیف ہوتی ہے یہ ایسا پیارا طرز بیان اور موثر تشبیہ ہے کہ اس کی خوبی وگیرائی کو چھوٹا بڑا، پڑھا اور بے پڑھا ہر ایک سمجھتا ہے۔ دردِ سر میں سر اور دانتوں کا درد شامل ہے جو پورے جسم کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

وہ نمائندہ معاشرہ جس کو اسلام فرمان قرآنی ''انما المؤمنون اخوۃ'' کے تحت قائم کرنا چاہتا ہے۔ ایسا مثالی معاشرہ ہے، جس کا کیرکٹر اور معیار اخلاق بہت بلند ہے۔ اس میں بدگمانی اور عیب جوئی کا گزر نہیں، اسلامی معاشرے کا ہر فرد باعزت ومعزز تصور کیا جاتا ہے، اس پر کوئی بٹا نہیں لگایا جاسکتا کہ ایک کی عزت سب کی عزت ہے، کسی ایک فرد کا عیب معلوم کرنا گویا اپنا عیب بیان کرنا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم مسلمانوں کو پوری قوت کے ساتھ یہ پسندیدہ آواز دیتا ہے:

يَآ اَيُّهَاالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَسۡخَرۡ قَوۡمٌ مِّنۡ قَوۡمٍ عَسٰىٓ اَنۡ يَّكُوۡنُوۡا خَيۡرًا مِّنۡهُمۡ وَلَا نِسَآءٌ مِّنۡ نِّسَآءٍ عَسٰىٓ اَنۡ يَّكُنَّ خَيۡرًا مِّنۡهُنَّ وَلَا تَلۡمِزُوۡٓا اَنۡفُسَكُمۡ وَلَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ (الحجرات:۱۱)

''مومنو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے، ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے (تمسخر کریں) ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں اور اپنے (مومن بھائی) کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔''

مسلمان کا مسلمان پر یہ حق ہے کہ اس کو وہ ایسے لقب سے نہ پکارے جو اسے ناپسند ہو اور اس کے سبب وہ حقارت کی نظر سے دیکھا جائے۔ مسلمان کا شعار یہ ہے کہ اپنے بھائی کا دل نہ دکھائے۔ آپؐ نے ایسے ناموں اور لقبوں کو بدل دیا، جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھے۔ آپ نے اپنی ذکاوتِ حس اور شریفانہ طبیعت کے سبب ان القاب کو محسوس کرلیا، جن کے سبب لوگ حقیر سمجھے

جاتے ہیں، یا اس سے ان کی بری صفت معلوم ہوتی ہے۔ بھائی چارہ کے احساس کو ابھارنے بلکہ ایک ذات میں ضم ہوجانے کے بعد پورے مسلمانوں کو ایک جسم قرار دینے کی بلیغ مثال مسلمانوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ امت کے پورے مجموعے کو اتفاق واتحاد میں بالکل ایک جسم کی طرح پیش کریں۔

حدیث کا فقہی پہلو

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ جب ایک مسلمان بھائی بھاؤ تاؤ کررہا ہو تو دوسرا بھاؤ تاؤ شروع کردے، اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ ایک مسلمان نے کسی عورت سے شادی کا پیغام دیا ہے تو اب دوسرا بھی پیغام دے دے اور نہ یہ درست ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی مباح عمل کا ارتکاب کرچکا ہے، تو یہ اس کو سامنے لائے اور بیان کرے۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ باہمی محبت ہی تمہارے اندر اپنے بھائی کی مشکلات کو دور کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور تمھیں اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک اس کا غم دور نہ ہوجائے اور اس کی پریشانی جاتی نہ رہے، جب تم اس میں کامیاب ہوجاتے ہو تو تمہاری روح منور ہوجاتی ہے اور دل کو راحت نصیب ہوتی ہے۔

(۲) باہمی رحم کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے بھائی کے نفع کے خواہش مند رہو اور جب اس میں کامیاب ہوجاؤ تو ایسی بشاشت وخوشی حاصل ہو جیسے خود کو نفع پہنچنے سے خوشی ہوتی ہے۔ جب تم اپنے بھائی کو فائدہ پہنچانے کی کوشش میں کامیابی حاصل کرلیتے ہو تو اللہ تعالیٰ سے بہترین اور بہت اجر والی عبادت کا قرب حاصل کرتے ہو۔

(۳) لطف ومہربانی کا حق یہ ہے کہ مسلمان خوش حالی وپریشانی دونوں حال میں اپنے مسلمان بھائی کو اپنا سہارا سمجھے اور یہ محسوس کرے کہ زندگی کے جھمیلوں میں تنہا اس کی طاقت نہیں کام کررہی ہے بلکہ تمام مسلمانوں کی طاقت اس کو سہارا دے رہی ہے اور اس کے بازو کو قوت پہنچارہی ہے۔ (المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً کا یہی مطلب ہے، لہٰذا مخلصانہ بھائی چارہ ایک بڑی نعمت ہے، صرف روحانی نعمت نہیں بلکہ مادی نعمت بھی ہے۔

حدیث - ۱۸

کشتی نجات

عن نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: مثل القائم علی حدود اللہ والواقع فیھا کمثل قوم استھموا علی سفینة فاصاب بعضھم اعلاھا وبعضھم اسفلھا فکان الذین فی اسفلھا اذا استقوا من الماء مروا علی من فوقھم فقالوا لوا ناخرقنا فی نصیبنا خرقاً ولم نؤذ من فوقنا فان یترکوھم وما ارادوا اھلکوا جمیعاً وان اخذ واعلیٰ ایدیھم نجوا ونجوا جمیعاً۔

(صحیح بخاری، حاشیہ السندی، تحفۃ الاحوذی)

''نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ کے حدود کو توڑنے والے کی مثال ایسے لوگوں کی ہے کہ ایک کشتی پر سوار ہونے کے لئے قرعہ اندازی کی، بعض لوگوں کے نام اوپر کی منزل کا قرعہ نکلا اور بعض لوگوں کے نام نیچے کی منزل کا۔ جن لوگوں کے نام نیچے کا قرعہ نکلا تھا جب وہ اوپر والی منزل کے لوگوں کے پاس سے پانی لے کر گزرتے، تو ان کو خیال ہوتا کہ ہماری وجہ سے ان لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے، ان لوگوں نے باہم مشورہ کیا کہ اگر ہم لوگ اپنے حصے (نچلی منزل) میں سوراخ کر لیتے تو (یہیں سے پانی لے لیتے) اوپر والوں کو تکلیف نہ پہنچاتے، اب اگر اوپر کی منزل کے لوگ ان نیچے والوں کو اپنی منزل میں سوراخ کرنے دیں تو (نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاز میں پانی بھر جائے گا) اوپر نیچے دونوں منزلوں کے لوگ ڈوب جائیں گے اور اگر اوپر والوں نے نیچے والوں کو جہاز میں سوراخ

کرنے سے روک دیا تو بچ جائیں گے اور سب کے سب زندہ وسلامت رہیں گے۔''

یہ حدیث ادب و بلاغت کی اعلیٰ مثال ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت کو نہایت عام فہم انداز میں بیان کرتی ہے، اور یہ بتاتی ہے کہ فرد اور جماعت میں کس طرح باہمی تعلق اور ایک دوسرے کی فکر ہونی چاہئے۔ حدیث فرد و جماعت دونوں ہی پر کچھ ضروری ذمہ داریاں ڈالتی ہے اور دونوں کے لئے حقوق کی ترتیب قائم کرتی ہے۔ اسلام اس باہمی فکر وتعاون پر غیر معمولی توجہ دیتا ہے اتنا کہ دونوں کی مصلحتیں گویا ایک ہیں اور جزا وسزا کا وہ نظام قائم کرتا ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں خواہ وہ معنوی ہو یا مادی، فرد و جماعت دونوں میں سے جو بھی اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں کوتاہی کرے جزا وسزا کا اس پر یکساں نفاذ ہوگا۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ

(التوبہ:۱۰۵)

''اے نبی! ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو، اللہ، اس کا رسول اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرز عمل اب کیا رہتا ہے۔''

آپ ﷺ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں کشتی کی مثال دے کر جس خوبی اور باریکی کے ساتھ معاشرے کے اندر پائے جانے والے اچھے اور برے لوگوں کی، تصویر کشی فرمائی ہے وہ بڑی چشم کشا مثال ہے۔ معاشرہ ایک کشتی ہے جو سمندر کے اندر زوردار موجوں اور زبردست طوفان میں چل رہی ہے۔ معاشرے کی اس کشتی کے سواروں نے قرعہ اندازی کرکے اپنے کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا ہے۔ ایک کشتی کے بالائی حصے میں ہے ایک کائنات کے حسن و جمال، کھلے آسمان اور زندگی کے دلکش قدرتی مناظر اور اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہورہا ہے۔ اور دوسری قسم کے لوگ کشتی کے نچلے حصے میں ہیں۔ وہ اوپر کے قدرتی مناظر اور لطف ومزہ سے محروم ہیں، ان کو وہ لطف ومزہ حتیٰ کہ پانی تک میسر نہیں جو اوپر کے لوگوں کو حاصل ہے، یہ لوگ پانی اوپر سے لاتے ہیں۔ جب اوپر آنے جانے کی مشقت جھیلی تو آرام کی سوجھی۔ وہ یہ کہ کشتی کے نچلے حصے میں، جو ان کے لئے مخصوص ہے سوراخ کرلیں تا کہ خود پریشانیوں سے بچیں اور اپنے پڑوسیوں کو بھی تکلیف سے بچائیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا ''اگر ہم

اپنے حصے میں ایک سوراخ کر لیتے تو اوپر والوں کو تکلیف نہ دیتے۔ اب اگر اوپر والے ان لوگوں کو ان کے ارادے پر چھوڑ دیں تو سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے اور اگر اوپر والے نیچے والوں کو سوراخ کرنے سے روک دیں گے تو اوپر نیچے دونوں درجوں کے لوگ ہلاکت سے بچ جائیں گے۔''

کشتی اور اہل کشتی کی یہ مثال مصالح عامہ کے خیال اور رعایت کی ایک انوکھی مثال ہے، جس میں فرد و جماعت دونوں ہی کی بھلائی کا راز پوشیدہ ہے اور فرد کی وقتی اور ظاہری رائے کو نقصان پہنچا کر جس میں عملی حقیقت کے نتائج پر غور کیے بغیر اقدام کا ارادہ کیا گیا ہے۔ یہ فرد و جماعت دونوں ہی کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اس سلسلہ میں تمام لوگوں کا باہم تعاون کرنا، جماعت کی مصلحت کے لئے ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ:۲)

''اور (دیکھو) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں مدد نہ کیا کرو۔''

مزید فرمایا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران:۱۰۴)

''اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے۔''

امت مسلمہ کا ہر فرد امر بالمعروف کا مکلّف ہے اگر وہ اس ذمہ داری کو نہ ادا کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ اور اپنے اس گناہ پر سزا پائے گا اور برائی دیکھتے ہوئے اپنے خاموش رہنے کے برے نتائج کا سزاوار ہوگا۔ ارشاد باری ہے:

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ثُمَّ فِىْ سِلْسِلَةٍ سَبْعُوْنَ ذِرَاعاً فَاسْلُكُوْهُ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُوْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَلَا يَحُضُّ

عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ، فَلَیْسَ لَهُ الْیَوْمَ هٰهُنَا حَمِیْمٌ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ، لَّا یَاْکُلُهٗ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ

(الحاقۃ: ۳۰۔۳۷)

''(حکم ہوگا) اسے پکڑ لو اور طوق پہنا دو پھر اسے دوزخ کی آگ میں جھونک دو۔ پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے اسے جکڑ دو، یہ نہ تو خدائے جل شانہ پر ایمان لاتا اور نہ فقیر کے کھلانے پر آمادہ کرتا ہے، سو آج اس کا بھی یہاں کوئی دوست دار نہیں اور نہ پیپ کے سوا (اس کے لئے) کھانا ہے جس کو گنہگاروں کے سوائے کوئی نہیں کھائے گا۔''

مسکین کے کھانا کھلانے پر آمادہ نہ کرنا امر بالمعروف اور اپنے مسلمان بھائیوں کے معاملے سے دلچسپی نہ لینا غلطی اور خطا میں شمار کیا جاتا ہے ہر شخص اس بات کا مکلّف ہے کہ اس کو جو برائی نظر آئے اس کو ختم کرے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ہم نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ''تم میں سے جو شخص برائی دیکھے اس کو اپنے ہاتھ سے دور کردے اور جو ہاتھ سے دور کرنے پر قادر نہ ہو تو زبان سے منع کرے اور جو یہ بھی نہ کرسکے تو (کم از کم) دل ہی سے اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ (تحفۃ الاحوذی: ج ٦)

اس طرح امت کا ہر شخص امت کے اندر پیدا ہونے والی ہر برائی کا جوابدہ ہوگا خواہ وہ اس میں شریک نہ ہو، پوری امت ایک ہی کشتی کے سواروں کی طرح ہے اور کشتی کے سارے ہی لوگوں کا ایک ہی انجام ہوگا۔ (کشتی پار لگے گی تو سب لوگ پار ہوجائیں گے، کشتی ڈوبے گی تو سبھی لوگ ڈوب جائیں گے) برائی پوری امت کو نقصان پہنچاتی ہے لہٰذا امت کے ہر فرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ امت کو اس سے روکے اور بچائے۔ امت اگر معاشرے کے بعض لوگوں میں برائی کو دیکھ کر خاموش رہتی ہے تو عنداللہ سب ماخوذ ہوں گے اور پوری امت کو تکلیف وسزا ملے گی، امت کا بعض لوگوں کی برائیوں پر خاموش رہنا بالکل کشتی والوں ہی کی طرح ہے کہ اگر اوپر والے نیچے والوں کی کشتی میں سوراخ کرنے پر خاموش رہتے ہیں اور ان کو سوراخ کرنے دیتے ہیں اور اس کو توڑنے سے منع نہیں کرتے تو سب کا انجام معلوم ہے۔

حضرت حذیفہ بن الیمان سے مروی ہے، وہ حضور ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم بھلائی کا حکم ضرور کرتے رہو اور برائی کو دل وجان سے روکتے رہو، ورنہ جلد ہی اللہ تعالیٰ تم پر عذاب بھیج دے گا اس کے بعد تم اس سے دعا کرو اور تمہاری دعا قبول نہ کی جائے۔ (تحفۃ الاحوذی:۲)

قرآن کریم نے بھی ان صورتوں سے ہم کو ڈرایا ہے۔ فرمایا:

وَاِذَآ اَرَدۡنَآ اَنۡ نُّهۡلِكَ قَرۡيَةً اَمَرۡنَا مُتۡرَفِيۡهَا فَفَسَقُوۡا فِيۡهَا فَحَقَّ عَلَيۡهَا الۡقَوۡلُ فَدَمَّرۡنٰهَا تَدۡمِيۡرًا (بنی اسرائیل ء:۱۶)

''اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو (فواحش پر) مامور کر دیا تو وہ نافرمانیاں کرتے رہے پھر اس پر (عذاب کا) حکم ثابت ہو گیا اور ہم نے اسے ہلاک کر ڈالا۔''

اگرچہ اس بستی میں بہت سے ایسے لوگ ہوں جنہوں نے برائی نہ کی ہو، خدائی حکموں کو نہ توڑا ہو لیکن غلط کاری پر ان کی خاموشی نے انہیں عذاب کا مستحق بنا دیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاتَّقُوۡا فِتۡنَةً لَّا تُصِيۡبَنَّ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡكُمۡ خَآصَّةً

(الانفال:۲۵)

''اور اس فتنہ سے ڈرو جو خصوصیت کے ساتھ انہیں لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں گنہگار ہیں۔''

اس میں ظلم قطعاً نہیں کہ وہ لوگ کیوں تباہ کئے گئے جنہوں نے گناہ نہیں کیا۔ اس لئے کہ جس قوم میں بے حیائی پھیل جاتی ہے اور کھلے عام برائیاں ہونے لگتی ہیں تو اس قوم کو جو ہر قید وبند سے آزاد ہو چکی ہے اور برابر تباہی اور پستی کی طرف چل رہی ہے، اسے عذاب سے کوئی بچا نہیں سکتا، یہ ایک فطری بات اور غلط کاری کا لازمی نتیجہ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: لوگو! تم یہ آیت پڑھتے رہو:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَيۡكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ‌ لَا يَضُرُّكُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اهۡتَدَيۡتُمۡ‌ؕ (المائدۃ:۱۰۵)

''اے ایمان والو! اپنی جانوں کی حفاظت کرو۔ جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔''

میں نے حضورﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: اس میں شبہ نہیں کہ لوگ جب ظالم کو دیکھیں گے اور اس کا ہاتھ نہیں پکڑیں گے تو قریب ہے کہ پوری قوم پر عذاب آ جائے۔

معلوم ہوا کہ امر بالمعروف میں کوتاہی، برائیاں ہوتے دیکھ کر خاموش رہنا، لوگوں کو روکنا اور منع نہ کرنا، امت کے لئے مصائب و آفات کا سبب بنتا ہے۔ فتنے اور زلزلے شروع ہو جاتے ہیں، دعا قبول نہیں ہوتی، اور امت خیر و برکت اور اس خدائی رحمت سے محروم کر دی جاتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر اترا کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے کہ بھلائی کا حکم کرنے والے برائی سے روکنے والے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے اور اللہ و رسول کی اطاعت کرنے والے ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ.'' (التوبۃ: ۷۱) (یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ سے پہلے اس کا ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (توبہ: ۷۱)

''اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جن پر خدا رحم کرے گا، بیشک خدا غالب حکمت والا ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو نماز پر مقدم فرمایا ہے۔ اس لئے

کہ امت کے اندر اچھائیاں بڑھیں گی، خوبیاں اور نیک خصلتیں ظاہر ہوں گی، گھٹیا اور ذلیل باتیں ختم ہوں گی۔ امت کے لوگ نیکی میں ایک دوسرے سے تعاون کریں گے، ایک دوسرے کے ہمدرد بنیں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے، ہر اچھے کام کو اپنائیں گے اور بری باتوں سے دور رہیں گے۔ اس کے برعکس برائیوں پر خاموش رہنے اور بھلائی کا حکم دینے میں کوتاہی کرنے پر بڑی بڑی مصیبتیں آئیں گی، امت میں انتشار پیدا ہوگا، دل سخت ہو جائیں گے، برائیاں پھیلیں گی اور انہیں کا چلن ہوگا، خوبیاں جاتی رہیں گی، حقوق مارے جائیں گے، باطل کا غلبہ ہوگا، یہ وہ حقیقت ہے جو ہر اس جگہ، حکومت، شہر، گاؤں اور دیہات میں ظاہر ہوگی جہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمل نہیں ہوگا اور لوگ من مانی زندگی گزاریں گے۔

بنی اسرائیل پر انبیاء نے اسی لئے لعنت کی دعا کی اور وہ اس کے مستحق ٹھہرے کہ وہ برائی کو چھوڑتے نہیں تھے، نہ ایک دوسرے کو روکنے کا کام ہو رہا تھا، جس کے نتیجہ میں ان کی حکومت جاتی رہی اور ان کا رعب داب ختم ہو گیا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ، كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۔

(المائدۃ:۷۸،۷۹)

''جو لوگ بنی اسرائیل میں کافر ہوئے ان پر داؤد اور عیسیٰؑ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس لئے کہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے، (اور) برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے کو روکتے نہیں تھے۔ بلاشبہ وہ برا کرتے تھے۔''

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہوئے تو ان کو ان کے علماء نے روکا، لیکن وہ برائی سے باز نہیں آئے، تاہم علماء ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے رہے ان سے کنارہ کش نہیں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں دوری پیدا کر دی ایک دوسرے سے لڑا دیا حضرت داؤد اور عیسیٰؑ علیہما السلام کی زبان سے ان پر لعنت بھیجی، آپ ﷺ ٹیک

لگائے ہوئے تھے پھر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا: ''نہیں! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں ہماری جان ہے تا آنکہ تم ان کو حق پر نہ لاؤ۔'' (تحفۃ الاحوذی) یہ صرف حکم دینے اور رکنے کی بات ہے کہ اس کے بعد ذمہ داری ختم ہو جائے، کافی نہیں بلکہ بار بار یہ بات کہی جائے اور ایسے لوگوں سے قطع تعلق کیا جائے۔

قرآن وحدیث میں بکثرت آیا ہے کہ جماعت کا بالکل خاموش رہنا اپنے سامنے برائیوں کو ہوتے دیکھنا اور یہ کہہ کر ٹال جانا کہ ہم سے کیا مطلب؟ کیوں کسی کو ناراض کریں کہ ہم اس فساد سے روکیں گے تو ہمیں نقصان پہنچے گا، لوگوں کا یہ خیال اور برائی سے روکنے اور نیکی کا حکم ترک کر دینا ہی سب کے لئے موجب عذاب ہوگا۔ اسی طرح جس طرح کہ نیچے والوں کو کشتی میں سوراخ کرنے سے منع نہ کرنے پر کشتی کے سبھی لوگ ڈوب جائیں گے۔ اگر دینی غیرت نے اللہ کے احکام کی بجا آوری کے احساس کو بیدار رکھا اور اس کی حفاظت میں کوشاں رہے۔ تو یہ فکر وکوشش پوری امت مسلمہ کے بقاء کا سبب بنے گی۔ حدیث کے مطابق کہ ''اگر ان کا ہاتھ پکڑا تو ڈوبنے سے بچ جائیں گے اور سب کے سب بچ جائیں گے لیکن ان سب باتوں کا انحصار اللہ تعالیٰ پر ایمان کامل کا متقاضی ہے، ایمان کے بعد کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کو جاننے کی ضرورت ہے اور ایمان کے تقاضے زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہیں اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور اسلامی عقیدہ پر پوری مضبوطی سے جمنے کی ضرورت ہے۔ وہ مسلم معاشرہ جو اپنا قانون اور طریق زندگی اللہ کی شریعت سے حاصل کرتا ہے، یہی وہ معاشرہ ہے جو مسلمان کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا پابند بناتا ہے اور اس کی حقیقت وافادیت کو اجاگر کرتا ہے تاکہ یہ ایک شخصی کام بن کر نہ رہ جائے جیسا کہ اس وقت بعض ان مسلم ممالک کی سوسائٹیوں میں ہو رہا ہے، جو دوسروں کی تقلید اور ان کی معاشرتی اصطلاحات پر عمل پیرا ہیں۔

وہ تمام قرآنی آیات جن میں امر بالمعروف کا حکم ہے، ایک ایسی مسلم سوسائٹی میں رہنے والے مسلمان کا موقف واضح کرتی ہیں، جس میں اللہ کا قانون چلتا ہے، گو اس میں بعض اوقات نہی عن المنکر میں حد سے تجاوز ہو جاتا ہے، اس مسلم سوسائٹی میں جب گناہ ہونے لگتا ہے تو بندۂ مومن نیکی کا حکم کرتا ہے اور برائی سے روکتا ہے، بعض مشکوک موقعوں پر بھی اس کی دینی

غیرت وحس تیز ہو جاتی ہے اور وہ جوش میں خلاف ضابطہ اقدام بھی کر بیٹھتا ہے۔ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کا قصہ اسی دینی غیرت کی ایک مثال ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شام کی گورنری کے زمانہ نے عبادہ بن الصامت شام میں مقیم تھے۔ حضرت اسماعیل بن عبید بن رفاعہ اپنے والد کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبادہ بن الصامت جس زمانہ میں شام میں مقیم تھے ان کے سامنے سے شراب سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطار گزری، انہوں نے ان اونٹوں کو دیکھ کر پوچھا یہ کیا چیز ہے؟ کیا یہ تیل ہے؟ بتایا گیا کہ نہیں یہ شراب ہے جو فلاں شخص کے ہاتھ بیچی جائے گی، یہ سنتے ہی انہوں نے بازار سے چھری خریدی اور شراب کے مشکیزوں کو پھاڑ ڈالا۔ اس زمانہ میں حضرت ابو ہریرہؓ بھی شام میں مقیم تھے۔ جس شخص کی شراب تھی اس نے حضرت ابو ہریرہؓ کو دکھایا کہ آپ اپنے بھائی عبادہ کو ہم سے روکیں گے نہیں؟ وہ صبح کو بازار جاتے ہیں اور ذمیوں کے مال کو برباد کر دیتے ہیں اور شام کو مسجد میں کھڑے ہوتے ہیں تو ہم لوگوں کو گالی دینے اور ہمارا عیب بیان کرنے کے سوا ان کا کوئی اور کام نہیں۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ عبادہ کے پاس آئے اور کہا بھائی تمہارا امیر معاویہؓ کی حکومت میں کیا دخل، ان کو ان کی ذمہ داری پر چھوڑ دو۔ حضرت عبادہؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو جواب دیا کہ کیا جب ہم لوگوں نے سننے اور اطاعت کرنے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت کی پروا نہ کرنے پر بیعت کی تھی تو آپ ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ ان کا جواب سن کر حضرت ابو ہریرہؓ خاموش رہے۔ صاحب معاملہ نے خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ عبادہ بن الصامت نے شام کو ہمارے لئے ناساز گار بنا دیا ہے۔

یہ کتنا اچھا واقعہ ہے۔ یہ واقعہ صحابہ کرامؓ کے معاشرہ کی تصویر کشی کرتا ہے۔ وہ سبھی حضرات ایک کشتی کے سوار تھے جو نجات کے راستہ پر چل رہی تھی اور اس کا ہر فرد کشتی کے صحیح سالم رہنے کا خواہش مند تھا، اس کی حفاظت ونگہبانی کا کوشاں رہتا تھا، اس واقعہ سے اختلاف واجتہاد کی گنجائش نکلتی ہے، حضرت معاویہؓ اس علاقہ کے گورنر ہیں وہ مسلمانوں اور ذمیوں سبھی کے ذمہ دار ہیں اور سب کی مصلحتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ حضرت عبادہ بن الصامتؓ کبار صحابہ میں سے ہیں، دینی غیرت سے بہرہ ور ہیں، انہیں اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں غفلت سے کشتی میں شگاف نہ

ہو جائے اور حضرت ابو ہریرہؓ سنجیدگی و مصلحت اندیشی کا مزاج رکھتے ہیں۔ حالات و ماحول کی رعایت کرتے ہیں، بالآخر یہ اختلافات خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان بن عفانؓ کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں اور وہ عبادہ بن الصامتؓ کو مدینہ منورہ بلا لیتے ہیں اور اس حکمت عملی سے شام کی فضا پرسکون ہو جاتی ہے۔

یہ بات ایسے مسلم معاشرہ میں پیش آتی ہے جو اپنے کسی فرد کو اپنا حاکم بناتی ہے اور قرآن کریم کے احکام کو اپنا قانون بناتی ہے۔ یہ خصوصیت اس معاشرہ کی ہوتی ہے جو اپنا حاکم کسی مسلمان کو بناتا ہے، اس اسلامی معاشرہ کے علاوہ دوسرے معاشرے جن میں خدائی قانون نہیں چلتا، بلکہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین چلتے ہیں جو سب سے بڑی غلطی ہے اور جس کے نتیجہ میں دوسری تمام برائیاں پیدا ہوتی ہیں، اس وقت کے رائج اور انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں میں یہی بات پائی جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں برائی پر نکیر کرنے اور روکنے کے لئے اس قرآنی ارشاد پر غور و فکر ضروری ہے اور اسی کی روشنی میں بھلائی کی دعوت دینے کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ''

اس لئے کہ ایسے منکرات کے دور کرنے کی فکر میں اپنی جد و جہد کو ضائع نہ کرنی چاہئے جو پہلے منکر یعنی خدائی قانون پر عمل نہ کرکے انسانی قوانین پر عمل کے برے نتیجہ کے طور پر وجود میں آئی ہیں، ایسی صورت میں حکمت عملی ہی کے ساتھ خیر کی دعوت دینی چاہئے۔

اس لئے کہ جب انہوں نے حکم خداوندی کو مانا ہی نہیں تو اب جو برائی وہ کر رہے ہیں اس سے کس بنیاد پر رکیں گے اور ان کے برے اعمال کو کس پیمانے سے ناپیں گے کہ ان سے کہیں یہ بات بری ہے اس سے بچو؟ جب صورتحال یہ ہو تو حکمت عملی ہی سے کام لینا چاہیے، ان انسانی اور فطری اقدار ہی کو ابھار کر کام لینا چاہئے جو عام انسانوں میں بھی تسلیم شدہ ہیں اور اس پیمانے سے برائی اور بھلائی کا فرق کرتے ہیں، یہ اقدار کہاں سے حاصل ہوتی ہیں؟ ایسے ہی وقت اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ'' کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں سوجھ بوجھ، اعتدال و توازن کا انداز اپنانا ضروری ہوتا ہے، اور ایسے سیاسی اتحاد اور تنظیموں کے قیام کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک دوسرے کو سہارا دیتی ہیں اور کتاب و سنت کی

روشنی میں چلتی ہیں اور اپنے لوگوں کو اختلاف اور باہمی جھگڑوں سے بچاتی ہے اور ان کو حکمت، اچھی نصیحت اور عمدہ اُسوہ اپنانے کی طرف متوجہ کرتی ہے، اور یہ بات اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب شریعت خداوندی کو اس کا سرچشمہ مانا جائے۔ اس لئے کہ صرف شریعت ہی لوگوں کو جوڑتی اور یکجا کرتی ہے اور خواہشات پر کنٹرول کرتی ہے، لیکن جب لوگ قانون خداوندی سے دور ہوتے ہیں تو پھر ہر شخص اپنی خواہشات نفسانی کا غلام ہوتا ہے اور لوگوں کی خواہشات قانون کی پابند نہیں ہوتیں۔ ایسے ہی یہ جماعتیں اور مختلف قوموں کا باہمی اتحاد بھلے افراد اور مصلحین تیار کرتا ہے اور امت کے اندر مصلحین کا پایا جانا امت کے امن واطمینان اور عمومی ہلاکت سے بچاؤ کا کام کرتا ہے۔ اگر امت میں مصلحین کی یہ قسم نہ پائی گئی خواہ امت میں صالح افراد موجود ہی کیوں نہ ہوں، اللہ کا عذاب پوری امت پر آئے گا، اس میں نیک و بد کی تمیز نہ رہے گی۔ اس لئے کہ نیک لوگوں نے برائی پر نکیر کرنے سے اور روکنے سے خاموشی اختیار کی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے خدائی حکم کو پس پشت ڈالنے کا ارتکاب کیا، لہٰذا یہ بھی عذاب کی سزاوار قرار پائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ بالکل کشتی کے سواروں کی طرح ہے۔ جو لوگ کشتی کے اوپری حصہ میں ہیں وہ اگر نچلے حصے کے لوگوں کو کشتی میں سوراخ کرنے دیں گے اور کہیں گے کہ یہ شخصی آزادی ہے، انہیں اختیار ہے جو چاہیں کریں تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ کشتی ڈوب جائے اور پورا معاشرہ ہلاک ہوجائے گا اور اگر اوپر کے لوگوں نے نیچے کے لوگوں کا ہاتھ پکڑ لیا اور کشتی میں سوراخ کرنے سے منع کیا اور کہا کہ ایسی شخصی آزادی نہیں دی جاسکتی، جس سے پورا ملک تباہ ہو، اس شخصی آزادی سے روکنے کے نتیجہ میں سبھی لوگوں کی جان بچ جائے گی۔ یہی حال معاشرے کا ہے کہ جو لوگ اللہ کے حکموں کو توڑتے ہیں وہ اپنی بدعملی کے ہتھوڑے سے معاشرے کی کشتی میں سوراخ کرتے ہیں، اب اگر مصلحین ان کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور انہیں معاشرہ کو نقصان پہنچانے سے روکتے ہیں تو سب کے سب نجات پائیں گے۔ اس کے برعکس اگر مصلحین نے ان کو ان کی کجروی پر چھوڑ دیا اور ان پر نکیر کرنے کا کام دوسرے پر ٹالا تو سب کے سب ہلاک ہوجائیں گے۔

حدیث کا فقہی پہلو

اس پر تمام اہل علم متفق ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض عین یا فرض کفایہ

ہے، ابن حزم کی رائے ہے کہ ابوسعید کی حدیث مرفوع ''تم میں سے جو شخص بھی برائی دیکھے اس کو اپنے ہاتھ سے روک دے، الخ''۔ امر بالمعروف فرض عین ہے، جمہور اہل علم کے نزدیک فرض کفایہ ہے اور یہی زیادہ قرین قیاس و مطابق نص قرآنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران:۱۰۴)

''اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے۔''

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے معلوم ہوا کہ برائی سے روکنا اور بھلائی کا حکم دینا، مسلمانوں کے اس باہمی تعاون اور ایک دوسرے کی خبر گیری کا ایک حصہ ہے، جس کو اللہ نے مقرر فرما دیا ہے کہ مسلمان باہم ایک دوسرے کی کفالت کرتے ہیں اور ان کے کام آتے ہیں مثلاً مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ سب لوگ بھر پیٹ کھانا کھا رہے ہوں اور وہیں ایک مسلمان فاقہ کر رہا ہو۔

(۲) بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا فکری و اخلاقی خرابی میں مبتلا ہونے سے بچانے کا ضامن ہے۔ فکر و اخلاق کا یہ بگاڑ معاشرے کے اندر جراثیم کے ذریعہ پھیلنے والی بیماریوں کے خطرہ سے کم نہیں۔ بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا، خدائی پکڑ اور عذاب سے بچاؤ ڈھال ہے جو ایسے معاشروں پر نازل ہوتا ہے جن میں فساد و بگاڑ پھیل جاتا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دینے والے معاشرہ کو بھی اس طرح سزا دیتا ہے کہ اس پر کسی باہر کے دشمن کو مسلط کر دیتا ہے جو انہیں تکلیف پہنچاتا ہے اور ان کے ملک پر قبضہ کر لیتا ہے، جیسا کہ اندلس میں پیش آیا کہ جب اہل اندلس میں برائیاں پھیل گئیں اور ان سے روکنے والے نہ رہے تو مسلمانوں کی عزت خاک میں

مل گئی اور نصاریٰ نے ان کو اپنے ظلم و جور کا نشانہ بنایا۔

(۴) جب مسلمان اپنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا شعار چھوڑ دیتے ہیں اور ان پر خدائی مار پڑنی شروع ہو جاتی ہے، تب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور دعا شروع کر دیتے ہیں لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ ان کی دعا نہیں قبول کرتا، جیسا کہ حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے، حضور ﷺ نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضرور کرتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر عذاب بھیج دے گا پھر تم دعا کرو گے اور تمہاری دعا قبول نہ ہوگی۔

(۵) حدیث سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کوتاہی کرنا معاشرہ کے اندر معاشی مسائل پیدا کر دیتی ہے، معاشرہ فقر و تنگی میں مبتلا ہو جاتا ہے، حالانکہ معیشت کے آسان ذرائع اور وسائل موجود ہوتے ہیں۔

(۶) اسلامی معاشرہ دو قسموں میں بٹا ہوتا ہے۔ ایک وہ قسم ہوتی ہے جس کو قرآن کریم

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ۔ (التوبۃ:۷۱)

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔''

دوسری قسم وہ ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ۔ (التوبہ:۶۷)

''منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ہم جنس (یعنی ایک ہی طرح کے) ہیں کہ برے کام کرنے کو کہتے اور نیک کاموں سے منع کرتے ہیں۔''

ان دونوں قسموں میں سے جس کی کثرت ہوتی ہے وہی معاشرہ کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا معاملہ ہے جس پر امت کی اسلامی روش اور شناخت مرتب ہوتی ہے۔

(۷) یہ حدیث ان لوگوں کے لئے نہایت ہی بلیغ، آسان اور قابل فہم مثال ہے جنہوں نے

آزادی کا غلط مطلب سمجھا اور اس ہنگامہ خیز دنیا میں اپنی خواہشوں اور رجحانات کے پیچھے چل پڑے۔ دوسری مثال ان لوگوں کی سامنے آجاتی ہے جو برائی دیکھ کر اس سے نظر پھیر لیتے ہیں اس کے ازالہ کی کوشش نہیں کرتے۔

(۸) حدیث سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے آداب میں سے ہے کہ داعی میں ذیل کی صفات پائی جاتی ہوں۔ (۱) علم (۲) حلم (۳) صبر (۴) عدل۔ اچھے اخلاق اور حکمت، حکمت کا لفظ ایسا ہے کہ اپنے اندر بڑی باریکی اور گہرائی رکھتا ہے جس طرح کا ماحول اور وقت کے تقاضے ہوں گے اسی کی رعایت کرتے ہوئے حکمت عملی اپنائی جائے گی۔

حدیث - ۱۹

ہر نبی کے کچھ مخلصین ہوتے ہیں

عن عبداللّٰہ بن مسعود ان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما من نبی یعثۃ اللّٰہفی امۃ قبلی الاکان لہ من امہ حواریون واصحاب یاخذون بسنۃ ویقتدون بامرہ ثم انھا تخلف من بعدھم خلوف یقولون۔ مالا یفعلون ویفعلون مالایومرون۔ فمن جاھدھم بیدہ فھو مومن ومن جاھدھم بلسانہ فھو مومن ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل۔ (شرح صحیح مسلم نووی ج۲)

''حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کسی قوم میں جو بھی نبی بھیجا ہے اس کی امت میں سے اس کے کچھ خواص اور ساتھی ہوتے رہے ہیں جو اس کے طریقہ کو اپناتے اور اس کے حکم کی تعمیل کرتے، پھر ان کے بعد ایسے برے لوگ آئے جو ایسی باتیں کہتے جن پر وہ خود نہ عمل کرتے اور وہ کرتے جس کا حکم نہ دیا جاتا، جس نے ایسے لوگوں سے قوت وطاقت سے جہاد کیا، وہ مومن ہے اور جس نے زبان سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے دل سے جہاد کیا وہ مومن ہے اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں رہ جائے گا۔''

دعوتِ اسلامی کو اس کے دائمی سفر میں اس تغیر پذیر اور نت نئے حالات سے سابقہ پڑنے والی دنیا میں ایسے صاحبِ عزیمت مردانِ کار کی ضرورت رہتی ہے، جو اخلاص کی دولت سے بہرہ ور ہوں آزمائش کی گھڑیوں میں ثابت قدم رہیں اور دشواریوں کے وقت جہاد کے بلند معانی اور مقاصد کو عملی جامہ پہنانے اسلام کا جھنڈا بلند کرنے اور اس کے لئے جانفشانی وقربانی کی راہیں کھولنے میں ایک لمحہ کے لئے بھی شک وتذبذب کا شکار نہ ہوں۔ اس راہ کی پر پیچ و پرخار گھاٹیوں میں جب دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے تو اس سے جان چھڑانے اور زندگی کی محبت

میں بعض نفوس کمزوری کا شکار ہو کر آرام کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسلام اس بشری کمزوری کا علاج کرتا ہے اور ان کو متاثر کرنے اور شوق دلانے والے ثواب وجزا کا اعلان کرتا ہے اور ان کو یہ ارشاد ربانی سناتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظَاهِرِيْنَ. (الصف:۱۴)

''مومنو! خدا کے مددگار بن جاؤ جس طرح عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون ہیں جو خدا کی طرف (بلانے میں) میرے مددگار ہوں؟ حواریوں نے کہا کہ ہم خدا کے مددگار ہیں تو بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ تو ایمان لے آیا اور ایک گروہ کافر رہا، آخر الامر ہم نے ایمان لانے والوں کو ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد دی اور وہ غالب رہے۔''

قرآن کریم اس آیت میں باہم جڑی ہوئی ان کڑیوں کو بیان کرتا ہے، جو ایک دوسرے کو محفوظ رکھتی ہیں اور یہ کڑیاں اپنی حقیقت میں ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں اور ان سب کا رُخ ایک ہوتا ہے، جس کی ایک ایک کڑی آسمان سے لے کر زمین تک ایک طویل سلسلے سے جڑی ہوتی ہے اور امتحان وآزمائش کے کانٹوں سے پر ہوتی ہے، قدم قدم پر جاں نثاری وقربانی سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان تمام حالات میں دعوت اسلامی کو مخلصین مومنین کی ضرورت ہوتی ہے۔ جان پر کھیل جانے والے اس مجاہد اور دین کی پاسبانی کرنے والے مومن کی ضرورت ہوتی ہے، جو انبیاء کرام کا قائم مقام ہو، وہ علماء اور داعی ہوں جو انبیاء کرام کی نیابت کا فریضہ انجام دیں۔ مشکلات جتنی ہی بڑھتی جائیں گی اور دعوت کے لئے حالات جتنے تنگ ہوتے جائیں گے حوارین (مخلصین) کی ضرورت بھی اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ دعوت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ رہا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ، اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا

مُسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران:۵۲)

''جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے نافرمانی (اور نیت قتل) دیکھی تو کہنے لگے کہ کوئی ہے جو خدا کا طرفدار اور میرا مددگار رہو۔حواری بولے کہ ہم خدا کے (طرفدار اور آپ کے) مددگار ہیں، ہم خدا پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہیں کہ ہم فرمانبردار ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے دین کے سلسلے میں اس کی دعوت، اس کے طریق کار و نظام کو ماننے اور اس کی طرف بلانے میں کون ہمارا معاون ہے، اس دین کی پاسبانی میں کون ہمارا مددگار ہے؟ ایسے نازک موقعوں پر حضورﷺ ایام حج میں فرماتے تھے: ''کون شخص ہے جو مجھ کو پناہ دے تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں؟ قریش نے میرے رب کے پیغام کو پہنچانے سے مجھے روک دیا ہے۔'' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے لوگوں میں اوس وخزرج کو آپﷺ کا ہمنوا بنادیا۔ انھوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ کی مدد کی اور وعدہ کیا کہ اگر آپ ہجرت فرما کر مدینہ آجائیں تو ہم ہر طرح سے آپ کی حفاظت کریں گے۔ چنانچہ جب آپ نے اپنے صحابہؓ کے ساتھ مدینہ ہجرت فرمائی تو ان دونوں قبیلوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اسی لیے اللہ اور اللہ کے رسول نے ان کو انصار کہا اور یہ ان کی شناخت اور پہچان بن گئی۔ آپﷺ اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور کہتے ہیں ''مجھ سے پہلے اللہ نے جس قوم میں بھی کوئی نبی بھیجا ہے، اس امت میں اس کے کچھ حواری اور ایسے ساتھی ہوئے ہیں جو اس طریقے کو اپناتے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے۔''

آپﷺ کے حواری (صحابہ) آپﷺ سے محبت میں ایسے نرالے تھے کہ انبیاء اور رسولوں کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، اس کا سب سے بڑا ثبوت ذیل کی آیت ہے۔

اِذْقَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يَا عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ قَالَ اتَّقُوااللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ۔ قَالَ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْداً لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۔ (المائدۃ:۱۱۲۔۱۱۴)

''(وہ قصہ بھی یاد کرو) جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا تمھارا پروردگار

ایسا کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے (طعام کا) خوان نازل کرے؟ انھوں نے کہا کہ اگر ایمان رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو۔ وہ بولے کہ ہماری یہ خواہش ہے کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل تسلی پائیں اور ہم جان لیں کہ تم نے ہم سے سچ کہا ہے اور ہم اس (خوان کے نزول) پر گواہ رہیں۔''

تب عیسیٰ بن مریم نے دعا کی: اے پروردگار! ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ ہمارے لیے (وہ دن) عید قرار پائے۔ حضرت عیسیٰؑ اور حواریوں کا یہ مکالمہ حضرت عیسیٰؑ کی قوم کے مخلصین کی طبیعت کو واضح کرتا ہے، ان میں اور اصحاب رسول ﷺ میں کتنا فرق ہے۔ آپ ﷺ کے صحابہؓ نے اسلام لانے کے بعد جب ان کے دل میں ایمان کی بشاشت پیدا ہوگئی اور اسلام قبول کرلیا تو پھر کسی ایک معجزے کا بھی مطالبہ نہیں کیا، وہ دل کے یقین کے ساتھ ایمان لائے، انھوں نے اپنے رسول کی تصدیق کی اور ان کی صداقت پر کسی دلیل کا مطالبہ نہیں کیا۔ سوائے قرآن کریم کے کہ وہ خود ایک معجزہ ہے۔

بلا کسی معجزے کے انھوں نے آپ ﷺ کی نبوت کی شہادت دی، آپ ﷺ کی سنت کو اپناتے اور حکموں کو بجالاتے، آپ ﷺ کی محبت میں جان پر کھیل جاتے، آپ ﷺ کے صحابہ کی ایک بڑی جماعت حبّ رسول میں دیگر انبیاء کے حواریوں سے بہت ممتاز و فائق تھی، حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ میں نے آپ ﷺ سے تنہائی میں ملاقات کی، اور عرض کیا کہ آپ ﷺ کے صحابہ میں کون حضرات آپ ﷺ کو زیادہ محبوب ہیں تاکہ میں ان سے محبت کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: (بتاتا ہوں) لیکن جب تک میں زندہ ہوں اس کو پوشیدہ رکھنا۔ مجھ کو سب سے زیادہ ابوبکرؓ، پھر عمرؓ اس کے بعد علیؓ سے محبت ہے۔ اس کے بعد تو زبیر، طلحہ، سعد، ابوعبیدہ، معاذ، ابوطلحہ، ابوایوب، اور ابوعبیدہ خود تم۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۶)

چونکہ حواری کا لفظ اپنے مفہوم میں گہرائی اور وسعت رکھتا ہے اس لئے اس کا مطلب بیان کرنے میں اہل لغت کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا۔ انبیاء کرام کے مخلصین حواری کہلاتے ہیں، بعض نے اس کے معنی مجاہدین کے لئے ہیں، بعض نے کہا جو جانشینی کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ لفظ کی اہمیت اور معنی کی نزاکت کے پیش نظر حضور ﷺ متعدد مناسبتوں اور نازک مواقع پر اس کو واضح فرماتے رہے، دعوتِ اسلامی کا قافلہ بہت کٹھن اور دشوار منزلوں سے گزرا ہے، ان کٹھن گھڑیوں میں ایک بہت نمایاں مرحلہ غزوۂ احزاب کا تھا، جس کی تصویر کشی قرآن مجید نے

اس طرح کی ہے:

اِذْ جَآءُ وْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا، هُنَالِكَ ابْتُلِىَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۔

(الاحزاب: ۱۰، ۱۱)

''جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی طرف سے تم پر چڑھ آئے اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے اور تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے وہاں مومن آزمائے گئے اور سخت طور پر ہلائے گئے۔''

یہ آیتیں مدینہ منورہ کے اس خوف، گھبراہٹ اور پریشانی کو بیان کرتی ہیں، جس نے مسلمانوں کو ہر چہار طرف سے گھیر لیا، مشرکین قریش، غطفان، بنوقریظہ کے یہود سب متحدہ محاذ بنا کر ہر طرف سے چڑھ آئے تھے اوپر سے بھی نیچے سے بھی۔ ہر شخص پر پریشانی چھائی ہوئی تھی۔ اگر فرق تھا تو یہ کہ مومنین کے قلوب نے اس کو قبول کیا اور دل میں اللہ تعالیٰ کی نصرت کے بارے میں طرح طرح کے خیالات آئے، وہ اس سخت گھڑی میں ثابت قدم رہے، اسباب ونتائج اور دینی قدروں کا دل میں خیال لاتے رہے، یہ ایسی زبردست آزمائش اور امتحان کی کٹھن گھڑی تھی کہ قرآن کریم کے الفاظ ''واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر'' اس خوف وہراس کے ہر چہار طرف سے خطرہ کا نہایت صحیح نقشہ کھینچتے ہیں، ''وتظنون باللہ الظنونا'' ایسا طرز ادا ہے جو بے چینی کی حالت اور دل کے اندر پیدا ہونے والے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔

اسی مشکل ترین گھڑی میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''کون ہے جو دشمن کے حالات معلوم کر کے آئے؟ جواب میں حضرت زبیرؓ نے فرمایا میں! آپ ﷺ نے پھر فرمایا: کون ہے جو دشمن کے حالات معلوم کر کے آئے؟ حضرت زبیرؓ نے کہا، میں۔ اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ہر نبی کے حواری ہوتے ہیں ہمارے حواری زبیرؓ ہیں۔ (فتح الباری، کتاب الجہاد باب فضل الطلیعۃ ۶/۵۲)

غزوۂ احزاب کے موقعے پر حضور ﷺ جس آخری درجہ کے خوف وخطرہ سے گزرے، دعوت اسلامی اکثر وبیشتر اس طرح کے خطرات سے یا اس کے قریب تر خطرات سے

گزرتی رہتی ہے۔ یہ رہبر کی ذمہ داری ہے کہ ایسے نازک اور اہم کاموں کی ذمہ داری نہایت مخلص لوگوں کے حوالہ کرے۔ جو حواری کے مصداق ہوں اور آزمائش کے کڑوے گھونٹ پی چکے ہوں۔ جو دعوت کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکیں۔ جیسا کہ زبیر بن العوامؓ نے بچپن ہی سے اس راہ کے کڑوے گھونٹ پیئے تھے۔

محمد بن مسلمہ وغیرہ کا بیان ہے کہ ہماری راتیں بھی دن کی معرکہ آرائی کی طرح گزرتی تھیں، ادھر مشرکین آپس میں باری لگاتے تھے۔ ایک دن ابوسفیان بن حرب اپنے لوگوں کے پاس آتا، ایک دن عمرو بن العاص، ایک دن خالد بن ولید، ایک دن ہبیرہ بن وہب، ایک دن عکرمہ بن ابی جہل اور ایک دن ضرار بن خطاب۔ آزمائش کی یہ گھڑی کٹھن سے کٹھن تر ہوتی گئی اور ایسے نازک وقت میں حضور ﷺ نے آواز دی۔ حضرت زبیرؓ نے جواب دیا لبیک آپؐ نے پھر آواز دی، اس بار بھی حضرت زبیرؓ نے جواب دیا، آپ ﷺ نے فرمایا ہر نبی کے حواری ہوتے ہیں، ہمارے حواری زبیر بن عوامؓ ہیں۔ (فتح الباری، کتاب الجہاد)

یہ آپؐ کی پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے، یہ ان دس میں سے ایک تھے، جن کو دنیا ہی میں جنت کی خوش خبری دی گئی تھی۔ چھ اہل شوریٰ میں سے بھی ایک تھے، کم عمری ہی سے جرأت مندانہ اقدام میں مشہور تھے۔

حضرت عروہ سے روایت ہے کہ زبیرؓ آٹھ سال کی عمر میں ایمان لائے، ایک دن یہ شیطانی آواز سنائی دی کہ حضور ﷺ مکہ کے بالائی حصہ میں پکڑ لئے گئے، یہ سن کر زبیرؓ جو ابھی کل بارہ برس کے تھے تلوار لے کر نکل پڑے جس نے بھی انھیں دیکھا حیرت میں پڑ گیا، حتیٰ کہ وہ حضور ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا زبیرؓ کیا بات ہے؟ حضرت زبیرؓ نے جواب دیا مجھے خبر ملی کہ آپؐ پکڑ لئے گئے ہیں، آپؐ نے فرمایا اگر میں پکڑ لیا گیا ہوتا تو تم کیا کرتے، جواب دیا تلوار سے آپ کو پکڑنے والے کی گردن اڑا دیتا، آپ ﷺ نے ان کے اور ان کی تلوار کے لئے دعا فرمائی۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۱/۴۱،۲۴)

حدیث - ۲۰

یتیم کی کفالت کے فضائل

عن سھل قال رسول اللہ ﷺ انا وکافل الیتیم فی الجنة ھکذا واشاربالسبابة والوسطی وفرج بینھما شیئا۔ (فتح الباری، ج۹۔ صحیح مسلم (شرح النووی) ج۱۸)

حضرت سہل سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''میں اور یتیم کی کفالت (دیکھ بھال) کرنے والا جنت میں اس طرح (قریب) ہوں گے، آپؐ نے شہادت کی انگلی اور درمیان کی انگلی اٹھا کر اشارہ فرمایا کہ اس طرح (قریب) ہوں گے، دونوں انگلیوں میں تھوڑا سا فاصلہ رکھا۔

اسلامی معاشرے میں اجتماعی زندگی کا خیال اسلام کا بنیادی قاعدہ ہے، مسلمانوں کی جماعت پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کمزوروں، بیواؤں، مسکینوں اور یتیموں کی ضروریات کا خیال رکھیں۔ قرآن وحدیث کا مطالعہ کرنے والا محسوس کرے گا کہ یتیم کے بارے میں زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یتیم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ جماعت ان کی نگہبانی کرے، ان پر مہربان ہو، خود ان کی بھی دیکھ بھال کرے اور ان کے مالوں کی بھی حفاظت کرے۔ عہد رسالت میں یتیموں کے بعض سرپرست یتیموں کے کھانوں کو اپنے کھانے کے ساتھ ملا لیتے تھے، ان کے مالوں کو کاروبار کی غرض سے اپنے مالوں میں ملا دیتے تھے، جس سے کبھی کبھی یتیموں کا نقصان ہو جاتا تھا، لہٰذا قرآن کریم نے یتیموں کا مال کھانے سے منع کیا۔ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡماً اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِھِمۡ نَارًا وَّسَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡراً (النساء:۱۰)

''جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔''

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ آیت بنوغطفان کے مرثد بن زید نامی شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنے کم عمر بھتیجے کے مال کے ذمہ دار تھے اوراس کا سارا مال کھا گئے، اسی کے بارے میں آیت نازل ہوئی۔ جمہور کا قول ہے کہ آیت سے مراد یتیموں کے سرپرست ہیں جو یتیموں کا وہ مال کھاتے ہیں جوان کے لئے درست نہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن، ج۵،ص۵۳)

اسلام ہمیشہ سے اان مسائل وضروریات کا مداوا کرتا رہا ہے، جن کی امت مسلمہ کو ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔لوگوں کی مشکلات حل کرنا لوگوں کو قریب کرتا ہے، روح ودل کو ملاتا ہے تاکہ معاشرے میں باہمی ربط وتعلق قائم ہو۔اس اسلامی روح کا تقاضا تھا کہ یتیموں کی ضروریات کی دیکھ بھال کو اہمیت دی جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاٰتوا الْیَتٰمیٓ اَمْوَالَهُمْ وَلَاتَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ وَلَاتَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰیٓ اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْباً كَبِیْراً (النساء:۲)

''اور یتیموں کا مال (جو تمہاری تحویل میں ہو) ان کے حوالے کردو اوران کے پاکیزہ (اور عمدہ) مال کو (اپنے ناقص اور) برے مال سے نہ بدلو اور نہ ان کا مال اپنے مال میں ملا کر کھاؤ۔کہ یہ بڑا سخت گناہ ہے۔''

آیت کریمہ میں یتیموں کے سرپرستوں یا جن کو ان کی دیکھ بھال کی وصیت کی گئی ہے، ان کو مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ آیت مقاتل اور کلبی کے بقول بنوغطفان کے ایک شخص کے بارے میں اتری ہے، جس کے پاس اس کے یتیم بھتیجے کا بہت سا مال تھا، جب یتیم بالغ ہوگیا، تواس نے اپنا مال مانگا اس کے چچا نے مال دینے سے انکار کردیا، انکار کے بعد یہ آیت نازل ہوئی، آیت سنتے ہی چچا نے کہا کہ اس بڑے گناہ سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں اور پورا مال یتیم بھتیجے کے حوالے کردیا۔حضورﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اپنے نفس کے لالچ سے بچالیا گیا اوراس سے (اس شخص کی طرح) رجوع کرلیا تو وہ اپنے گھر (جنت) میں داخل ہوجائے اس یتیم نے جب مال پر قبضہ کرلیا تو پورا مال اللہ کی راہ میں خرچ کردیا۔اس پر آپﷺ نے فرمایا: ''اجر تو ثابت ہوگیا اور بوجھ باقی رہ گیا۔'' آپ سے سوال کیا گیا اللہ کے رسول یہ کیسے؟ آپ نے جواب دیا اجر تو لڑکے کے لئے ثابت ہوگیا اور بوجھ اس کے باپ پر باقی رہا اس لئے کہ وہ مشرک تھا۔

(الجامع لاحکام القرآن، ج۵ص۸۔)

اسلام حوادث وواقعات کا اسی طرح محاسبہ کرتا رہتا تھا اور برسرِ عام اس کا حل پیش کرتا تھا کہ وہ امت کے لیے دستور حیات بنے، پوری انسانیت کے لئے چراغ راہ بنے، امت اسی سے روشنی حاصل کرے اور اسی کی رہنمائی میں چلتی رہے۔

ان تعلیمات کے ذریعے اسلام مسلمانوں میں باہم بھائی چارہ اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کی روح پیدا کرنا چاہتا ہے اور ان کمزوروں اور محتاجوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ڈالنا چاہتا ہے، یتیموں اور مسکینوں پر نظر لطف وکرم ڈالنے کی ہدایت دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ (الانعام:۱۵۲)

''اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا مگر ایسے طریق سے کہ بہت ہی پسندیدہ ہو یہاں تک کہ وہ جوانی کو پہونچ جائے اور ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو۔ ہم کسی کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق اور جب (کسی نسبت) کوئی بات کہو تو انصاف سے کہو، گو وہ تمہارا رشتہ دار ہی ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو، ان باتوں کا خدا تمھیں حکم دیتا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو۔''

مدینہ منورہ کا معاشرہ نئی اقدار کا منتظر تھا اور یہ چاہتا تھا کہ اس کے نقوش واحکام واضح ہوں اور وہ اس کو کھلے دل سے قبول کر لے، حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اور دوسری آیت اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا الخ تو جن صحابہ کرام کی کفالت میں یتیم تھے انھوں نے آیت سننے کے بعد جا کر ان یتیموں کے کھانے پینے کو اپنے کھانے پینے سے الگ کرلیا، اب اگر یتیم کے کھانے پینے میں سے کچھ بچ رہتا تھا تو اس کو کھانے کے بجائے محفوظ رکھتے تھے کہ یتیم دوسرے وقت کھائے گا اور نوبت یہاں تک پہونچتی کہ وہ کھانا خراب ہو جاتا مگر صحابہ کرامؓ اس کو خود نہیں کھاتے تھے اس بات نے صحابہ کرامؓ کو مشکل میں ڈال دیا انھوں نے جا کر حضور ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ۔ (البقرة:۲۲۰)

''اور تم سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہدو کہ ان کی (حالت کی) اصلاح بہت اچھا کام ہے، اور تم ان سے مل جل کر رہنا (یعنی خرچ اکٹھا رکھنا) چاہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔''

راوی کہتے ہیں کہ پھر اس کے بعد ان کے کھانوں اور مشروبات کو اپنے کھانوں سے ملایا۔ یہ ابوداؤد کی روایت ہے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد: حَتّٰی يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ کی تشریح امام شعبی، امام مالک اور دوسرے اسلاف سلف نے یہ کی ہے کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جائے۔ بلوغ کی تعبیر سوتے میں غسل حاجت سے کی ہے۔

یہ ایک ہی آیت بہت سی مشکلات کا حل بتاتی ہے اور بہت سے تربیتی طریقوں کا سجھاؤ دیتی ہے، جیسے یتیم کی کفالت کے مسائل اور دشواریاں، ناپنے اور وزن کرنے میں امانت کا ثبوت دینا، قول وعمل میں انصاف کو قائم رکھنے کی ذمہ داری، رشتوں کو جوڑے رکھنا، وعدے کا پورا کرنا، یہ سارے مسائل ایسے ہیں جو زندگی کا لازمہ ہیں اور برابر پیش آتے رہتے تھے، صحابہ کرام کو ان سے سابقہ پڑتا رہتا تھا، ایسی صورت میں لوگوں کو انتظار رہتا تھا کہ نئے مسئلہ کے لئے نیا حکم آئے گا، قرآن کریم ان مسائل کا کیا حل پیش کرتا ہے، ان میں سب سے نازک مسئلہ یتیم کا تھا۔

اس آیت کریمہ کے نازل ہوتے ہی صحابہ کرام نے اس پر فوری عمل شروع کر دیا اور یتیم کے کھانے کو اپنے کھانے سے (یا ان کے غلہ کو اپنے غلہ سے) الگ کرلیا، اور ان کی زندگی ذیل کی آیت نازل ہونے سے قبل خوشگوار نہ ہوسکی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وان تخالطوهم فاخوانكم''۔ (البقرہ:٢٢٠) (اور رہنا سہنا مشترک رکھو آخر وہ تمہارے بھائی بند ہی تو ہیں)

یتیم کا خیال رکھنا اور ان کی نگہداشت، دلوں کی تربیت کا بڑا موثر ذریعہ ہے، یہ امانت ورحمت کے حقیقی معنی کو سمجھنے میں بڑا اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر اسلام نے یتیموں پر اپنا مال خرچ کرنے پر ابھارا اور شوق دلایا ہے، ارشاد ربانی ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَمَاتَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ۔ (البقرۃ:٢١٥)

''اے محمد لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کس طرح کا مال خرچ کریں کہہ دو کہ (جو چاہو خرچ کرو لیکن) جو مال خرچ کرنا چاہو وہ (درجہ بدرجہ اہل استحقاق یعنی ماں باپ کو اور قریب کے رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو

(سب کو دو) اور جو بھلائی تم کرو گے خدا اس کو جانتا ہے۔''

فی سبیل اللہ انفاق کے سلسلہ میں اور بھی بہت سی آیات گزر چکی ہیں لیکن اس آیت میں انفاق کا ذکر اس ماحول کو بتاتا ہے، جس میں مسلمانوں کی نشو ونما ہوئی ہے۔ مثلاً: جہاد، اللہ کے راستے میں نکلنا، مگر یتیم پر خرچ کرنے کا حکم یتیم کی دستگیری کے لئے ہوئی ہے کہ وہ بے سہارا ہے اپنے بھلے برے کو سمجھتا بھی نہیں، سر سے مشفق باپ کا سایہ اٹھ جانے کے بعد اس کی آس ٹوٹ چکی ہے، دل بجھ چکا ہے لہٰذا جو شخص اس معصوم کلی کو سہارا دے گا وہ واقعی اس قابل ہوگا کہ حضور کے فرمان کے مطابق جنت میں آپ کا پڑوسی بنے۔ (شرح مسلم للنووی، ج ۱۸)

یہ تو انفاق کا ایک پہلو ہوا، دوسرے پہلو سے یہ آیت مجاہد کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ جو اپنے اعزہ واقرباء اور اولاد کو چھوڑ کر میدان کارزار کی طرف نکلتا ہے اور اللہ کی رضا کے سامنے کسی کی کوئی پروا نہیں کرتا، اپنے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں تک کا خیال نہیں کرتا کہ ان کا کیا ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے حضور ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاہد فی سبیل اللہ خیال پڑتا ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا: ''کالقائم لایفترو کالصائم لایفطر'' (بیواؤں اور غریبوں کی فکر رکھنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے) راوی کہتے ہیں کہ خیال پڑتا ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا: بیواؤں اور غریبوں کی دیکھ بھال کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو برابر تہجد پڑھتا رہے اور ذرا سستی نہ برتے اور برابر روزہ رکھتا ہو کبھی روزہ چھوڑے نہیں۔)

یتیم کے معاملات کی نگرانی اس کی تمام ضروریات پر مشتمل ہے خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو، مثلاً مال کی حفاظت اور اس کو مزید بڑھانے کی فکر کے ساتھ اس کی تعلیم و تربیت، اس کے مناسب حال کسی کاریگری یا پیشہ کا سکھانا، ایسے ہی اس کے مال میں فضول خرچی سے بچنا اس کی دلداری کا پورا خیال رکھنا، اس سے پیار کرنا، سر پر ہاتھ پھیرنا، پیشانی کو بوسہ دینا، اس کو خوش وخرم رکھنے کی کوشش کرنا کہ اس کو اپنی بیچارگی کا احساس تک نہ ہو اسلام اس تربیتی توجہ نامہ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ حضرت عکرمہ بن عباس سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جس نے مسلمانوں میں سے کسی یتیم کو اپنے کھانے پینے میں شریک کیا اللہ تعالیٰ اس کو ضرور جنت میں داخل کرے گا، سوائے اس کے کہ وہ کوئی ایسا گناہ کر بیٹھے جو نا قابل معافی ہو۔''

علماء نے یتیم کے حقوق و پرورش سے متعلق تمام حدیثوں اور حضرت سہل بن سعدؓ کی

حدیث جو اوپر مذکور ہوئی اس پر ہر پہلو سے غور فرمایا! اس کے بعد ابن بطال کہتے ہیں کہ جس شخص نے یہ حدیث سنی اس کو اس پر عمل کرنا چاہئے تاکہ وہ جنت میں حضور ﷺ کا ساتھی بنے، جس سے بڑھ کر جنت میں کوئی درجہ نہیں۔

ان باتوں سے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اسلام نے یتیموں کے حقوق اور ان کی دیکھ بھال کا کتنا خیال کیا۔ گویا اسلام نے تمام مسلمانوں کو یتیموں کی دیکھ بھال کے لئے تیار کر دیا ہے اور اس کو قرب خداوندی کے حصول کا بہت بڑا سبب اور عامل بتایا ہے اور اس کی ادائیگی کو نہایت بلند درجات کے حصول کا ذریعہ بتایا ہے۔

حدیث کا فقہی مفہوم

صاحبِ مرقاۃ لکھتے ہیں کہ حقوق العباد صرف یتیم کو کفالت میں لے لینے سے نہیں معاف ہوں گے۔ انھیں حقوق العباد میں یتیم کے مال کو کھانا بھی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی ایسا گناہ کر بیٹھے جو توبہ کے بغیر یا صاحب حق سے معاف کرائے بغیر نہ معاف ہوتا ہو، جس کا مطلب یہ نکلا کہ بندہ اور خدا کے درمیان کے گناہ تو توبہ سے معاف ہو جائیں گے لیکن حقوق العباد کے لئے صاحب حق سے معاف کرانا ضروری ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

یہ حدیث کہ میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا دونوں اس طرح قریب ہوں گے، اسلام کی اس روح کو بتاتی ہے کہ وہ کمزوروں، یتیموں اور مساکین اور محتاجوں میں خوشی پیدا کرنا چاہتی ہے تاکہ انہیں احساس رہے کہ وہ بے سہارا نہیں ہیں بلکہ معاشرہ ان کا کفیل ہے۔ یہ حدیث اسلامی معاشرے کے افراد میں یتیموں کی ہر طرح کی دیکھ بھال کی خوش نصیبی کی روح پھونکنا چاہتی ہے خواہ وہ مادی اعتبار سے ہو یا معنوی اور تربیتی اعتبار سے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث معاشرتی تربیت، مسمانوں میں بھائی چارہ کی روح بیدار کرنے، معاشرے میں ایک دوسرے کا تعاون کرنے اور لوگوں میں جوش جہاد پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

حدیث - ۲۱

ادائے حقوق

عن ابی هریرة ان رسول اللهﷺ قال ”لتؤدن الحقوق الی اهلها یوم القیامة حتی یقاد للشاة الجلحاء من الشاة القرناء.

(صحیح مسلم شرح نووی ج ۱۶، ۱۳۶۔ تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی ۷)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا، ”قیامت کے دن جس کا بھی حق کسی پر باقی ہوگا وہ ضرور دیا جائے گا، یہاں تک کہ کسی بے سینگ والی بکری کو سینگ والی بکری نے مارا ہوگا تو اس بے سینگ والی بکری کا حق دلایا جائے گا۔“

بعثت نبویؐ کے وقت عرب معاشرہ اس اونٹنی کی طرح بھٹک رہا تھا جس کو صاف دکھائی نہ دیتا ہو، اس زمانے میں انسان اپنے پیدا کرنے والے کو بھول چکا تھا، جس کے نتیجے میں خود اپنے آپ کو اور اپنے انجام کو بھی بھلا بیٹھا تھا۔ ان کے دل میں دین اور آخرت کا خیال ہی نہیں باقی رہا تھا۔ وہ دنیا میں اتنے مست تھے کہ روح و دل اور اپنے حالات کی درستی کا انھیں ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ لوٹ مار، ظلم و زیادتی کا دور دورہ تھا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ اس وقت کی دنیا کا یہ عالم تھا:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَاكَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِىْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔ (الروم:۴۱)

”خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے تاکہ خدا ان کو ان کے بعض عملوں کا مزہ چکھائے، عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں۔“

جب دنیا اس پستی کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا ہوا کہ وادی مکہ میں ہدایت کا سورج طلوع ہو اور عالم انسانی کو روشنی اور ہدایت سے بھر دے، چنانچہ اس بگڑے ہوئے ماحول میں حضورﷺ کی ایسی زبردست خدائی تربیت ہوئی جن کے چال چلن، اخلاق کریمانہ، عقل و فراست اور شرف کو ہر انسان محسوس کرتا تھا اور متاثر ہوتا تھا اور احترام و قدردانی کی نظر سے دیکھتا

تھا، لوگ آپ کے پاس اپنی امانتیں رکھوایا کرتے تھے، اہم معاملات ومشکلات میں آپ سے مشورہ لیتے تھے، اسی قدر دانی کا اثر تھا کہ آپ حلف الفضول میں بھی شریک ہوئے، جو عرب کا نہایت بہتر اور بلند معاہدہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کا پس منظر یہ تھا کہ زبید کا ایک شخص کچھ سامان (تجارت) لے کر مکہ آیا کہ یہاں بیچے، عاص بن وائل نے جو خاندان قریش کے معززین میں سے تھا اس کا یہ سارا سودا خرید لیا لیکن دام نہ دیئے، اس زبیدی تاجر نے معززین قریش سے فریاد کی، ان کے سامنے اپنا معاملہ رکھا لیکن عاص بن وائل کا ایسا رعب تھا کہ ان معززین نے عاص سے بات کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اس غریب کو جھڑک کر واپس کر دیا، اس کے بعد اس زبیدی نے تمام اہل مکہ سے فریاد کی اور جن لوگوں میں ہمدردی تھی ان سے مدد چاہی، چنانچہ یہ سب لوگ عبداللہ بن جدعان کے مکان میں جمع ہوئے اور اس نے سب کے کھانے کا بھی نظم کیا۔ تمام حاضرین نے اللہ سے عہد و پیمان کیا کہ وہ ایک ہو کر ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کی مدد کریں گے۔ یہاں تک کہ مظلوم کو اس کا حق مل جائے، قریش نے اس حلف (قسم) کا نام حلف الفضول رکھ دیا اور کہا کہ ان لوگوں نے ایک اچھے کام کا آغاز کیا، اس کے بعد یہ سب حضرات عاص بن وائل کے پاس گئے اور اس سے زبیدی کا مال چھین کر اس کے حوالہ کر دیا، حضور ﷺ اس عہد و پیمان سے بہت خوش تھے اور اس پر برابر قائم رہے حتیٰ کہ منصب نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ (آپ عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ہونے والے عہد و پیمان میں موجود تھے) اگر آج بھی مجھ کو اس کی دعوت دی جاتی تو میں اس کو منظور کر لیتا۔

حضور ﷺ اس انسانی انتشار اور باہمی لڑائی جھگڑوں سے نہایت قلق اور بے چینی محسوس کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن واسلام کی نعمت سے نوازا، فرمایا:

وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡكِتٰبُ وَلَا الۡاِيۡمَانُ وَلٰكِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهۡدِىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۙ (الشوریٰ:۵۲)

''اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف روح القدس کے ذریعہ سے (قرآن) بھیجا ہے تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نور بنایا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور

بے شک (اے محمدؐ) تم سیدھا رستہ دکھاتے ہو۔''

یہ تھی اسلام کی روشنی جو عدل وانصاف کا راستہ دکھاتی تھی، اچھی اور پاکیزہ زندگی کو پسند کرتی تھی اور لوگوں میں شوق وجذبہ پیدا کرتی تھی، یہ تعلیمات لوگوں کو خوف سے نجات دلاتی تھیں اور آئیڈیل مثالی راہ کا نقشہ پیش کرتی تھیں، تاکہ انسانیت اپنے مقاصد حیات میں ترقی کرے اور آگے بڑھے اور امن وامان کے گھنے سائے میں آ جائے، آپ ﷺ سیدھے راستے کی دعوت دیتے رہے، انصاف کو ضروری اور ظلم کو حرام بتاتے رہے، باہمی پیار محبت، عدل وانصاف، حق کو رائج کرتے، ایثار وقربانی کو پسندیدہ، خودرائی وکبر کو ناپسندیدہ بتاتے جس کے خاتمہ سے زندگی کا لطف دوبالا ہوتا ہے، دلوں میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔ انسان انسان میں بھائی چارہ پیدا کرنے کے لئے اسلام کی اعلیٰ تعلیمات واقدار بتاتے رہے۔

ایسی آیات قرآنی نازل ہوئیں جو اوپر بیان کئے گئے مفاہیم ومعانی کی تائید وتشریح کرتی رہیں جس کے رنگ وآہنگ پر آپ کی تربیت ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْكَانَ ذَاقُرْبٰى (الانعام:۱۵۲)

''اور جب (کسی کی نسبت) کوئی بات کہو تو انصاف سے کہو، گو وہ (تمہارا) رشتہ دار ہی ہو۔''

اور ''قُلْ اَمَرَ رَبِّىْ بِالْقِسْطِ(الاعراف:۲۹)

''کہدو کہ میرے پروردگار نے تو انصاف کرنے کا حکم دیا ہے۔''

اور اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ(نحل:۹۰)

''خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔''

اسلام حق کو حق ثابت کرنے اور ظلم کو دور کرنے کے صرف ضابطے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ وہ فرد و جماعت اور حکومت کے درمیان امن وسلامتی کا جوڑ پیدا کرتا ہے، اس میں نہ صرف مسلمان کا مسلمان سے بلکہ مسلمان کا غیر مسلم سے بھی تعلق برقرار رکھا جاتا ہے، اسلام دلوں کو جوڑنے کے لئے آیا ہے۔ ایک جماعت کو دوسری جماعت سے ملانے کے لئے آیا ہے جس کا مقصد متحدہ قومی وملی وجود ہے وہ ان اسباب وعوامل سے روکتا ہے جو اتحاد کو توڑنے اور کمزوری

و ناکامی کا پیش خیمہ بنتے ہیں، اسی لئے اہل حقوق کے حقوق ادا کرنے پر پورا زور اسلام دیتا ہے اور ایسا پاکیزہ معاشرہ قائم کرنے کی تعلیم دیتا ہے جہاں ظلم کا نام ونشان نہ ہو اور عدل وانصاف کا چلن ہو۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ حضور علیہ وسلمؐ نے فرمایا:

واتقوالظلم فانّ الظلم ظلمات یوم القیامة واتقوا الشح فان الشح اهلك من كان قبلكم، حملهم على ان سفكوا دماء هم واستحلوا محارمهم۔ (صحیح مسلم شرح النووی ج ۱۶، ص ۱۳)

''ظلم سے بچو (قیامت کے دن تاریکیوں کی صورت میں سامنے آئے گا راہ نہ سجھائی دے گی) اور بخل سے بچو کہ تم سے پہلی قومیں بخل ہی کے سبب ہلاک ہوئی ہیں، اس طرح کہ بخل نے ان کو ایک دوسرے کے قتل پر آمادہ کیا اور انھوں نے حرام کو حلال کرلیا۔

انھیں وجوہات کی بنا پر اسلام فرد و جماعت میں باہم ربط وتعلق پیدا کرتا ہے اور یہ روابط وتعلقات ظاہری نہیں بلکہ قلبی اور روحانی ہوتے ہیں۔ گھٹنے کے بجائے بڑھتے ہیں، ختم ہونے کے بجائے اس میں پائیداری واستواری آتی ہے۔ یہ مادی و عارضی روابط وتعلقات کی طرح نہیں ہوتے کہ مقصد پورا ہوا اور تعلق ختم۔ حضور علیہ وسلمؐ ذرا ذرا سی مناسبتوں پر اس تعلق کو بڑھاتے اور اس میں گہرائی پیدا کرتے رہے۔ حضرت سالمؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ 'مسلمان! مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کو حالات کے حوالے کر دیتا ہے کہ وہ اپنے کو بے سہارا محسوس کرے، جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں مشغول ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری کرتا رہتا ہے، جو شخص کسی مسلمان سے کوئی مصیبت دور کرتا ہے اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ قیامت کی مصیبتوں سے اس کی مصیبت کو دور کرے گا۔ جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسکی پردہ پوشی فرمائے گا۔ (صحیح مسلم شرح نووی ج ۱۶)

آنحضرت علیہ وسلمؐ ان بلند معانی واقدار کو عملی زندگی میں برتنے اور تطبیق دینے میں زندہ وجاوید مثال تھے۔ ظلم وزیادتی کو ختم کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے، اپنی اس صفت میں آپ علیہ وسلمؐ لوگوں میں معروف ومشہور تھے۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ ایک شخص اراش سے اپنا اونٹ لے کر مکہ پہنچا، ابوجہل نے اس سے اونٹ کو خرید لیا لیکن قیمت دینے میں ٹال مٹول کرتا رہا، وہ اراشی مجبور ہو کر قریش کی ایک مجلس میں پہنچا حضور علیہ وسلمؐ اس وقت مسجد کے ایک گوشے میں

تشریف فرما تھے اس اراشی نے کہا قریش کے لوگو! کون ایسا ہے جو مجھ کو ابوالحکم بن ہشام تک پہنچادے، میں ایک پردیسی آدمی ہوں، مسافر ہوں، اس نے میرا حق مارلیا؟ اہل مجلس نے اس سے کہا۔ یہ جو آدمی بیٹھا ہے اس کو دیکھ رہے ہو۔ (مراد) رسول اللہ ﷺ تھے، ابوجہل اور حضور ﷺ میں جو دشمنی تھی یہ لوگ خوب جانتے تھے، لہٰذا مذاق اڑانے کے طور پر کہا اس شخص کے پاس جاؤ یہ تم کو ابوجہل سے ملادے گا، چنانچہ اراشی حضور ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ اس کی بات سن کر فوراً اس کے ساتھ ابوجہل کے گھر روانہ ہوگئے اور پہنچ کر اس کا دروازہ کھٹکھٹایا، ابوجہل نے پوچھا کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا محمد! میرے پاس آؤ، وہ نکل کر آپ کے پاس آیا تو اس کے چہرے پرناگواری تھی اور رنگ بدلا ہوا تھا، آپؐ نے ابوجہل سے کہا "**اعط هذا الرجل حقه**" اس شخص کا حق دو، ابوجہل نے کہا اچھا۔ جب تک میں اس کا حق نہ دے لوں آپ یہاں سے نہ جائیں۔ راوی کہتے ہیں کہ ابوجہل اندر گیا اور اس کا حق لاکر اس کو دے دیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ واپس تشریف لائے اور اراشی سے کہا اب جہاں چاہو جاؤ، اراشی پھر قریش کی مجلس کی طرف واپس ہوا اور کہا اللہ ان کو جزائے خیر دے انھوں نے ہمارا حق دلا دیا۔ (سیرۃ ہشام، ص ۳۸۹)

یہ روایت زمانۂ جاہلیت کی بہت سی بری عادات اور طرز زندگی پیش کرتی ہے جو مکہ کے ماحول میں پھیلی ہوئی تھیں، جیسے غلط طریقے سے لوگوں کا مال کھانا اور حقوق کی ادائی میں ٹال مٹول کرنا۔

مذکورہ واقعے میں آپ ﷺ کے الفاظ "**اعط هذا الرجل حقه**" سے ایمان کی روشنی ظاہر ہوتی ہے، حق کی یہ حمایت کسی بھی ظالم کے سامنے خواہ وہ کتنا آن بان والا ہو، کسی مظلوم کے لئے خواہ وہ کتنا ہی معمولی اور گھٹیا ہو، اسلام کی روح کو ظاہر کرتا ہے جو نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے، اللہ کے حکموں کے سامنے رک جاتا ہے۔ عاص بن وائل اور ابوجہل جیسی مثالیں بہت ہیں، آپ ﷺ اور آپ کے نائبین علماء اور قاضی حضرات ان جیسوں کا مقابلہ کرنے اور روک لگانے کے زیادہ حقدار ہیں کہ انھیں بتائیں کہ (تم قیامت کے دن اہل حقوق کے حقوق ضرور بالضرور ادا کروگے) آپ ﷺ کے الفاظ لام تاکید اور نون تاکید کے ساتھ آئے ہیں جو مسلمانوں کے اندر عدل وانصاف اور کشادہ دلی کی روح کو قوت بخشتے ہیں اور ظلم وانصافی نیز جذبۂ انتقام سے رکنے اور باز رہنے کا احساس پیدا کرتی ہیں۔

قرآنی آیات مسلمانوں کو ادائے حقوق کی یاد دہانی کراتی ہیں، جن سے حدیث کا

مفہوم از خود واضح ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا، وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ۔ (الانبیاء:۴۷)

''اور ہم قیامت کے دن انصاف کا ترازو کھڑا کریں گے تو کسی شخص کا ذرا بھی حق تلف نہ کیا جائے گا اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (کسی کا عمل) ہوگا تو ہم اس کو لا کر حاضر کریں گے اور ہم حساب کرنے کو کافی ہیں۔''

مشاہدے میں آنے والی چیزوں میں رائی کا دانہ سب سے چھوٹا سمجھا جاتا ہے اور وزن میں بھی انتہائی ہلکا، یہ عمل قیامت کے دن نہیں چھوڑا جائے گا نہ رائیگاں جائے گا سبک وحساس ترازو بھی اس کو بالکل درست وصحیح تول دے گا معاملہ بالکل کانٹے کی تول سے ہوگا۔

لہٰذا ہر شخص غور کرے، سوچے کہ کل قیامت کے لئے کیا بھیج رہا ہے، اور ادائیگی حقوق میں اس سے کیا کیا کوتاہیاں ہو رہی ہیں جو لوگ حقوق کی ادائیگی میں تاخیر وٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں وہ ان کی ادائیگی میں جلدی کریں کہ اگر وہ دنیا کے عذاب سے بچ بھی گئے تو آخرت کا عذاب تو طے ہے جہاں کی ترازو بالکل ٹھیک ٹھیک اپنا کام کرے گی اور کسی شخص پر کچھ بھی زیادتی نہ کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا (النساء:۵۸)

''خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالہ کر دیا کرو۔''

حدیث کے مفہوم میں جو امانتیں شامل ہیں، انھیں میں حقوق کا اہل حقوق کو پہنچانا، معاملات میں لوگوں کے ساتھ امانت داری کا معاملہ کرنا، لوگوں کی امانتوں کو انھیں واپس کرنا، حاکم کا اپنے محکوم کے ساتھ، تابع کا اپنے متبوع کے ساتھ ٹھیک ٹھیک معاملہ کرنا، سب کچھ شامل ہے، اسی طرح جس کے ذمہ جو کام لگایا گیا ہے، اس کو پوری ذمے داری کے ساتھ انجام دینا، جماعت کی عزت اس کے مال واسباب اور سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری کا حق ادا کرے، غرض یہ کہ ہر قسم کی ذمہ داریاں ادائے حقوق میں شامل ہیں اور ان کی ادائی ضروری ہے، یہ ایسی ضروری چیز ہے کہ جانور جو غیر عاقل اور غیر مکلّف ہیں، ان تک کے بارے میں کہا گیا کہ اگر سینگ والی بکری نے بے سینگ والی بکری کو مارا تو اس کا بھی بدلہ دلایا جائے گا۔ امام نوویؒ فرماتے

ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں جانوروں کو بھی جمع کیا جائے گا، حتیٰ کہ بکری سے بکری کا بدلہ دلایا جائے گا جیسا کہ انسان کو انسان کا بدلہ دلایا جائے گا۔ اس سے ادائے حقوق کی اہمیت وتاکید کا پتا چلتا ہے، جب جانوروں کا بدلہ جانوروں سے دلایا جائے جن کو بعد میں فنا کر دیا جائے گا تو پھر انسان جو مکلّف ہے، جس کو عقل وخرد عطا کی گئی ہے، وہاں وہ اپنے کرتوت کے مطابق بھگتان بھگتے گا۔ اس کو ادائے حقوق کا بہت خیال رکھنا چاہئے۔

قرآن وحدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: (وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ حضرت عکرمہؒ حضرت عباس سے بیان کرتے ہیں کہ جانوروں کے جمع کرنے کا مطلب موت ہے ابن جریرؒ کا بیان ہے کہ بہتر قول اس شخص کا ہے جس نے یہ کہا کہ جانور اکٹھا اور جمع کئے جائیں گے، ارشاد ربانی ہے وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً (ص:۱۹) یعنی پرندوں کو جمع کیا جائے گا۔

حدیث کا فقہی پہلو

علماء کہتے ہیں کہ قیامت کے دن ساری مخلوق کو جمع کرنے اور لوٹانے کی شرط اس بناء پر نہیں کہ بدلہ اور سزا دی جائے اور ثواب دیا جائے، جہاں تک بے سینگ والی بکری کو سینگ والی بکری سے بدلہ دلانے کا تعلق ہے تو یہ اللہ کے عدل کامل کو بتانے کے لئے کہ جب غیر مکلّف مخلوق کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا (جو پھر فنا کر دی جائے گی) تو انسان جو مکلّف بنایا گیا ہے جس کو عقل اور سمجھ کے ساتھ ہدایات دی گئیں ہیں، آسمانی صحیفے نازل ہوئے ہیں رسول بھیجے گئے ہیں، اس کے ساتھ عدل وانصاف کا کیسا معاملہ ہوگا، لہٰذا اس کو حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے کتنا چوکس رہنا چاہئے۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کے حقوق ہیں، ان حقوق والوں کے حقوق ادا کئے جائیں اور بندۂ مومن اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا مظاہرہ کرے، اس پر جو ذمہ داری ڈالی جائے اس کو مکمل طریقہ پر ادا کرنے کی پوری کوشش کر ڈالے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ایک امانت ہے جس کی یہ حدیث فضیلت بیان کرتی ہے کہ انسان یعنی بندۂ مومن اپنے فرائض اور کاموں کی ادائی میں مخلص ہو، اس کو خوبصورت انداز میں انجام دینے کی فکر کرے، لوگوں کے حقوق کی جو ذمہ داری اس پر ڈالی گئی اس کے لئے راتوں کو جاگے۔

(۲) حدیث سے معلوم ہوا کہ اس سے بڑی اور انجام کے اعتبار سے بدترین کوئی خیانت نہیں کہ کسی شخص نے لوگوں کے حقوق کی ذمہ داری سنبھالی اور اس کی ادائی میں غفلت برتی اور حقوق کو ضائع کیا۔

(۳) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کو جو منصب دیا گیا ہے، اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائے نہ خود اپنے اعزہ واقرباء کو اس کا موقع دے، کہ پبلک کے مال کو بیجا طور پر استعمال کرنا گناہ ہے۔

(۴) حدیث سے معلوم ہوا کہ بندۂ مومن ادائے حقوق میں عقل وشعور سے کام لے اور اصل مستحقین تک امانت کو پہنچائے اور دیکھے کہ کیا اس کو راہِ خدا میں لگایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حق کی رعایت کی ہے؟۔

(۵) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ادائے حقوق میں یہ بھی شامل ہے کہ ہر چیز کو اس کے مناسب جگہ دے۔ جو شخص جس کام کا اہل ہو اس کو اسی کام کی ذمہ داری سونپی جائے، کوئی منصب اسی شخص کو دیا جائے جس کی صلاحیت اس قابل ہو اور اس کو بخوبی انجام دینے کی اس میں استعداد ہو۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ ''میں نے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! کیا آپؐ ہم کو کوئی عہدہ نہیں عطا کریں گے؟ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ہمارا سوال سن کر آپؐ نے ہمارے کندھے پر ہاتھ مارا پھر فرمایا ابوذر! تم کمزور ہو، منصب وعہدہ ایک امانت ہے، جو قیامت کے دن ندامت وشرمندگی کا سبب بنے گا۔ ہاں وہ شخص اس سے محفوظ رہے گا جو بر بنائے صلاحیت عہدہ سنبھالے گا اور اپنی ذمہ داری کا پورا حق ادا کرے گا۔ (سیر اعلام النبلاء ۲،۔)

حدیث - ۲۲

مفلس کون ہے؟

عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ ﷺ قال: اتدرون من المفلس؟ قالوا: المفلس فینا من لادرھم لہ ولامتاع، فقال ان المفلس من امتی یاتی یوم القیامۃ بصلاۃ وصیام وزکاۃ، ویاتی قدشتم ہٰذا وقذف ھٰذا، واکل مال ہٰذا وسفک دم ھٰذا وضرب ہٰذا فیعطی ھٰذا من حسناتہ وہٰذا من حسناتہ فان فنیت حسناتہ قبل ان یقضی ماعلیہ اخذ من خطایاھم فطرحت علیہ ثم طرح فی النار۔'' (صحیح مسلم شرح النووی ج۱٦)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ کے رسولؐ! ہم لوگوں میں تو مفلس وہ سمجھا جاتا ہے جس کے پاس روپیہ پیسہ اور کوئی سامان نہ ہو، یہ سن کر آپ نے فرمایا: ہماری امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن روزہ، نماز، زکوٰۃ (جیسی عبادتیں) لے کر آئے گا، لیکن اس کا حال یہ ہوگا کہ کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بہتان لگایا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کو قتل کیا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا۔ لہٰذا اس کی عبادتوں کے ثواب میں سے ان لوگوں کو دے دیا جائے گا جن پر اس نے زیادتی کی ہے، جس سے اس کے روزہ نماز وغیرہ کا ثواب ختم ہوجائے گا اور لوگوں کے حقوق ابھی پورے ادا نہ ہوئے ہوں گے تو ان کے گناہوں میں سے لے کر اس کے اوپر ڈال دیا جائے گا، اس کے بعد اس شخص کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔''

یہ حدیث ان کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے جو بندۂ مومن کو تیار کرتی، اس کی تعلیم

وتربیت کا کام کرتی اور معاشرے کی برائیوں مثلاً غیبت، چغل خوری اور دوسروں کی عزت وآبرو کو داغدار کرنے جیسے عیوب سے دور رکھتی ہے۔ کسی مسلمان بھائی کو تکلیف پہنچانے سے روکتی ہے، حدیث کی ابتداء آپ ﷺ کے حلقے میں بیٹھے ہوئے صحابہ کرامؓ سے سوال کی صورت میں ہوئی، آپ اچانک صحابہ کرامؓ سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ مفلس کون ہے؟ یہ سوال اس انداز کا ہے کہ جس سے خود ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ عام مفہوم میں جس کو غریب سمجھا جاتا ہے وہ غریب مراد نہیں جس کو قواعد کی اصطلاح میں استفہام انکاری کہا جاتا ہے لہٰذا صحابہ کرامؓ سن کر چوکنا ہوجاتے ہیں اور آپ کی بات غور سے سننے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں، لیکن خود جواب میں وہی بات کہتے ہیں جو عام طور پر غربت کو بتاتی ہے یعنی مال ومتاع سے خالی ہونا، یہ جواب سن کر اچھوتے انداز میں اصلاح وتربیت کرنے والے رسولؐ فرماتے ہیں: نہیں بھائی یہ مفلس نہیں، یہ تو بہت معمولی مفلسی ہے، ہماری امت میں مفلس تو حقیقتاً وہ شخص ہے جو روزہ، نماز، زکوٰۃ لے کر حاضر ہوگا اور پھر اس کا حساب شروع ہوگا، لوگ محشر میں کھڑے ہوں گے، اس کے اعمال تولے جائیں گے تو اس میں رخنہ پڑ جائے گا، اس طرح کہ لوگ اپنے دل میں چھپی ہوئی باتوں کو کہنا اور اپنا حق مانگنا شروع کردیں گے۔ یہ کہتے ہوئے اس کے سامنے آئیں گے کہ اس نے مجھ کو گالی دی ہے، دوسرا کہے گا کہ اس نے مجھ پر زنا کا بہتان لگایا ہے، تیسرا کہے گا کہ اس نے ہمارا مال لے لیا ہے، چوتھا ایک بولے گا کہ اس نے ہم کو قتل کیا ہے، اس وقت یہ شخص سر محشر ان لوگوں کے درمیان بیٹھ جائے گا پھر اس کی نیکیاں لے کر ان لوگوں میں تقسیم کردی جائیں گی اور حق والوں کو ان کا حق دلا دیا جائے گا۔ آپ ﷺ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ”تمہیں اہل حقوق کے حقوق ضرور ادا کرنے پڑیں گے حتیٰ کہ بے سینگ والی بکری کو سینگ والی بکری نے مارا ہوگا تو اس کا بھی بدلہ دلایا جائے گا۔“ (صحیح مسلم) آپ ﷺ ہمہ وقت فکرمند ہیں کہ امت کو اس افلاس سے کس طرح بچائیں، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ”اللہ اس بندہ پر رحم فرمائے جو اپنے بھائی کی حق تلفی کا مرتکب تھا، اس کی آبروریزی میں یا مال میں، پھر وہ اس کے پاس گیا اس سے معافی مانگ لی اس سے قبل کہ وہاں اس کی پکڑ ہو جہاں نہ روپیہ پیسہ ہوگا نہ کوئی مال ہوگا، اگر اس کے پاس نیکی ہوگی تو اس میں سے لے لیا جائے گا، اور نیکی نہ ہوگی تو ان لوگوں کا

گناہ اس پر ڈال دیا جائے اور پھر وہ آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (تحفۃ الاحوذی،۴/۷)

بندے کو اس نازک گھڑی سے ڈرایا جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرمایا: میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''جس کے حساب میں پوچھ گچھ اور جرح کی گئی وہ ہلاک ہوا، میں نے عرض کیا، اللہ کے رسولؐ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتَابَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَاباً یَّسِیْراً۔'' (الانشقاق:۸۔۷)

آپ نے فرمایا یہ آگاہی اور نبوی طریقہ تربیت ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا پھر آپ نے فرمایا یہ آگاہی اور نبوی طریقہ تربیت ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا پھر آپ نے سوال کیا جانتے ہو اس کی خبریں کیا ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے جواب دیا اللہ اور اللہ کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اس کی خبریں یہ ہیں کہ کسی بھی مرد اور عورت نے روئے زمین پر جو کچھ کیا ہے، وہ اس کی گواہی دے گی، کہے گی ایسا ایسا کام کیا ہے، اور فلاں فلاں دن کیا ہے، پھر آپ نے فرمایا یہ ہوں گی زمین کی خبریں۔ (تحفۃ الاحوذی،۴/۷)

شعور واحساس کو بیدار کرنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، چنانچہ حضرت مغیرۃ بن شعبہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: پل صراط پر مومن کی زبان پر ''رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ'' (اے اللہ حفاظت فرما، اے اللہ حفاظت فرما) جاری ہوگا، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں اس وقت مسجد نبوی میں برابر جاری رہنے والے اس تربیتی حلقے میں بیٹھا ہوں، یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں اسی روحانی فضا میں سانس لے رہا ہوں، اور ان حضرات کو دیکھ رہا ہوں جو قیامت کے دن کے افلاس سے بچنے کے طریقوں کو معلوم کرنے کے لئے بے تاب ہیں، قیامت کے ہولناک منظر کا خیال کر کے سخت متاثر وفکر مند ہوتے ہیں اور سوال کرتے ہیں، حضرت انس بن مالک اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ''میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ قیامت کے دن آپ ہماری شفاعت فرمائیں گے؟ آپ نے فرمایا: میں شفاعت کروں گا، میں نے عرض کیا اللہ کے رسول میں آپ کو کہاں ڈھونڈوں گا؟ آپ نے فرمایا پہلے تو تم مجھے پل صراط پر تلاش کرنا، میں نے عرض کیا اگر وہاں آپ کو نہ پاؤں تو؟ آپ نے فرمایا پھر اعمال تولے جانے کی جگہ دیکھنا، میں نے عرض کیا اگر

وہاں بھی نہ پاؤں؟ آپ نے فرمایا تو پھر مجھے حوض کوثر پر تلاش کرنا، میں ان تین جگہوں میں سے کہیں نہ کہیں ملوں گا۔"

اس انداز تربیت سے عقل اور ذہن روز حساب کے لئے تیار ہونے لگے اور اللہ کے سامنے حاضری اور ملاقات سے دل تھرتھرانے لگے اور قیامت کے دن کے افلاس سے بچنے کے لیے حساب اور حقوق کی ادائی کے طریقے اچھی طرح سمجھ میں آنے لگے۔ آپ ﷺ قوت عمل کو بڑھانے والے لمحات کو الگ الگ انداز سے بیان فرماتے ہیں اور ان کو حشر کا دن یاد دلاتے ہیں، اس طرح کہ اس کا نقشہ سامنے آجائے، آپ فرماتے ہیں "انکم تحشرون رجالاً ورکباناً وتجرون علیٰ وجوھکم۔" تم قیامت کے دن سوار، پیدل ہر طرح سے جمع کئے جاؤ گے حتیٰ کہ اپنے چہروں کے بل دوڑو گے۔ قیامت کی یہ منظر کشی خوف اور گھبراہٹ سے بھری ہوئی ہے، جو دلوں کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ اس دن کی مصیبت سے بچنے کی تیاری کریں اور حقیقتاً مفلس کون ہے، اس کا ہر وقت دھیان رہے، عمل پر آمادہ کرنے والے اس طرح کے مناظر مسلسل اور بار بار خیالات اور دلوں سے گزارے جاتے ہیں۔

حضرت حسنؒ حضرت ابو ہریرہؓ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

> یعرض الناس یوم القیامة ثلاث عرضات فاماعرضتان فجدال ومعاذ یروا ما العرضة الثالثة فعند ذالك تطیر الصحف فی الایدی فآخذ بیمینه وآخذ بشماله۔
> (صحیح مسلم شرح النووی ج ۱۶۔)
>
> قیامت کے دن لوگوں کی تین پیشیاں ہوں گی، دو پیشیوں میں بحث ومباحثہ اور عذر ومعذرت ہوگی، تیسری پیشی کے وقت نتائج کے پروانے اڑائے جائیں گے، جو کسی کے داہنے ہاتھ میں پہنچیں گے کسی کے بائیں ہاتھ میں۔

دلوں کے جذبات وشعور کو بیدار کرنے اور ان میں فکر وعمل کا ولولہ پیدا فرمانے کے بعد امت کے مربی ومعلم ﷺ اس افلاس سے بچنے کے طریقے بھی نہایت وضاحت کے ساتھ صاف صاف بیان فرماتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا :

"تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول زیادہ

جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، تمہارا اپنے بھائی کا اس طرح تذکرہ کرنا جس سے اس کو ناگواری ہو، یہ غیبت ہے۔ پھر عرض کیا گیا اللہ کے رسول، جو ہم نے کہا اگر وہ بات اس میں پائی جاتی ہو تب؟ آپ ﷺ نے فرمایا اگر اس میں جو بات تم کہہ رہے ہو موجود ہے تبھی تو یہ غیبت ہوئی اور اگر اس میں موجود نہیں پھر بھی تم نے بیان کی تو بہتان ہو گیا۔''

آپ ﷺ اپنی امت کو احتیاط اور بچاؤ کے حصار میں محفوظ فرما دیتے ہیں کہ امت کے ہر فرد کی آنکھیں ہر عیب سے بچنے اور ہر خوبی کو اپنانے کے لئے رکھی گئی ہیں، ان پر ہر چیز واضح ہو۔ خیر وشر میں تمیز ان کا مزاج بن چکا ہو۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ گالی گلوچ اور ناشائستہ گفتگو جو باعث دل آزاری ہو بندے کے اجر کو کم کر دیتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، ''ناشائستہ اور تہذیب سے گری ہوئی باتوں یا گالی گلوچ میں ابتدا کرنے والا گنہگار ہوگا، جب تک کہ جواب دینے والا حد سے تجاوز نہ کرے۔'' ہر مسلمان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمان کا بلا وجہ گالی بکنا آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق فسق ہے۔ اس سلسلے میں اپنے کو محفوظ رکھنے کی ایک صورت یہ ہے کہ اپنے بھائی کو معاف کر دے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''صدقہ کرنے سے مال میں کمی نہیں ہوتی اور جو بندہ اپنے بھائی کو معاف کرتا ہے اللہ اس کی عزت کو بڑھاتا ہے اور جو شخص تواضع و خاکساری اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بلند کرتا ہے۔''

قرآن کریم بچنے والے ان طریقوں کو کئی جگہ ذکر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر شروع سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

> الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيْهِ هُدىً لِّلْمُتَّقِيْنَ، اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ اُوْلٰٓئِكَ عَلٰى هُدىً مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (البقرہ:۱-۵)

یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں (کہ کلام خدا ہے، خدا سے) ڈرنے

والوں کی رہنمائی ہے جو غیب پر ایمان لاتے اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو کتاب (اے محمدؐ) تم پر نازل ہوئی اور جو کتابیں تم سے پہلے (پیغمبروں پر) نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں، یہی لوگ اپنے پروردگار (کی طرف) سے ہدایت پر ہیں اور یہی نجات پانے والے ہیں۔

ان آیات میں قرآن کریم افلاس سے نجات حاصل کرنے والے اور حساب میں کامیاب ہو جانے والے روشن خاکے دل لگتے انداز میں بیان کرتا ہے، جس میں الفاظ کھنچی ہوئی لکیر اور رنگ کا کام کرتے ہیں پھر فوراً انھیں الفاظ کے اندر نجات حاصل کرنے والوں کی جیسے تصویر کشی کر دیتا ہے، پھر جلد ہی یہ صورتیں اس طرح نمایاں ہو جاتی ہیں کہ حساب کے بعد ایک نئی زندگی کی رودوڑنے لگتی ہے۔

کامیابی حاصل کرنے والے کی پہلی علامت تقویٰ ہے۔ دوسری علامت غیب پر ایمان ہے، یہی وہ دائرہ یا چوکھٹا ہے، جس سے نکل کر آدمی حیوانیت کے مرتبہ سے بلند ہو کر انسانیت کا مرتبہ پالیتا ہے۔ تیسری علامت نماز ہے، جو دل صحیح معنوں میں اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور یہ اس کا شب و روز کا معمول بن جاتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت، بڑائی اور حساب کے ہولناک منظر کو دھیان میں رکھتا ہے، وہ گالی نہیں دے سکتا، نہ کسی کو تکلیف پہنچا سکتا ہے۔ اس کی زندگی کا وہ اونچا مقام و منصب ہو جاتا ہے، جو کسی کو مارنے، ستانے اور گالی دینے سے اس کو بہت بلند کر دیتا ہے۔

افلاس سے بچنے کی کنجی وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ہے جس کا ترجمہ اوپر گزر چکا ہے، انفاق یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، زکوٰۃ، صدقہ اور ان تمام خرچوں کو شامل ہے جو نیکی کی راہوں میں کئے جائیں، یہ دل کو بخل اور لالچ سے بچانے اور نیکی کے لئے اس کو پاکیزہ بنا دیتے ہیں۔ سب سے بڑا معاون و مددگار ہے۔ یہ بے بس، کمزور اور بے سہارا شخص کو امن و اطمینان اور سہارا دیتا ہے، ان مصیبت کے ماروں میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ اخوت و بھائی چارگی، محبت و عفو درگزر کرنے والے دردمند دلوں، بشاش چہروں اور خوگر لطف و عنایت لوگوں کے

درمیان زندگی گزار رہا ہے، جہاں ہر ایک اپنے بھائی کے عذر کو تسلیم کرتا ہے، غلطی پر اس سے معافی مانگتا ہے، اس سے میل ملاپ رکھتا ہے، اس کا حساب آخرت سے پہلے دنیا ہی میں صاف کر دیتا ہے۔

وَبِالاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ آخرت کا یقین کہ اللہ کے سامنے ہمیں حاضر ہونا اور اپنے کئے کا حساب دینا ہے، افلاس سے نجات کا آخری نشان ہے، آیت کی یہی وہ آخری بات ہے، جو دنیا کو آخرت سے جوڑتی ہے، انسان کے وجود اور اس کے انجام کا پتا دیتی ہے، انسان کے عمل اور اس کے صلہ وثواب کو بتاتی ہے۔ یہی چیز انسان کے اندر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ عادلانہ فیصلہ اس کے انتظار میں ہے تا کہ اس کا دل مطمئن ہو اور اس کو اپنے نیک اعمال کا پھل ملے۔ اس کے اندر استغناء پایا جائے، دل ایمان سے بھرا ہوا ہو، افلاس سے محفوظ ہو، اور ان لوگوں میں شامل ہو جائے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اولئك هم المفلحون اور یہی نجات پانے والے ہیں۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) یہ حدیث تربیت کے موثر طریقوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے جن میں سب سے نمایاں طریقہ استفہام انکاری کے انداز میں سوال کر کے جذبات واحساسات کو ابھارنا ہے، جس کے بارے میں علماء تعلیم وتربیت اور ماہرین علم النفس کا کہنا ہے کہ فکر ومفہوم کو ذہن میں اتارنے اور اس کو دل میں نقش کر دینے کے لئے استفہام انکاری نہایت کامیاب وسیلہ ہے۔

(۲) حدیث جذبات واحساسات میں جوشِ عمل پیدا کرنے کے طریقوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے، جس میں سب سے اہم قیامت کے حساب کو یاد دلانا ہے، اس ہولناک دن کے مناظر میں سے ایک منظر کو پیش کر دینا ہے اور حساب وسزا کو اس انداز سے پیش کرنا کہ انسان ہمہ تن گوش ہو کر متوجہ ہو اور اس وقت کو یاد کرے جب انسان اپنے بھائی سے بھاگے گا، اپنی ماں اور باپ سے بھاگے گا، بیوی اور بیٹوں سے بھاگے گا۔

(۳) یہ حدیث نبوی تربیت کا ایک بہترین نمونہ ہے، جو مسجد نبوی ؐ کے مناظر کا ایک خاکہ پیش

کرتا ہے۔ جو بندہ مومن کو مکمل طور پر تیار کرنے کی ایک اعلیٰ تعلیم گاہ تھی، تا کہ یہ فرد قرآن کریم جو معاشرہ تیار کرنا چاہتا ہے اس کی ایک اینٹ ثابت ہو۔

حدیث کا فقہی پہلو

کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ استفہام انکاری کا یہ انداز بلاغت کے ان طریقوں میں سے ہے جو احساسات میں جوش عمل پیدا کرتے ہیں، میری امت میں مفلس وہ کہلائے گا جو قیامت میں اس حال میں آئے گا کہ کسی کو گالی دیئے ہوئے ہوگا، کسی پر بہتان لگایا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، اجمال کے بعد تفصیل ان توضیحی طریقوں میں سے ہے جس کا ہر جملہ نئے اور باریک معانی پیدا کرتا ہے اور دل پر اثر کرنے والے تفصیلی نقشے کو پیش کرتا ہے تا کہ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر گویا مشاہدہ بن جائے اور یہ ساری معنویت اس لئے پیدا ہوئی کہ حدیث سوالیہ انداز میں وارد ہوئی ہے، جس نے سامعین کو جواب معلوم کرنے کے شوق میں ہوشیار اور چوکنا کر دیا، بعد کے جملے وضاحت و تفصیل کے لئے آئے ہیں۔

حدیث - ۲۳

اللہ کا مدمقابل

عن ابی ھریرةؓ عن النبی ﷺ قال: قال اللّٰہ عز وجل: ثلاثة انا خصمھم یوم القیامة: رجل اعطی بی ثم غدر، ورجل باع حرا فاکل ثمنه، ورجل استاجرا اجیرا فاستوفی منه ولم یعطه اجره۔ (فتح الباری: ج۴ص ۴۸۷، سنن ابن ماجہ ج ۲،ص ۸۱۶ مسند الامام احمد بن حنبل ج ۲ص ۳۵۸)

''حدیث قدسی میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تین شخص اتنے بڑے مجرم ہیں کہ قیامت کے دن (مظلومین کے ساتھ) ان کا فریق ومدمقابل میں خود ہوں گا۔ ایک وہ شخص جس نے معاہدہ کیا اور ہماری قسم کھائی پھر دھوکا دے گیا، عہد پورا نہیں کیا۔ دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد شخص کو بیچ دیا اور اس کی قیمت خود کھا گیا اور تیسرا وہ شخص جس نے مزدور رکھا اس سے پورا پورا کام لیا اور اس کی مزدوری نہیں دی۔''

اسلام ساری دنیا کے لئے رحمت بن کر آیا ہے۔ وہ اسلامی معاشرے کے اندر دلوں کو جاہلیت کے اثرات سے پاک صاف کرنے کے لئے آیا ہے۔ وہ لوگوں میں اس ارشاد ربانی پر عمل کا جوش وجذبہ پیدا کرنے کے لئے آیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

یَآ اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡکُمۡ۔ (النساء:۲۹)

''مومنو! ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ، ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو، اور اس سے مالی فائدہ ہو جائے تو وہ جائز ہے۔''

ناجائز طریقہ سے مال کھانا ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے، جس میں شریعت نے اجازت نہ دی ہو یا اس سے روکا ہو، جس میں جائز حدود سے تجاوز کرنا، رشوت لینا، ضروریات زندگی کو مہنگا ہونے کے انتظار میں روکے رکھنا، خرید وفروخت کی وہ تمام صورتیں جو ناجائز ہیں،

یتیموں، مسکینوں اور کمزوروں کا مال کھانا، وہ تمام لوگ جو اپنا حق حاصل کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں ان کا حق ہڑپ کرنا ان میں سے تین قسموں کو خاص طور سے بیان فرمایا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: تین آدمی ایسے ہیں جن سے میں براہ راست سوال و جواب کروں گا اور جن سے میں سوال و جواب کروں تو میں ان کو لاجواب ہی کردوں گا یعنی وہ مجرم ثابت ہوں گے، ایک وہ شخص جس نے میری قسم کھا کر عہد کیا پھر دھوکا دے گیا، دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد کو بیچا اور اس کی قیمت کھا گیا، تیسرا وہ شخص جس نے کسی شخص کو مزدوری پر رکھا اس سے پورا پورا کام لیا اور مزدوری پوری نہ دی۔ (نیل الاوطار ج ۶ باب الاجر)

ابن تین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سارے ہی ظالموں کا محاسبہ فرمائے گا۔ مذکورہ تینوں قسم کے لوگوں کا ذکر شدت جرم کو بتانے کے لئے فرمایا ہے۔

عہد کا پورا کرنا ان اہم چیزوں میں سے ہے جن کا پورا کرنا ضروری ہے اور اسلام نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے۔ جو شخص اللہ کا واسطہ دے کر اور اس کی قسم کھا کر اس دنیا کا تھوڑا سا فائدہ اٹھائے گا خواہ وہ اس طرح ساری دنیا حاصل کرلے آخرت میں وہ بالکل محروم رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ذرا بھی رحم کا معاملہ نہ فرمائے گا۔ نہ زکوٰۃ نہ اعمال کی قبولیت وطہارت، کوئی چیز کام نہ دے گی۔ عہد کا پورا کرنا تقوے سے جڑا ہوا ہے، حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی تقویٰ ضروری ہے۔ تو پھر دوست اور ذمی کا کیا کہنا۔ یہ اسلام کا ایسا اصول ہے کہ اس میں کوئی مصلحت اندیشی نہیں چل سکتی۔ یہ معاملہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہے اس سے قطع نظر کہ معاملہ کس سے ہو رہا ہے، دوست یا دشمن سے۔

وفائے عہد کے سلسلہ میں یہ اسلام کا عام اخلاقی نظریہ ہے۔ علاوہ ازیں تمام انسانی سلوک میں اس کا لحاظ ضروری ہے، اس پر عمل کا اولین تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اس پر عمل کرنا اللہ کی ناراضی سے بچاتا اور رضا و خوشنودی کا حق دار قرار دیتا ہے، کوئی اخلاقی مصلحت اس کی خلاف ورزی کا جواز نہیں پیدا کرسکتی، یہ کسی جماعت یا گروہ کا عرف نہیں بلکہ یہ خدائی ربط و تعلق پر مبنی ہے۔ اسی لئے اس کی خلاف ورزی گویا خود اللہ تعالیٰ کو اپنا فریق ومخالف بنانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کہ تین آدمیوں کا فریق و مد مقابل میں خود ہوں'' کا یہی مطلب ہے۔ ان میں کا پہلا شخص جو خدا کی قسم کھا کر عہد کرے پھر دھوکا دے جائے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والے اخلاق و کردار کو معلوم کرے اور اس کی رضا کی طلب میں لگا رہے کیونکہ حدیث بالا سے

معلوم ہوا کہ جولوگ وعدہ خلافی کرتے ہیں، امانت میں خیانت کرتے ہیں، اپنی قسمیں اور عہد کی آڑ لے کر بہت معمولی فائدہ اٹھاتے ہیں ان کے لئے آخرت میں کوئی بھلائی نہیں، مزید برآں ایسے لوگ یہودیوں کے نقش قدم پر ہوتے ہیں، یہ کسی مومن کے شایان شان نہیں کہ اپنی ذات اور عمل کو یہودیوں کے مشابہ بنائے جو دھوکہ دہی اور خیانت میں مشہور ہیں، یہ دونوں چیزیں ان کی پہچان وعلامت بن گئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِیْلاً اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ (ال عمران:۷۷)

''جولوگ خدا کے اقراروں اور اپنی قسموں (کو بیچ ڈالتے ہیں اور ان) کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں۔ان کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔ان سے خدا نہ تو کلام کرے گا اور نہ قیامت کے روز ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کو دکھ دینے والا عذاب ہوگا۔''

ابن کثیر کہتے ہیں کہ ''جولوگ اللہ سے اس عہد کے بدلہ میں کہ وہ حضور ﷺ کی اتباع کریں گے، آپ ؐ کا اسوہ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ان کی جھوٹی گنہگار بنانے والی اور غلط قسموں کے بارے میں بھی لوگوں سے وضاحت کردی ہے۔ ناقابل التفات اور معمولی سی قیمت لے لیتے ہیں وہ محض دنیا کا فریب ہے جو ختم اور فنا ہو جانے والی ہے ان لوگوں کا آخرت میں کچھ بھی بھلا نہیں ہوگا۔''

ایسی بہت سی حدیثیں ہیں جو اس آیت کریمہ سے تعلق رکھتی ہیں۔حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تین آدمیوں سے نہ بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا، ان کے لئے بہت دردناک عذاب ہے۔ میں نے عرض کیا اللہ کے رسول وہ کون لوگ ہیں؟ یہ تو نقصان وخسارہ میں جا پڑے، انہوں نے بیان کیا کہ آپ ﷺ نے اس کو تین بار دہرایا، ایک وہ شخص جو اپنا ازار (لنگی یا پاجامہ) ٹخنے سے نیچے لٹکاتا ہے، دوسرا وہ شخص جو جھوٹی قسم کھا کر اپنا سودا بیچتا ہے، تیسرا وہ شخص جو احسان جتاتا ہے۔'' اس کو امام مسلمؒ نے شعبہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ایک اور حدیث حضرت عبداللہؓ

سے مروی ہے، حضورﷺ نے فرمایا:

''جس شخص نے کسی مسلمان کا مال ہڑپ کر لینے کے لئے جھوٹی قسم کھائی تو اللہ تعالیٰ سے اس کا سامنا اس حال میں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس سے سخت ناراض ہوگا۔''

اعمش کہتے ہیں کہ یہ حدیث میرے سلسلے میں وارد ہوئی ہے، ہمارے اور ایک یہودی کے درمیان ایک مشترکہ زمین تھی اس نے میری زمین کا انکار کر دیا، میں اس کو لے کر حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپﷺ نے مجھ سے فرمایا:

''کیا اس کے تمہارے درمیان کوئی عہد و معاہدہ ہے، میں نے عرض کیا اللہ کے رسول! عہد تو نہیں ہے، یہودی نے کہا میں قسم کھا سکتا ہوں، میں نے عرض کیا اللہ کے رسول! اگر یہ قسم کھائے تب تو پھر ہمارا مال چلا جائے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''ان الذین یشترون بعهد الله و أیمانهم ثمناً قلیلاً۔'' اس حدیث کو مسلم و بخاری دونوں نے حدیث اعمش کے حوالے سے نقل فرمایا ہے۔

ایک اور حدیث میں عبداللہ بن اوفی سے مروی ہے کہ ایک شخص اپنا سودا بازار میں لایا اور قسم کھائی کہ اتنے دام میں خریدا ہے حالانکہ اس سے کم دام میں خریدا تھا، یہ قسم ایک مسلمان کو نقصان میں ڈالنے کے لئے کھائی تھی، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ''ان الذین یشترون بعهد الله و أیمانهم ثمناً قلیلاً الخ''

ان احادیث کی روشنی میں اس نبوی ارشاد کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے جس میں روز قیامت خود اللہ تعالیٰ کے مدمقابل ہونے کا ذکر ہے جس کی یہ تفصیلات بیان ہو رہی ہیں۔

ایسا کیوں نہ ہو کہ اسلام لوگوں کے حقوق کو حدود و سزا کے ذریعہ پوری طرح محفوظ کرتا تاکہ اسلامی معاشرہ اچھی اور پرامن فضا میں زندگی گزارے، دوسرا شخص جس نے کسی آزاد کو بیچ دیا اور اس کی قیمت کھا گیا۔ کھانے کا ذکر خاص طور سے اس لئے کیا کہ بڑا مقصد تو یہی ہوتا ہے خواہ کسی صورت میں ہو، ابوداؤد کی ایک روایت میں ''رجل اعتبد محرراً'' ہے۔ یعنی ایسا شخص جس نے کسی آزاد شخص کو غلام بنالیا ہو، یہ عملاً پہلی صورت سے زیادہ عام ہے اور کسی آزاد کو غلام بنانا، یہ شکل خاص ہے، خطابی کا کہنا ہے کہ غلام بنانا دو طرح سے ہوسکتا ہے، ایک تو یہ کہ غلام کو آزاد کر دیا لیکن دوسروں سے اس کو چھپاتا یا اس کا انکار کرتا ہے کہ نہیں آزاد کیا، دوسری صورت یہ ہے کہ

آزاد کرنے کے بعد زبردستی اس سے خدمت لیتا ہے۔ پہلی صورت زیادہ بری اور سخت ہے۔ فتح میں بیان ہوا ہے کہ پہلا زیادہ سخت ہے اس لئے کہ اس میں فعل کا چھپانا یا عمل کا انکار اس اعتبار سے بیچ کر قیمت کھا جانا واضح ہو جاتا ہے، اس لئے اس پر وعید وسزا بھی سخت ہے۔ مہلب کہتے ہیں یہ بہت بڑا گناہ ہے اس لئے کہ آزاد ہونے میں تمام برابر ہیں، لہٰذا جس نے کسی آزاد کو بیچا اس نے اس کو ان کاموں سے روک دیا جن کو کرنے میں اس کو کوئی رکاوٹ نہیں تھی، (یعنی اپنی مرضی سے جس طرح چاہے شریعت کے مطابق عمل یا کسب معاش کرے) اور اس پر وہ پابندی لگا دی جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو بچایا ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ آزاد اللہ تعالیٰ کا بندہ وغلام ہے۔ جس نے اس پر زیادتی کی اس نے اس کے آقا کو اپنا دشمن بنالیا، لوگوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی عزت وحرمت کو محفوظ رکھنے کا یہ بھی طریقہ اور مسلمانوں میں بھائی چارگی اور مساوات قائم کرنے کا ضابطہ اور غلام وآقا کے حقوق کی پاسداری کا قانون ہے، تاکہ بہترین اسلامی فضا اور ماحول قائم ہو جس سے مضبوط اور ترقی کرنے والا اسلامی معاشرہ وجود میں آئے۔

تیسری قسم اس شخص کی ہے، جس نے کسی کو مزدوری پر رکھا، اس سے کام پورا لیا اور مزدوری نہ دی۔ مسلمان مزدور پوری محنت وتوجہ سے اپنا کام کرتا ہے، وہ اپنے اس کام کو عبادت وامانت سمجھتا ہے۔ لوگوں سے تو اس کے صلے کا منتظر رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتا ہے۔ لہٰذا ایسا شخص عزت واکرام کے قابل ہوتا ہے۔ وہ اس بات کا حقدار ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ اچھا معاملہ کیا جائے، اس کا دل خوش کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے روحانی جذبہ کو مزید بڑھایا جائے۔ اسی بنا پر اسلام کا حکم ہے کہ ''مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو''، عملی صلاحیت کو بڑھانے والے وسائل میں یہ بھی ایک وسیلہ وذریعہ ہے۔ تاکہ اسلامی تہذیب کا قافلہ برابر ترقی کی طرف بڑھتا رہے وہ اخلاق وعمل کا ایسا نمونہ ہو جس کی دوسری قومیں نقل کریں۔ زیر بحث حدیث کے نتائج وبرکات کا یہ ایک حصہ ہے۔ یہ تیسری صورت دوسری صورت یعنی آزاد کو بیچ کر اس کی قیمت کھا جانے ہی کی طرح ہے۔ اس لئے کہ مزدور سے فائدہ اٹھایا اور اس کی مزدوری کھا گیا، گویا اس نے اس کو غلام بنالیا۔

حدیث کا فقہی پہلو

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جس نے اپنے غلام ہونے کا اقرار کیا وہ غلام ہے۔ قتادہ کے حوالہ

سے ابوشیبہ نے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنے آپ کو بیچ دیا۔ حضرت عمرؓ کو علم ہوا تو فرمایا: وہ غلام ہے اور اس کی قیمت اللہ کی راہ میں لگا دی، زرارہ بن اوفی تابعی کے حوالہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ''قرض کے بدلہ میں ایک آزاد کو بیچ دیا' ابن حزم سے منقول ہے کہ زمانہ جاہلیت میں قرض کے عوض آزاد کو بیچ دیا جاتا تھا حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی ''ان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ'' (قرض لینے والا تنگدست ہو تو (اسے) کشائش (کے حاصل ہونے) تک مہلت (دو)۔

امام شافعی سے بھی اسی طرح منقول ہے لیکن بہت سے شوافع اس کو نہیں مانتے، اجماع اس پر ہے کہ اس شخص کو نہ بیچا جائے۔ اجیر (ملازم یا مزدور) جب اپنا عمل پورا کردے تو اس کی اجرت اس کو پوری پوری ادا کردی جائے۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اجرت کا استحقاق عمل کے بعد ہوگا۔ لیکن شوافع اس کے قائل ہیں کہ محض عقد (معاملہ) ہی سے اجیر اجرت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہ اختلاف اجارہ صحیحہ میں ہے لیکن اجارہ فاسد کے بارے میں بحر میں یہ مذکور ہے کہ اجارہ فاسد میں صرف عقد کی بنیاد پر اجرت واجب نہ ہوگی۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے عہد کا خیال رکھے گا اس کے دل میں اس کا پاس ولحاظ ہوگا، اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرمائے گا اور اس کو اپنی نعمتوں سے نوازے گا۔ لیکن جو شخص چند ٹکوں کی خاطر اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ خود اس کا فریق بنے گا۔

(۲) حدیث سے معلوم ہوا کہ بندۂ مومن اپنی ذمہ داری دلی جذبات کے ساتھ انجام دیتا ہے، اس کے اندر اس کی انجام دہی کا داعیہ ہوتا ہے، جو کام پر آمادہ کرتا ہے، اسی لئے حکم دیا گیا کہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کو اجرت دے دی جائے۔

(۳) حدیث سے معلوم ہوا کہ دین اسلام دلوں میں بھائی چارے کی روح کو جگاتا اور تعلقات کو سازگار بناتا ہے۔ معاشرے کی عمارت کو بلند کرتا اور دوسروں سے متعلق حقوق کو واضح کرتا ہے۔

(۴) حدیث ظلم اور دوسروں کا مال ناحق کھانے سے منع کرتی ہے۔

حدیث - ۲۴

دینے والا ہاتھ لینے والے سے بہتر ہے

أن حکیم بن حزام رضی اللّٰہ عنه قال: ''سألت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فأعطانی، ثم سألته فأعطانی، ثم سألته فاعطانی، ثم قال: یا حکیم، إن هٰذا المال خضرةٌ حلوةٌ، فمن أخذه بسخاوة نفس بورك له فیه، ومن أخذه بإشراف نفسٍ لم یبارك له فیه، کالذی یاکل ولا یشبع، الید العلیا خیر من الیدالسفلیٰ، قال حکیم فقلت یا رسول اللّٰہ، والذی بعثك بالحق لا أرزأ أحداً بعدك شیئاً، حتیٰ أفارق الدنیا، فکان أبوبکر رضی اللّٰہ عنه۔ یدعو حکیماً إلی العطاء فیأبی أن یقبله منه۔ ثم إن عمر رضی اللّٰہ عنه دعاه لیعطیه فأبی أن یقبل منه شیئاً، فقال عمر إنی أشهدکم معشرالمسلمین علیٰ حکیم أنی أعرض علیه حقه من هٰذا الفئ فیأبی أن یأخذه، فلم یرزأ حکیم أحداً من الناس بعد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حتی توفی۔ (فتح الباری: ج ۳ ص ۳۳۵۔ شرح صحیح مسلم (النووی) ج ۷ ص ۱۲۶)

''حکیم بن حزامؓ نے بیان کیا کہ ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا (کچھ مانگا) آپ نے دے دیا، میں نے دوبارہ آپ سے مانگا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر دے دیا، (تیسری بار) پھر مانگا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر دے دیا، اس کے بعد فرمایا، حکیم! یہ مال بڑا دلکش اور میٹھا ہے، جس نے مال دل کے لالچ اور حرص کے بغیر لیا، اس مال میں اس کے لئے برکت دی جاتی ہے اور جس نے اشراف نفس کے ساتھ (امید و آرزو لگا کر) لیا اس کے لئے برکت نہیں دی جاتی، اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کھاتا ہے اور

آسودہ نہیں ہوتا، اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ (دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ) سے اچھا ہے۔ حکیمؓ نے بیان کیا، اس کے بعد میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ آپ کے بعد میں کسی کے مال میں کمی نہیں کروں گا (کسی سے کچھ نہیں لوں گا) تا آنکہ دنیا سے چلا جاؤں۔ چنانچہ اس پر اس طرح ثابت قدم رہے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنے دور خلافت میں حکیمؓ کو دینے کے لئے بلاتے تھے تو وہ انکار کردیتے تھے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں بلایا کہ ان کو کچھ دیں مگر انھوں نے انکار کردیا، تو حضرت عمرؓ نے اعلان کیا کہ مسلمانو! میں تم کو حکیم پر گواہ بناتا ہوں کہ میں مال غنیمت میں سے ان کو ان کا حق دیتا ہوں اور وہ لینے سے انکار کرتے ہیں۔ حضور ﷺ کے بعد حکیم نے کسی سے کچھ نہیں لیا حتیٰ کہ انتقال فرما گئے۔''

یہ حدیث معاشرے کے اندر نمایاں اور معروف بیماری طلب مال کا تدریجی علاج کی کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے۔ یہ حدیث لالچ سے چھٹکارا اور حرص پر غالب آنے کا علاج کرتی ہے۔ جب کہ اسی کے ساتھ محرومی کے مقابلے میں باہم تعاون اور ایک دوسرے کے کام آنے والی امت کے اندر دولت مندوں کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اس کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ سائل اس کو کہتے ہیں جو مانگتا ہے اور محروم اس کو کہتے ہیں جو ضرورت کے باوجود لوگوں سے مانگتا نہیں۔

ارادۂ خداوندی یہی تھا کہ مانگنے کا علاج ایسے شخص سے شروع ہو جو خاندان نبوی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ حکیم بن حزامؓ تھے۔ یہ ان لوگوں میں تھے جو دیر سے اسلام لائے، ان کا شمار مؤلفۃ القلوب (وہ لوگ جن کو حضور ﷺ مانوس کرنے کی غرض سے دلداری کے طور پر مال دے دیا کرتے تھے) میں ہوتا تھا۔ حکیم بن حزامؓ خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے سوال کیا، آپ ﷺ نے مجھ کو عطا فرمایا، میں نے پھر دوبارہ مانگا آپ ﷺ نے پھر عنایت فرمایا، تیسری بار پھر مانگا آپ ﷺ نے پھر دے دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا ''اے حکیم یہ مال بڑا پرکشش اور میٹھا ہے، اس کو جو شخص بغیر حرص یا لالچ کے لیتا ہے اس کے مال میں برکت ہوتی ہے۔

حضور ﷺ حکیم بن حزامؓ کو تین مرتبہ برابر دیتے رہے تاکہ ان کے اندر طلب مال اور سوال پر اصرار کا جو جذبہ غالب تھا، اس کا علاج ہو جائے۔ اتنا کردینے کے بعد آپ ﷺ نے ان کے اس رجحان کو بدلنا شروع فرمایا کہ یہ ان کی عادت نہ بن جائے۔ اس لئے کہ انسان کو اگر اس

کے حال پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے رجحانات اور حرص کے تابع بنا رہے تو وہ خود اپنے اور اپنی جماعت کے اوپر بار بن جائے گا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا، ''دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ اِلٰى مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ زَهۡرَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا لِنَفۡتِنَهُمۡ فِيۡهِ وَرِزۡقُ رَبِّكَ خَيۡرٌ وَّاَبۡقٰى (طٰہٰ،۱۳۱)

''اور کئی طرح کے لوگوں کو جو ہم نے دنیا کی زندگی میں آرائش کی چیزوں سے بہرہ مند کیا ہے تاکہ ان کی آزمائش کریں ان پر نگاہ نہ کرنا اور تمہارے پروردگار کی (عطا فرمائی ہوئی) روزی بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔''

دوسری آیت میں فرمایا :

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالۡبَنِيۡنَ وَالۡقَنَاطِيۡرِ الۡمُقَنۡطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالۡفِضَّةِ وَالۡخَيۡلِ الۡمُسَوَّمَةِ وَالۡاَنۡعَامِ وَالۡحَـرۡثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الۡمَاٰبِ۔ (ال عمران:۱۴)

''لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے مویشی اور کھیتی بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔ (مگر) یہ سب دنیا ہی کی زندگی کے سامان ہیں اور خدا کے پاس بہت اچھا ٹھکانا ہے۔''

حضرت حکیم بن حزامؓ حضور ﷺ کے اس فیاضانہ سلوک اور دل کو متاثر کرنے والے طرز عطا سے، (کہ تین مرتبہ مانگا اور تینوں مرتبہ آپ نے ان کو دیا) بہت متاثر ہوئے اور عرض کیا ''اے اللہ کے رسول ﷺ! اس ذات پاک کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے آپ کے بعد اب میں عمر بھر کسی کے مال میں کوئی کمی نہ کروں گا (کسی سے کچھ نہ لوں گا)۔

حدیث میں اور دوسرے نمونے بھی موجود ہیں جن سے اس شریفانہ وحکیمانہ طرز تربیت کی کامیابی کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ''انصار میں سے کچھ لوگوں نے حضور ﷺ سے مانگا، آپ ﷺ نے انھیں عنایت فرمادیا، جب سب ختم ہوگیا تو فرمایا، ہمارے پاس جو کچھ بھی موجود ہوگا تم سے بچا کر نہ رکھوں گا، جو شخص سوال سے بچے گا اللہ تعالیٰ

اس کوسوال سے بچائے گا۔ جو شخص استغناء برتے گا اللہ تعالیٰ اس کو غنی (دوسروں سے بے نیاز) رکھے گا۔ جو شخص صحیح ودرست بات کا طالب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اس کی صلاحیت عطا کر دیتا ہے، صبر سے بڑھ کر کسی شخص کو کوئی عطیہ نہیں ملا۔''

حدیث سے معلوم ہوا کہ مانگنے والے کا اکرام کرنا اور اس کی چاہت کو پورا کر دینا نفس کے علاج کے کامیاب وسائل میں سے ہے اور اس طرح اس کی خودداری کو بلند کر کے اس مقام پر پہنچا دینا ہے کہ وہ توبہ کرلے اور سوال سے بچے اور اس کی خودداری کی سطح بلند ہو جائے، اپنے ہاتھوں کی کمائی سے وسائل زندگی مہیا کرے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن اپنے والد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوسعیدؓ کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا واقعہ پیش آیا، ان کی حدیث میں مذکور ہے کہ والدہ نے مجھے حضورﷺ کے پاس بھیجا۔ مقصد حضورﷺ سے ایک شدید ضرورت کے سبب کچھ مانگنا تھا چنانچہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیٹھ گیا، آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، ''جو شخص استغنا سے کام لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو غنی کر دیتا ہے۔'' مزید فرمایا: جس نے اس حال میں سوال کیا کہ اس کے پاس ایک اوقیہ (ساڑھے دس درہم) موجود ہے تو اس نے گویا اصرار سے کام لیا، میں نے عرض کیا کہ میری اونٹنی ایک اوقیہ سے بہت بہتر ہے۔ چنانچہ واپس چلا آیا اور آپ سے کچھ مانگا نہیں۔'' (الفتح، ج۳ص ۳۴۱)

یہ نوجوان صحابی ابوسعید خدریؓ حضورﷺ کے اس تربیتی انداز کو فوراً سمجھ گئے اور اپنی ضرورت ظاہر کرنے سے باز رہے اور سوال سے بچنے کے خیال سے واپس آ گئے۔ یہ حدیث دلوں کی تربیت، ان کی صفائی اور قوت بصیرت کو سیدھے رخ کی طرف موڑنے کا اچھا اور کامیاب نمونہ ہے۔

دین اسلام بندۂ مومن کو یتیم کے اکرام اور عزت کا حکم دیتا ہے، اس پر ظلم وزیادتی سے روکتا ہے، سائل کو نرمی اور عزت نفس کے ساتھ دینے کا حکم دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ، وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ، وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ. (الضحیٰ: ۹-۱۱)

''تو تم بھی یتیم پر ظلم نہ کرنا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا

بیان کرتے رہنا۔"

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نعمت ہدایت وایمان کے بیان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آدمی سائل کی عزت وتکریم کا خیال رکھے۔ حضرت حسن بن علیؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا سائل کا حق ہے چاہے وہ گھوڑے ہی پر سوار ہو کر کیوں نہ آئے۔" (مختصر سنن ابی داؤد (تہذیب ابن قیم) ج ۲۔)

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل سے حسن ظن رکھنا چاہئے، اس کو جھوٹا نہ کہو، نہ برے انداز سے جواب دو کہ ممکن ہے وہ سچا ہو، (اور تم حقیقت حال سے واقف نہ ہو) فرماتے ہیں، سائل کو محروم نہ واپس کرو خواہ اس کی ظاہری صورت خوشحالی کی معلوم ہو رہی ہو، ایسا ممکن ہے کہ اس کے پاس سواری کا گھوڑا تو ہو لیکن اہل وعیال ہوں اور اس پر قرض کا بوجھ ہو، ایسی صورت میں اس کے لئے صدقہ درست ہے۔ (مختصر سنن ابی داؤد (تہذیب ابن قیم) ج ۲۔))

حضور ﷺ حکیمانہ انداز سے اپنے صحابہؓ کو مختلف موقعوں سے سوال سے نفرت دلاتے رہے، حضور ﷺ کے غلام حضرت ثوبانؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، "جو شخص یہ وعدہ کرے کہ وہ لوگوں سے کچھ سوال نہ کرے گا تو میں اس کے لئے جنت کی ذمہ داری لیتا ہوں؟ حضرت ثوبان نے عرض کیا میں یہ وعدہ کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ اس کے بعد کسی سے کچھ بھی نہ مانگتے تھے۔" اس نبوی تربیت کا دل پر ایک خاص اثر پڑتا تھا اور بہت سے صحابہؓ نے کسی سے کچھ بھی مانگنا ترک کر دیا۔ (مختصر سنن ابی داؤد)

حضرت عوف بن مالک سے مروی ہے کہ ہم سات آٹھ یا نو نفر حضور ﷺ کے پاس تھے۔ آپ نے فرمایا، کیا تم لوگ رسول اللہ ﷺ سے بیعت نہ کرو گے؟ ہم لوگوں نے ابھی قریبی ہی مدت میں بیعت کیا تھا۔ ہم لوگوں نے عرض کیا اللہ کے رسول ہم نے بیعت کر لی ہے، باری باری تین صحابہ نے یہ بات کہی، اور ہم لوگوں نے (بیعت کے لئے) اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور ایک صاحب نے کہا اللہ کے رسول ہم لوگ تو بیعت کر چکے ہیں۔ اب کس بات کی بیعت کریں؟ آپ نے فرمایا، اس بات کی بیعت کرو کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، پانچوں وقت کی نمازیں پڑھو گے سنو اور مانو گے، اور ایک بات آپ نے پوشیدہ طور پر دھیمی آواز میں فرمائی، اور لوگوں سے کچھ مانگو گے نہیں۔ راوی کہتے ہیں پھر ان میں، سے بعض

حضرات تو یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ اگر کوڑا (چابک) گر جاتا تھا تو کسی اور سے اٹھانے کو نہیں کہتے تھے۔

حضرت حکیمؓ کی ذات ان مثالی شخصیتوں میں سے تھی جن پر حضور ﷺ کی تربیت اثر انداز ہوئی تھی اور اس تربیت کے نقوش واثرات ان کے طرز زندگی میں ظاہر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ ایک سو بیس برس کی عمر پائی، ان کا اسلام پختہ ہو گیا اور مال بڑھ گیا۔ ''حضرت مصعب بن ثابتؒ سے مروی ہے فرماتے ہیں: مجھے معلوم ہوا کہ عرفہ کے دن حکیم بن حزام آئے تو ان کے ساتھ سو غلام تھے، سو اونٹ تھے، سو بکریاں تھیں، حکیم نے کہا یہ سب اللہ کے لیے ہیں۔

حضرت ابو حازمؒ سے مروی ہے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ مدینہ منورہ میں اللہ کی راہ میں حکیمؓ سے بڑھ کر کوئی دینے والا ہو، حضرت شعبہؒ نے بیان کیا کہ ''جب زبیرؓ کا انتقال ہوا تو حکیمؓ عبداللہ بن زبیر سے ملے اور پوچھا میرے بھائی نے کتنا قرض چھوڑا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ دس لاکھ، حضرت حکیمؓ نے کہا پانچ لاکھ میرے ذمے ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۴۴)

دین اسلام نے مانگنے اور مدد طلب کرنے کی عادت کو چھڑانے کی ایک جامع تدبیر بتائی ہے اور تمام نفسانی خواہشوں اور ان عملی رکاوٹوں کو ختم کرنے کا سبق پڑھایا ہے، جو لوگوں کو کام کرنے اور حصول رزق کے لئے کدوکاوش سے روکتی اور سوال کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔

اسلام بندۂ مومن سے روئے زمین پر چلنے پھرنے اور عمل وحرکت کا مطالبہ کرتا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ۔ (الملک:۱۵)

جو چلے پھرے گا، ذریعۂ معاش میں لگے گا وہ خود کفیل ہوگا، کھائے پئے گا اور جو کام کرنے پر قادر ہوگا اور کام نہیں کرے گا تو وہ اسی قابل ہے کہ فاقہ کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْراً لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (الجمعہ:۱۰)

''پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو، شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔''

جو شخص کوشش کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے رزق کی طلب میں زمین میں چلے پھرے گا، وہ اس کا مستحق ہوگا کہ اس کو اللہ کا رزق ملے، اور جو بیٹھا رہے گا وہ کاہلی وسستی کا شکار ہوگا اور وہ

اسی قابل ہوگا کہ محروم رہے۔ اسی لئے آپ ﷺ صحابۂ کرامؓ کو کام کرنے اور چاق چوبند رہنے پر آمادہ فرماتے تھے اور کاموں کی مختلف صورتوں کی طرف ان کی رہنمائی فرماتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے غلام ابوعبیدؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کو کہتے ہوئے سنا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم میں کوئی شخص لکڑی کا گٹھر باندھے اور اس کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لائے اور بیچے یہ اس کے حق میں کہیں بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ کسی سے مانگے، پھر وہ دے یا نہ دے۔'' (شرح صحیح مسلم، ج ۷، ص ۱۳۱۔)

آپ ﷺ نے واضح فرمادیا کہ لکڑی کاٹنے کی محنت و مشقت اور کم فائدہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نظروں میں اس کام کی جو ذلت و حقارت ہے، وہ بیکار رہنے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہنے سے بہت بہتر ہے۔ آپ مختلف مناسبتوں سے اس بات پر زور دیتے رہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے کوئی شخص صبح کو نکلے اور اپنی پیٹھ پر لکڑی ڈھو کر اس سے روزی حاصل کرے۔ اس میں سے صدقہ کرے اور اپنی اس محنت کے سبب لوگوں سے بے نیاز رہے یہ اس کے لئے کہیں بہتر ہے بجائے اس کے کہ وہ کسی شخص سے مانگے وہ دے یا نہ دے، دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے افضل ہے۔ دینے میں ابتدا ان لوگوں سے کرو جن کی تم پر ذمہ داری ہے۔

(شرح صحیح مسلم، ج ۷، ص ۱۳۱۔)

عملی تطبیق

آپ ﷺ نے صرف ہدایت پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ مدد فرما کر وقتی طور پر ضرورت مند سائل کی مشکل کو دور فرمایا۔ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ انصار میں سے ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آیا اور سوال کیا آپ ﷺ نے پوچھا کیا تمھارے گھر میں کچھ نہیں ہے؟ انصاری نے جواب دیا کیوں نہیں ایک کمبل ہے جس کا ایک حصہ اوڑھتے اور ایک حصہ بچھاتے ہیں اور پانی پینے کا ایک پیالہ ہے۔ آپ نے فرمایا ان دونوں چیزوں کو میرے پاس لاؤ، وہ دونوں چیزیں لے کر آیا آپ ﷺ نے ان دونوں چیزوں کو لے لیا اور اعلان فرمایا ان دونوں چیزوں کو کون خریدتا ہے؟ ایک شخص نے کہا میں دونوں چیزیں ایک درہم میں خرید لوں گا، اس کے بعد آپ ﷺ نے

فرمایا ایک درہم سے زیادہ کون دے گا؟ آپ ﷺ نے دو یا تین مرتبہ فرمایا، ایک آدمی نے کہا میں ان دونوں چیزوں کو دو درہم میں خریدوں گا، آپ ﷺ نے یہ دونوں چیزیں اس شخص کو دے دیں، اور دو درہم لے لئے اور اس انصاری کو دے دیا اور فرمایا، ایک درہم سے غلہ خرید کر اپنے گھر والوں کو دو! اور دوسرے سے ایک کلہاڑی خریدو، اس کو لے کر ہمارے پاس آؤ، جب وہ لے کر خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس کلہاڑی میں لکڑی لگا دی پھر اس سے فرمایا: جاؤ لکڑی کاٹو اور بیچو، پندرہ دن تک مجھے نظر نہ آؤ، وہ آدمی جا کر لکڑی کاٹنے اور بیچنے میں لگ گیا، جب لوٹا تو دس درہم کما چکا تھا، کچھ درہموں سے کپڑے خریدے، اور غلہ خریدا، آپ ﷺ نے اس سے کہا یہ تمھارے لئے اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرو، کیونکہ مانگنا قیامت کے دن تمھارے چہرے پر داغ بن کر ظاہر ہوگا، مانگنا صرف تین آدمیوں کے لئے درست ہے، نہایت غریب ہو اور فقر کا مارا ہوا، یا قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو۔

ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ یہ حدیث مانگنے والے کی مصیبت دور کرنے کا بہترین نمونہ ہے، تصور میں ذرا مدینہ منورہ کے اس معاشرہ کو لائیے جو مہاجرین و انصار پر مشتمل تھا، جس میں کاشتکار بھی تھے اور تاجر بھی۔ بے روزگار بھی تھے اور فقیر بھی۔ جن کو روزگار نہیں ملتا تھا، کمانے کی راہ نہیں کھلتی تھی وہ بھی، ان حالات میں حضور ﷺ نے تربیت دینے اور ہدایت و رہنمائی کا کام شروع فرمایا، لوگوں کو سمجھاتے اور رہنمائی فرماتے، آپ ﷺ واضح فرماتے کہ طاقتور مسلمان کے لئے مانگنا اور بھکاری بننا زیب نہیں دیتا، آپ ﷺ صرف وعظ و نصیحت پر اکتفا نہ فرماتے اور نہ سوال کرنے سے نفرت دلانے ہی کا کام کرتے، بلکہ بذات خود مانگنے والے کی مشکل حل کرنے کی تدبیر کرتے اور اس کو بتاتے اس کے پاس جو بھی ذریعہ موجود ہو، خواہ وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو اس سے کام لے، اور جو تدبیریں بھی اپنا سکتا ہو اپنائے خواہ وہ کتنی ہی معمولی ہوں، سوال نہ کرے، آپ ﷺ سائل کو سکھاتے کہ ہر وہ کام جس سے رزق حلال حاصل ہو اچھا کام ہے خواہ وہ لکڑی کاٹنے اور بیچنے جیسا معمولی کام ہی کیوں نہ ہو، آپ ﷺ نے اس شخص کی اس کام کی طرف رہنمائی کی، جو اس کے لائق تھا، اور جو کام اس کو بتایا اس کا اوزار بھی مہیا کر دیا۔ یہ شخص ایک ہی دن میں دس درہم کما لاتا ہے، اور آپ ﷺ اس کو پندرہ دن کا موقع دیتے ہیں جس میں اس کام سے اس کی مناسبت کا پتہ لگ جائے اور اس کی ضروریات پوری ہو سکیں، یہ آمدنی ماہانہ

تین سو درہم سے کم نہیں ہوتی، ایسی صورت میں اب اس کو سوال کی ضرورت نہیں باقی رہتی، جو فقر کے مارے اور قرض تلے دبے ہوئے شخص ہی کے لئے جائز ہے۔

حدیث کا فقہی پہلو

(۱) حدیث سے معلوم ہوا کہ مانگنا صرف تین آدمیوں کے لئے جائز ہے۔

(۱) ایسا شخص جو ذلت آمیز فقر میں مبتلا ہو۔

(۲) ایسا شخص جو قرض سے اتنا گراں بار ہو کہ اس کے لئے صدقہ لینا جائز ہو۔

(۳) خوں بہا کا غیر معمولی بوجھ۔ جو اصلاح ذات البین کے سلسلہ میں قرض سے گراں بار ہو گیا ہو اس کیلئے بھی سوال جائز ہے۔

۲۔ کسی کے پاس کوئی مال آئے تو اس کا قبول کرنا واجب ہے یا مستحب؟ اس میں علماء کے تین مسلک ہیں۔ جن کو ابو جعفر محمد بن جریر طبری نے نقل کیا ہے اور دوسرے لوگوں نے بھی بیان کیا ہے لیکن درست وہ مسلک ہے جس پر جمہور کا اتفاق ہے کہ بادشاہ کے عطیہ کے علاوہ دوسروں سے لینا مستحب ہے۔ بادشاہ کے عطیہ کو کچھ لوگوں نے حرام قرار دیا ہے، کچھ لوگوں نے مباح اور کچھ لوگوں نے مکروہ بتایا ہے۔ درست یہ ہے کہ بادشاہ کے مال میں اگر حرام کا حصہ غالب ہے تو لینا حرام ہے، اسی طرح بادشاہ اگر غیر مستحق کو دے اور اس کے مال میں غالب حصہ حرام کا ہو تو لینا مباح ہے جبکہ لینے والے کے لئے کوئی ایسا مانع نہ ہو جو اس کو لینے کے حق سے روکتا ہو، اور جماعت کی رائے یہ ہے کہ بادشاہ اور اس کے سبھی لوگوں سے لینا جائز ہے، اور کچھ کا کہنا ہے کہ بادشاہ کا عطیہ لینا تو مستحب ہے لیکن دوسروں کا نہیں۔ واللہ اعلم۔

۳۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تین مرتبہ سوال کرنا جائز ہے، چوتھی مرتبہ مانگنا منع ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ ذی حیثیت کا سوال کرنا عار کی بات نہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ تین مرتبہ سوال کے بعد سائل کو واپس کر دینا ناپسندیدہ نہیں۔ (فتح الباری، ج ۳ ص ۳۳۷)

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض حالات میں لینے پر زہد باقی رہتا ہے کہ دل کا استغنا ہی زہد ہے۔

(۲) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دل کے استغناء کے ساتھ لینے میں بھی زہد کا اجر ہے، اور رزق میں برکت ہوتی ہے۔

(۳) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام (یعنی حاکم) کو چاہئے کہ مانگنے والے کے مانگنے میں کیا خرابی ہے اس کو دینے سے پہلے اس کو نہ بیان کرے تا کہ اس کی نصیحت کا اس پر اثر پڑے اور اس کو یہ خیال نہ ہو کہ اس کی نصیحت دینے سے بچنے کے لئے ہے۔ (فتح الباری، ج ۳، ص ۳۳۷)

(۴) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بندۂ مومن کو حصول رزق کے لئے زمین کے وسائل کو کام میں لانے کی بھرپور کوشش کرنی چاہئے، خواہ کیسا ہی کام ہو، کھیتی ہو یا کاریگری، تجارت ہو یا کسی بھی قسم کا نفع بخش پیشہ۔

(۵) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان حاکم کا فرض ہے کہ دینے میں اس کی ضرورت کو اچھی طرح پوری کر دینے میں مانگنے والے کا اکرام ملحوظ رکھے، اس کے بعد اس کے لئے ایسے کام کی سہولت مہیا کر دے، جو ممکن ہو۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر سائل کو کام کے لئے کسی اوزار وغیرہ کی ضرورت ہو تو وہ بھی مہیا کر دے، یا کسی پیشے کی تربیت کی ضرورت ہو جس کے ذریعے وہ مناسب کام کرنے لگے تو جماعت وحکومت کا یہ فرض ہے کہ اس سلسلے میں اس کو سہارا دے کہ خود صدقہ یا مدد طلب کئے بغیر وہ کام کرنے کے قابل ہو جائے۔

(۶) حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلم معاشرے پر خواہ حاکم ہوں یا محکوم فرض ہے کہ تنگ دستی پر قابو پانے کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں اور ذرائع کو کام میں لائیں، اس میں شبہ نہیں کہ آمدنی بڑھانے اور موجودہ وسائل کو ترقی دینے کو سوال کا دروازہ بند کرنے میں بڑا دخل ہے۔

حدیث - ۲۵

تلاش معاش کی ترغیب

عن ابی عبید مولٰی عبدالرحمن بن عوف انه سمع ابا هريرة رضی اللّٰه عنه يقول: قال رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم لأن يحتطب احدكم حزمةً علٰى ظهره خير من ان يسال احداً فيعطيه او يمنعه۔

(فتح الباری، ج ۴، ص ۳۰۴۔ ابن ماجہ، مسند احمد، ج ا ص ۱۶۷)

''حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے خادم ابوعبیدہؓ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم میں سے کوئی شخص لکڑی جمع کر کے اس کا گٹھر اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے اور بیچے اس سے روزی حاصل کرے) اس کے لئے کہیں بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے، مانگے پھر وہ شخص اس کو دے یا نہ دے۔''

اسلام ذریعہ معاش کے لئے کام کرنے، وسائل زندگی کو بڑھانے اور ترقی دینے والا دین ہے۔ بندۂ مومن کو حکم ہے کہ زمین پر چلے پھرے اور روزگار کے طریقے تلاش کرے، اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ

(الملک: ۱۵)

''وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو نرم کیا، تو اس کی راہوں میں چلو پھرو اور خدا کا (دیا ہوا) رزق کھاؤ۔ عمل سے مراد اپنی جدوجہد اور کوششوں کو کام میں لانا اور آمدنی کے اسباب و وسائل اختیار کرنا ہے۔ اس دنیاوی زندگی کے لئے اللہ تعالٰی نے (اپنی

حکمت خاص سے) یہ دستور بنایا ہے کہ انسان کو زمین کے اوپر یا اس کے اندر کی نعمتیں اور ضروریات معاش اور روزی محنت کئے بغیر نہ حاصل ہو۔ اس کو اپنی قوت کار کو کام میں لگانا دستور قدرت ہے، دین اسلام میں حصول ذرائع اور وسائل کی فکر و کوشش بھی عام معنی میں ایک قسم کی عبادت ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین کی آبادکاری کے لئے پیدا فرمایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰقَوْمِ اعْبُدُو اللّٰهَ مَالَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ هُوَ أَنْشَأَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا۔ (ہود:٦١)

''تو انھوں نے کہا کہ اے قوم! خدا ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اسی نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس میں آباد کیا۔

لیکن مخلوق کے لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہی فیصلہ ہے کہ یہ رزق جس کی اللہ تعالیٰ نے ضمانت لی ہے اور ذرائع معاش جن کو اللہ تعالیٰ نے پھیلا رکھا ہے، مخلوق کے لئے اسی وقت ممکن ہوگا، جب عبادت کے شعائر کو ادا کرے، اور ان چیزوں کی رعایت کرے جن کو تقدم اور اولیت حاصل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْراً لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

(الجمعہ:١٠)

''پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی راہ لو اور خدا کا فضل تلاش کرو اور خدا کو بہت بہت یاد کرتے رہو تا کہ تم نجات پاؤ۔''

اسلامی طرز زندگی میں عمل کی یہی ترتیب اور توازن ہے، جو اسلام کا امتیاز خاص ہے۔ زمین میں زندگی کے تقاضوں کے لئے جد وجہد، نشاط اور کمائی کی فکر، پھر اس کے بعد اس فضا سے کٹ کر روح و دل کو کچھ دیر کے لئے اللہ کی یاد کے لئے یکسو کر لینا، یہ دل کو زندہ رکھنے کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس کے بغیر مومن خدا سے تعلق اور امامت کی گرانباری کو سنبھالنے کی اہلیت اور فیضان خداوندی سے ربط پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوسکتا، تلاش معاش کے دوران اللہ تعالیٰ کی

یادضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دھیان اور یادہی معاش کی تگ ودو کو عبادت بناتا ہے، اگر دونوں کے درمیان توازن قائم کرنے میں خلل پڑے اور مادیت کا پہلو روح پر غالب آجائے تو نفس کا محاسبہ ضروری ہے، اور کاموں کی ترتیب وتوازن کو شریعت کی میزان پر لانا فرض ہے، قرآن کریم اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَإِذَا رَاَوُا تِجَارَةً أَوْ لَهْوانِ انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَآئِماً قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرَّازِقِيْنَ ۔ (الجمعہ:۱۱)

''اور جب یہ لوگ سودا بکتا یا تماشا ہوتا دیکھتے ہیں تو اُدھر بھاگ جاتے ہیں اور تمہیں (کھڑے کا) کھڑا چھوڑ جاتے ہیں، کہہ دو کہ جو چیز خدا کے یہاں ہے، وہ تماشے اور سودے سے کہیں بہتر ہے اور خدا سب سے بہتر رزق دینے والا ہے)۔''

آیت میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ تماشے اور سودے سے بہتر ہے۔ گویا یہ بتانا مقصود ہے کہ رزق اللہ ہی کے پاس سے ہے، لہٰذا عبادت کی ترتیب کا لحاظ ضروری ہے، اور تمام معاملات میں توازن واعتدال کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کبھی یہ توازن نہایت اچھے حالات اور مبارک گھڑی میں بھی بگڑ جاتا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ (مال واسباب کا) قافلہ آیا اس وقت ہم لوگ حضور ﷺ کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھ رہے تھے، قافلے کی آمد سن کر ۱۲ آدمیوں کے علاوہ سبھی لوگ چلے گئے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (''وإذا رأوا تجارة أو لهواً انفضّوا إليها وتركوك قائماً......) اور جب یہ لوگ سودا بکتا یا تماشا ہوتا دیکھتے ہیں تو اُدھر بھاگ جاتے ہیں اور تمہیں کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔ (فتح الباری: ج ۴ص ۲۰۰)

اس واقعے سے اس جدوجہد کا اندازہ ہوتا ہے جو نفوس کی تربیت وتعمیر میں صرف ہوئی اور اس کے نتیجے میں اعتدال پیدا ہوا اور ایسی جماعت وجود میں آئی جو اسلامی روح کا پیکر بن گئی، اور شریعت کے منشأ ومعانی اور اس کے رموز واسرار کو اچھی طرح سمجھ گئی، عبادت ومعاملات میں ترتیب اور کون سا عمل پہلے ہو، کون سا بعد میں، اس سے پوری طرح واقفیت ہوگئی جس کے سبب

اس جماعت کو قیادت ملی، قومیں ان کی مطیع بن گئیں اور پوری انسانیت نے ترقی کی۔

یہ واقعہ نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے خیر وشر کی تصویر کشی کرتا ہے اور اس کے اندر کامیابی اور نفس کی پاکی حاصل کرنے کی غیر محدود صلاحیت کو بتاتا ہے، جو صبر، فہم، ثابت قدمی اور حقیقت تک رسائی کی طاقت وصلاحیت کی غمازی کرتا ہے، اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ اپنی پرانی معاشرتی عادات کو خیر باد کہہ سکے اور جب اسوۂ رسول کو اپنانے والا کوئی مخلص رہنما مل جائے تو شریعت کے احکام وہدایت کو قبول کرلے۔

کچھ لوگ بعض پیشوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور اس کو گری ہوئی نظر سے دیکھتے ہیں، جیسا کہ بہت سے عربوں کا حال تھا جو پیشوں اور ہاتھ سے ہونیوالے کاموں کو حقیر جانتے تھے، جب اسلام آیا تو اس نے ان غلط باتوں کا صفایا کردیا اور کام کی قدر وقیمت کو بڑھادیا خواہ اس کی صورت کیسی ہی ہو (اونچی یا نیچی) اور بیکاری اور دوسروں کا دست نگر بننے کو حقیر بتایا۔

آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو کام کرنے اور آمدنی کے حصول پر ابھارا اور اس کی تلقین فرمائی ہے۔ خالد بن معدان حضرت مقدام رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھاتا۔ اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔ اس حدیث اور اس جیسی دوسری احادیث کا صحابہ کرام کی عملی زندگی اور ان کی فہم وفراست کو صحیح رخ پر لگانے میں بڑا دخل تھا، چنانچہ وہ کسب معاش کے مختلف عملی میدانوں میں لگ گئے۔ (فتح الباری: ج ۴ ص ۳۰۰)

ابوالاسود حضرت عروہؓ سے روایت کرتے ہیں، کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اصحابِ رسول ﷺ اپنے کام خود انجام دیتے تھے یہاں تک کہ (محنت مشقت کے سبب) ان کے جسم سے بو آتی تھی، لہٰذا ان کو غسل کرنے کی ہدایت کی گئی۔ (فتح الباری: ج ۴ ص ۳۰۰)

ان اچھے الفاظ اور تربیتی مواقع کے ذریعہ آپ ﷺ نے کام کی قوت وصلاحیت رکھنے والوں کو رزق حلال کی کمائی پر آمادہ کیا اور شوق دلایا اور لوگوں سے مانگنے کی ممانعت فرمائی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کہ (تم میں سے کوئی لکڑی کا گٹھر اپنی پشت پر ڈھو کر لائے (اور بیچے) اس کے لئے بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ کسی سے سوال کرے پھر وہ

دے یا انکار کردے) جو تفصیلات بیان ہوئیں ان سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو حصول رزق میں مشغول ہونے اور کمائی کے شعبوں میں لگنے کی تلقین میں اسی پہلو کی طرف توجہ دینے کو تقدم واولیت حاصل ہے۔اس کے بعد سوال کی ممانعت بیان ہوتی ہے۔حضرت جعفر کہتے ہیں کہ میں نے حمزہ بن عبداللہ بن عمر سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے: آدمی لوگوں سے برابر مانگتا رہتا ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہ ہوگا (فتح الباری: ج ۴ رص ۳۰۰)

حدیث کا فقہی پہلو

ابن حجر نے ماوردیؒ سے ان کا قول نقل کیا ہے کہ کمائی کے بنیادی پیشے، کاشتکاری، تجارت، صنعت ہیں۔امام شافعیؒ کے نزدیک ان میں سب سے اچھا پیشہ تجارت ہے اور ہمارے نزدیک سب سے قابل ترجیح اور بہتر کاشتکاری ہے۔اس لئے کہ یہ توکل سے زیادہ قریب ہے، اس موضوع پر امام نوویؒ نے اسی سلسلہ میں مذکور حضرت مقدام کی حدیث پیش کی ہے کہ زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ سب سے بہتر کمائی اپنے ہاتھ کی محنت ہے، اب اگر کاشتکاری ہے تو یہ سب سے عمدہ ہے کہ اس میں اپنے ہاتھ کا عمل بھی پایا جاتا ہے اور توکل بھی مزید براں اس کا فائدہ انسان اور جانوروں دونوں کے لئے عام ہے، اس لئے بھی کہ عادۃً کاشتکاری سے حاصل شدہ رزق بلا عوض دیئے کھایا جاتا ہے ہم کہتے ہیں اپنے ہاتھ کی کمائی جو جہاد میں کفار سے مال غنیمت کے طور پر حاصل کی جائے، وہ سب سے بہتر ہے (کہ یہ حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی کمائی تھی) یہ سب سے عمدہ کمائی ہے کہ اس کے ذریعہ کلمۂ اسلام بلند ہوتا ہے، کفر کا زور ٹوٹتا ہے اور آخرت کا نفع حاصل ہوتا ہے۔انھوں نے کہا کہ جو اپنے ہاتھ سے کام نہ کرے تو اس کے لئے کاشتکاری ہی بہتر ہے اس لئے کہ اس میں توکل بھی پایا جاتا ہے، ہماری رائے میں اس کی فضیلت کا سبب اس کے نفع کا متعدی ہونا ہے۔(فتح الباری: ج ۴ رص ۳۰۴)

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حاکم ومربی کا فرض ہے کہ لوگوں کو کام کرنے اور رزق حلال

حاصل کرنے کا مشورہ دے اور اس پر آمادہ کرے۔

(۲) حدیث کام کی ضرورت پر زور دیتی ہے اور سوال کرنے سے نفرت پیدا کرتی ہے اس لئے کام ہی فقر کے مقابلے کا پہلا ہتھیار ہے، اور انسان کے لئے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو بذات خود غنی و مالدار بنائے۔

(۳) مناسب کام کرنا ہی آمدنی کا ذریعہ اور اسلامی معاشرہ کی ترقی کا راستہ ہے۔ اسی لئے آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو صنعت اور پیشوں کو اپنانے کا حکم دیا ہے، اور اپنے پیچھے باریکیوں اور اس کے اختصاص کو بھی چھوڑا ہے، چنانچہ فرمایا: اپنے ہاتھ کی کمائی سے بڑھ کر بہتر کھانا کسی نے نہیں کھایا۔ (فتح الباری: ج ۴ ص ۳۰۴)

یعنی اپنے ہاتھوں سے کمایا ہوا رزق (کھانا) بندۂ مومن کے لئے سب سے بہتر رزق ہے۔ کمائی کے وسائل میں سفر بھی شامل ہے، چنانچہ فرمایا: سفر کرو غنی بن جاؤ گے۔

(الطبرانی فی الاوسط)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَن يُّهَاجِرُ فِىُ سَبِيُلِ اللّٰهِ يَجِدُ فِى الْاَرْضِ مُرَاغَماً كَثِيُراً وَّسَعَةً (النساء: ۱۰۰)

''اور جو بھی شخص خدا کی راہ میں گھر بار چھوڑ جائے وہ زمین میں بہت سی جگہ اور کشائش پائے گا۔''

(۴) حدیث سے معلوم ہوا کہ کام کا مقصود اور اللہ کے نزدیک اس کی قیمت نفس کو بے لوث رکھنا اور اس کو سوال سے بچانا ہے۔

حدیث - ۲۶

غنی وہ ہے، جس کا دل غنی ہو

عن ابی هريرة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ’’ ليس الغنى عن كثرة العرض ولكن الغنى غنى النفس.‘‘ (البخاری، مسلم)

’’حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’مال اور ساز وسامان کی کثرت مالداری نہیں ہے بلکہ اصل مالداری دل کا استغنا (اور قناعت) ہے۔‘‘

انسان اپنی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے دنیا کا بڑا لالچی اور حریص واقع ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبّاً جَمًّا (الفجر: ۲۰) (اور تم مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔)

دنیوی ساز وسامان سے اس کو آسودگی نہیں ہوتی، نہ دنیا کی پیاس بجھتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی انسانی مزاج کی تصویر کشی فرمائی ہے، فرمایا: اگر آدمی کو مال کی دو وادیاں مل جائیں تو وہ تیسری وادی کا خواہش مند ہوگا اور اس کی طلب میں لگ جائے گا، آدمی کا پیٹ تو مٹی ہی بھر سکتی ہے اور جو توبہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

مال واولاد میں مشغولیت امتحان وآزمائش ہے، یہ آزمائش اپنا محاسبہ کرتے رہنے، من کی چاہت اور طلب کو صحیح رخ پر لگانے اور اپنے اندر ایک دوسرے کی بہی خواہی کا جذبہ پیدا کرنے کی متقاضی ہے۔ لہٰذا اس دین متین کے لئے ضروری تھا کہ حصول رزق کے لئے کوشش کرنے میں وہ انسان کو اعتدال ومیانہ روی کی راہ دکھائے اور اس کے لئے اچھا طریقہ بتائے کہ وہ اسی طرح اپنے اندر اور زندگی کے معاملات میں توازن قائم کرسکتا ہے، یہی طرز زندگی اس کو سکون قلب عطا کرسکتا ہے اور اسی میں اس کی خوش بختی کا راز پوشیدہ ہے، جو اس کو افراط وتفریط اور اس غلو سے بچا سکتا ہے جو اس کی جان اور جسم دونوں کو تھکن اور پریشانی میں ڈالتا ہے۔

اس انسان کو اس کی حرص اور لالچ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ خود اپنے اور معاشرے دونوں کے لئے خطرہ بن جائے۔ اسی وجہ سے اس کے شوق وحوصلہ کو بلند اقدار، اونچے معانی اور باقی رہنے والے رزق کی طرف موڑنا ضروری تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔ (آل عمران:۱۴)

''لوگوں کو ان کی خواہش کی چیزیں عورتیں اور بیٹے اور سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں (مگر) یہ سب دنیا ہی کی زندگی کے سامان ہیں اور خدا کے پاس بہت اچھا ٹھکانہ ہے۔''

اس آیت میں نفس انسانی کی وہ پسندیدہ خواہشیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں، جن کی طرف فطرت انسانی مائل ہوتی ہے، قرآنی تعلیم ان خواہشوں کو گندی سمجھنے کی دعوت نہیں دیتی، اور نہ اس کو ناپسندیدہ ہی قرار دیتی ہے بلکہ اس کے محرکات اور حقیقت کو سمجھنے کی دعوت دیتی ہے۔

آیت نے خواہشوں کو اس درجے میں رکھا ہے، جس سے وہ تجاوز نہ کریں اور زندگی میں جو شئے خواہشوں سے بھی زیادہ قابل قدر ومحترم ہے، اس کی حق تلفی نہ کرے، آیت ان اونچی اقدار کی طرف متوجہ کرتی ہے، جو انسانی پسند کو صحیح رخ دیں اور جو غلو کے شائبہ سے پاک ہوں۔

لہٰذا انسان اگر اونچا مرتبہ چاہتا ہے اور باقی رہنے والے شرف وبلندی کا طلب گار ہے تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکموں پر چلنا اور اس کا پاس ولحاظ ضروری ہے جس کو تقویٰ کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذَالِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ۔ (آل عمران:۱۵)

''(اے پیغمبران سے) کہو کہ بھلا میں تم کو ایسی چیز بتاؤں جو ان چیزوں سے کہیں اچھی ہو۔ (سنو) جو لوگ پرہیز گار ہیں ان کے لئے خدا کے باغات (بہشت) ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ عورتیں ہیں اور (سب سے بڑھ کر) خدا کی خوشنودی اور خدا (اپنے نیک) بندوں کو دیکھ رہا ہے۔''

آیت میں مذکور صاف ستھرے پاکیزہ سامانِ راحت اور ہمیشہ باقی رہنے والے ثواب ناقص اور ختم ہو جانے والے اسباب دنیوی پر نظر رکھتے ہوئے آپ ﷺ دنیا کی حقیقت کو مزید واضح فرماتے ہیں، آپ کا ارشاد ہے: درہم و دینار ٹھاٹ باٹ اور زیب و زینت کا پرستار ہلاک ہو، ملا تو خوش نہ ملا تو ناراض۔ (فتح الباری)

اس کے پیش نظر کہ قرآن وحدیث کی تعلیم کے مطابق مال کی محبت بے راہ روی کا خطرناک سبب ہے، قرآن وحدیث دونوں ہی مختلف اوقات اور مواقع سے اس کے مداوے کی راہ دکھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجاً مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقىٰ (طٰہٰ:۱۳۱)

اور مت پسار اپنی آنکھیں اس چیز پر جو فائدہ اٹھانے کو دی ہم نے ان طرح طرح کے لوگوں کو رونق دنیا کی زندگی ان کے جانچنے کو اور تیرے رب کی دی ہوئی روزی بہتر ہے اور بہت باقی رہنے والی۔

آپ ﷺ صحابہ کرام کو دنیا سے دل نہ لگانے اور اعتدال و میانہ روی کی تعلیم دیتے رہے، حضرت عروۃ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ بادشاہوں کے حالات اور باتیں سنتے تو جلدی سے گھر میں داخل ہو جاتے اور یہ آیت پڑھتے: ''ولا تمدن عينيك الخ۔''

آپ ﷺ معتدل و متوازن طریقے تربیت کے اسی لطیف انداز میں نفسانی خواہشوں سے آگاہ فرماتے رہتے تھے اور اس سے بچنے کی تدابیر بیان فرماتے رہتے تھے لوگوں کے دنیا کی طرف جھکنے اور تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھنے کو بہ نظر عبرت دیکھنے کی ہدایت

فرماتے رہتے تھے، اور دنیا سے تعلق کی وہ مقدار بیان فرماتے رہتے تھے، جو مناسب ہو اور ذہنوں کی وہ بے داغ تعمیر فرماتے جو قناعت وتقویٰ پر قائم ہو، ابن حبان حضرت ابوذرؓ کی حدیث بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ ہم سے حضور علیہ نے فرمایا ابوذرؓ ! کیا تم مال کی زیادتی کو مالداری سمجھتے ہو، میں نے عرض کیا ہاں، اللہ کے رسولؐ ہم تو یہی سمجھتے ہیں، آپؐ نے فرمایا: مالداری تو حقیقتاً دل کی مالداری ہے اور غریبی دل کی غریبی ہے۔'' ابن بطال فرماتے ہیں کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مال کی زیادتی اصل میں مالداری نہیں ہے، اس لئے کہ بہت سے لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے مال کی فروانی عطا کی ہے، انھیں اپنے اس مال پر اطمینان وقناعت نہیں، وہ برابر مال بڑھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اس کی پروانہیں کرتے کہ مال کہاں سے آ رہا ہے، وہ مال کی اس شدید محبت اور لالچ کی وجہ سے گویا فقیر ہیں۔ اصلاً تو مالداری دل کی مالداری ہے کہ جو کچھ ملا، اس پر مطمئن وقانع ہے، برابر بڑھاتے رہنے کی لالچ میں نہیں رہتا، نہ طلب مال میں سرگرداں رہتا ہے، ایسا شخص تھوڑا مال ہونے پر بھی گویا غنی ہے۔ قرطبیؒ نے کہا کہ مفید مالداری یا قابل تعریف وپسندیدہ مالداری دل کا غنی ہونا ہے، ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب دل کا غنی ہوگا تو وہ حرص اور لالچ سے بچے گا، جس کے ذریعہ بڑائی اور عزت نفس حاصل ہوگی، اس کی اہمیت ہوگی، اس کو پاکیزہ کردار لوگوں میں بلندی وتعریف کا وہ مرتبہ حاصل ہوگا، جو اس مالدار کو نہیں حاصل ہوگا، جس کا دل حرص اور لالچ، طبیعت کے گھٹیا پن اور بخل کی وجہ سے پست وذلیل کاموں کے کرنے پر آمادہ کرتی رہتی ہے، لوگ برابر اس کی مذمت کرتے رہتے ہیں اور ان کی نظروں میں اس کی کوئی قدر نہیں ہوتی، وہ حقیر سے حقیر اور ذلیل سے بھی ذلیل آدمی سے کمتر سمجھا جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ دل کا غنی اللہ کی عطا کردہ نعمت پر قانع رہتا ہے بلاضرورت مال بڑھانے کی لالچ میں نہیں پڑتا۔ ہروقت مال کی تلاش میں نہیں رہتا، نہ بار بار سوال کرتا رہتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دے رکھا ہے اس کی قسمت میں جو کچھ ہے وہ اس پر راضی ہے۔ اس کو یہ استغناء ایسا بنا دیتا ہے جیسے گویا مال اس کو ملتا ہی رہتا ہے۔

انسان کا دل فقیر اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ نے اس کو جو کچھ عطا کیا ہے اس پر قناعت نہیں ہوتی بلکہ ہروقت وہ مال کی فکر میں لگا رہتا ہے، جس طرح بھی حاصل ہو، گویا اس کے پاس مال

ہے ہی نہیں۔ چنانچہ جب اس کی منشاء کے مطابق مال نہیں ملتا تو اس طرح رنج وغم کا شکار رہتا ہے، گھٹن کڑھن میں مبتلا رہتا ہے اس طرح جس طرح کہ مال سے محروم شخص پریشان ہوتا ہے اس لئے کہ جب وہ اس پر قناعت نہ کرے گا، جو اس کو ملا ہے تو فقیر ہی کے مثل ہے استغناء تو اسی وقت حاصل ہوتا ہے، جب انسان اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش پر راضی رہے اور اس کے حکم کے سامنے سر جھکائے رکھے، اور اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ زیادہ اچھا اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ (فتح الباری، ۱۱، ۲۷۲)

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ قناعت اس کو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جو چیزیں دی ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا اس پر راضی وخوش رہے، انسان پر اس کی خاندانی وجسمانی صلاحیتوں کا اثر ہوتا ہے اور ماحول وواقفیت اس کو مزید طاقت پہنچاتی ہے جو چیزیں اس کو میسر نہیں اور دوسرے کو حاصل ہیں یہ برابر ان کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ (مشکلة الفقر وكيف عالجها الاسلام) انھیں افکار ومعانی کی تدبیر وعلاج حضور ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں بتایا ہے:

''مالداری ساز وسامان کی کثرت کا نام نہیں بلکہ اصل مالداری دل کا استغناء اور قناعت ہے۔''

حدیث میں مال کی اچھائی کی طرف بھی اشارہ ہے، لیکن یہ اچھائی نفس مال کی اچھائی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا انحصار اس کے استعمال پر ہے۔ اسی طرح کوئی مالدار محض مال ہونے کی وجہ سے مالدار نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا انحصار مال کے خرچ پر ہوگا کہ وہ کہاں خرچ ہو رہا ہے۔ خرچ ہو بھی رہا ہے یا صاحب مال اپنے بخل اور لالچ کے سبب اس کو جمع ہی کرتا رہا ہے۔ اگر کوئی مالدار ہے اور اس مال کو اہل حقوق پر خرچ کرنے میں بخل کرتا ہے، اس مال کو نیکی اور بھلائی کے کاموں میں نہیں لگاتا تو یہ مالدار نہیں ہوا اس کا دل فقیر ہے وہ ختم ہو جانے کے ڈر سے مال کو خرچ کرنے سے روکے ہوئے ہے، ایسا شخص ظاہر وباطن دونوں اعتبار سے فقیر ہے۔ خواہ مال اس کے تصرف میں ہو، اس لئے کہ وہ اس مال سے نہ دنیا کا فائدہ اٹھا رہا ہے نہ آخرت کا بلکہ اس طرح تو یہ مال اس کے لئے وبال جان ہوگا۔ (فتح الباری۔ کتاب الرقاق۔ باب الغنی عن النفس ۲۷۲/۱۱)

حدیث کا فقہی پہلو

مومن کے لئے جائز ہے کہ مال کمانے، اکٹھا کرنے اور مالدار بننے کے لئے حدود

شریعت کے اندر جائز وسائل کو کام میں لائے۔ آپ ﷺ غنیٰ کی دعا فرمایا کرتے تھے، آپ دعا فرماتے: اللھم انی اسئلک الھدیٰ والتقی والعفاف والغنی (اے اللہ میں تجھ سے تقویٰ ہدایت، سوال کرنے سے حفاظت اور غنی کا طلبگار ہوں) آپ ﷺ نے اپنے خادم حضرت انسؓ کے لئے مال کی زیادتی اور درازی عمر کی دعا فرمائی، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میری والدہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! اپنے خادم انسؓ کے لئے دعا فرمادیجئے، آپؐ نے فرمایا: اے اللہ تو ان (انس) کے مال اور اولاد کو بڑھادے اور جو کچھ انھیں عطا فرما اس میں برکت دے۔ (فتح الباری، ج ۱۱، ص ۱۴۴)

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) یہ حدیث بندۂ مومن کے دل میں صبر وقناعت اور عطائے خداوندی پر راضی رہنے کا شوق پیدا کرتی ہے۔

(۲) مال کا لالچ اور اس کی حد سے بڑھی ہوئی حرص، دین وعقیدہ کو نقصان پہنچا کر مال کی محبت میں غلو سے نفرت پیدا کرتی ہے۔

(۳) حدیث شرعی طریقہ سے مال جمع کرنے کو حرام نہیں بتاتی اور نہ اس سے روکتی ہے بلکہ مسلمان کو ان طریقوں کے اپنانے کی طرف متوجہ کرتی ہے جو باعث راحت ہوں۔

(۴) قناعت کا مطلب یہ نہیں کہ محتاج لوگ گھٹیا اور فاقہ کشی کی زندگی پر راضی رہیں۔ کسب معاش کی کوئی فکر وکوشش نہ کریں۔ بلکہ قناعت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ عطا فرمایا ہے، اس پر اس کی حمد وثنا کرنا، جو کچھ ملا اس پر شکر ادا کرنا، دوسروں کی طرف سے کینہ رکھنے سے پرہیز اور اللہ کے دیئے پر خوش ومطمئن رہنا ہے۔

حدیث - ۲۷

اسلام میں باغبانی اور زراعت کی فضیلت

٠عن أنس رضى الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ ما من مسلم يغرس غرساً أو يزرع زرعاً فيأكل منه طيراً و إنسان أو بهيمة إلا كان له به صدقة.

(بخاری ۱۰/ص ۴۳۸، مسلم ج ۱۰/ص ۱۲۳، مسند الامام احمد بن حنبل ج ۳/ص ۱۴۷)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا! جو مسلمان بھی کوئی پودا لگاتا ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے پھر اس میں سے کوئی پرندہ، انسان یا کوئی بھی جاندار کھاتا ہے تو یہ سب صدقہ میں شمار ہوتا ہے (یعنی جو صدقہ کا ثواب ملتا ہے وہی ان جانوروں کے کھانے میں بھی ثواب ملتا ہے خواہ کھیت یا باغ والا اس کو ناچاہتا ہو جب بھی)۔

اسلامی نقطۂ نظر سے انسان پوری کائنات میں روئے زمین پر جو جاندار مخلوقات پائی جاتی ہیں ان میں سب سے افضل اور قدر ومنزلت والا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت سی خصوصیات سے نوازا اور دوسری مخلوقات پر اس کو گوناگوں صفات سے بلند بنایا ہے۔ اور چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بڑے اونچے اور زبردست مقاصد کے لئے پیدا فرمایا ہے، اسی لئے اس کو خلعت خلافت سے نوازا اور کائنات سے اس کو جوڑ دیا ہے ایسا کہ اس کو اس میں ترقی دینے، بڑھانے اور اس سے فائدہ اٹھانے اور اس کو اپنے فائدہ کے لائق بنانے کی ذمہ داری ڈال دی ہے، قرآن پاک کا یہ ارشاد اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشاً وَّالسَّمَآءَ بِنَاءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّکُمْ فَلَاتَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَاداً وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (البقرة:۲۲)

''جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے مینہ برسا کر تمہارے کھانے کیلئے انواع واقسام کے میوے پیدا کئے پس کسی کو خدا کا ہم سر نہ بناؤ اور تم جانتے تو ہو۔''

دوسری آیت میں فرمایا :

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمۡ مِّنۡهُ شَرَابٌ وَّمِنۡهُ شَجَرٌ فِيۡهِ تُسِيۡمُوۡنَ يُنۡۢبِتُ لَكُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَالزَّيۡتُوۡنَ وَالنَّخِيۡلَ وَالۡاَعۡنَابَ وَمِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ‏ (النحل:۱۰،۱۱)

وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جسے تم پیتے ہو اور اس سے درخت بھی (شاداب ہوتے ہیں) جن میں تم اپنے چارپایوں کو چراتے ہو۔ اسی پانی سے وہ تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور (اور بے شمار درخت) اگاتا ہے اور ہر طرح کے پھل (پیدا کرتا ہے) غور کرنے والوں کے لئے اس میں (قدرت خدا کی بڑی) نشانی ہے۔

لہٰذا یہ انسان کی ذمہ داری ہے کہ کائنات کی چیزوں کے خصائص وفوائد اور ان کو کام میں لانے کے طریقے معلوم کرے، تاکہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے، اس کی یہ کوشش حکم خداوندی کی تعمیل وامتثال امر کا مظہر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد :

هُوَ الَّذِىۡ جَعَلَ لَـكُمُ الۡاَرۡضَ ذَلُوۡلًا فَامۡشُوۡا فِىۡ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِهٖ‌ؕ وَاِلَيۡهِ النُّشُوۡرُ‏ (الملک:۱۵)

وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو نرم کیا تو اس کی راہوں میں چلو پھرو اور خدا کا (دیا ہوا) رزق کھاؤ اور (تم کو) اس کے پاس (قبروں سے) نکل کر جانا ہے۔

ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بندۂ مومن کی ذمہ داری ہے کہ روئے زمین کو آباد کرے، کھیتی اور باغبانی کرکے، تحقیق خواص اشیاء اور ایجادات کرکے، وہ افتادہ اور بنجر زمین کو قابل کاشت وباغبانی بنا کر اس کو آباد وزندہ کرے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا جس نے غیر آباد (بنجر) زمین کو آباد وقابل استعمال بنایا وہ زمین اسی کی ملکیت ہوگئی (بخاری کتاب الحرث والزراعۃ)

حضرت عروہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے روایت فرمایا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا : کہ جس نے ایسی زمین کو آباد کیا جو کسی اور کی ملکیت نہیں ہے تو یہ زمین اسی آباد کرنے والے کی ہو جائے گی، وہی اس کا زیادہ حقدار ہے۔ حضرت عروہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں یہی فیصلہ دیا ہے۔

ان آیات اور احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کھیتی اور باغبانی اقتصادیات کا اہم ترین عنصر ہیں کہ ذرائع معاش کو بڑھانے اور آمدنی کے حصول میں یہ دونوں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں، خواہ صاحب زمین خود کام کرے یا بٹائی اور اجرت پر کام لے۔

حضرت نافع حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ انھوں نے ان کو بتایا کہ حضور ﷺ نے خیبر کی زمین کو نصف آمدنی کے عوض خواہ وہ کھجور یا غلے وغیرہ کی شکل میں ہو بٹائی پر دیا اس آمدنی میں سے آپ ایک سووسق ازواج مطہرات کو عطا فرماتے تھے، جس میں اسی وسق کھجور ہوتے تھے اور ۲۰ وسق جو۔"

حضرت نافع نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا کہ حضور ﷺ نے خیبر کا علاقہ یہودیوں کو دے دیا کہ وہ اس میں کام کریں، کھیتی باڑی کریں جو پیداوار ہوگی اس کا آدھا حصہ ان کو دیا جائے گا۔" (بخاری شریف باب الزراعۃ مع الیہود)

معلوم ہوا کہ اسلام غیر آباد اور بنجر زمینوں کو آباد و کارآمد بنانے پر آمادہ کرتا ہے جو شوق وترغیب کے انداز میں ہوتا ہے۔ آپ ﷺ یہ پسند فرماتے تھے کہ مسلمانوں کو زمین کی آباد کاری میں شوق ورغبت بلکہ مقابلہ ومسابقت کے ساتھ حصہ لیتے دیکھیں لہٰذا وقتاً فوقتاً اس پر آمادہ فرماتے رہتے تھے۔

امام مسلم نے عبد بن حمید سے اور انھوں نے مسلم بن ابراہیم کے حوالہ سے روایت کیا کہ حضور ﷺ نے ایک انصاری خاتون ام مبشر کے یہاں کھجور کا ایک پودا دیکھا تو سوال کیا کہ یہ پودا کس نے لگایا ہے۔ کسی مسلمان نے یا غیر مسلم نے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ مسلمان نے لگایا ہے۔

یہ حدیث اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ نبی کریم ﷺ امت کی ہر پہلو سے تربیت فرماتے تھے۔ ایمان ویقین کی تربیت بھی، جہاد وجانفشانی کی تربیت بھی، کھیتی باڑی اور معاش کی تربیت بھی کہ معیار معیشت درست رہے تاکہ بندۂ مومن کسی دوسرے پر بار نہ بنے، حدیث سے

کاشت و باغبانی اور زمین کو کارآمد بنانے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے، حدیث سے جائداد بنانے اور اس کی دیکھ ریکھ کا ثبوت ملتا ہے (فتح الباری ۵/ص۴)

اس حدیث کی خوبی یہ ہے کہ اس میں حضور ﷺ نے کھجور لگانے کو اولیت دی ہے۔ اس لیے کہ وہ اہم اقتصادی وطبی فوائد اور نقد آمدنی کا زبردست ذریعہ ہے، جسم کو توانائی بخشتا ہے، مومن کے قویٰ کو بڑھاتا ہے اور جہاد کی مشقتوں کو برداشت کرنے کے قابل بناتا ہے، ابھی تک کوئی ایسی غذائی چیز نہیں دریافت ہوسکی جو کھجور کی مختلف قسموں سے حاصل ہونے والی توانائی کی کچھ بھی برابری کر سکے، خصوصاً وہ کھجور جو مدینہ منورہ میں لگائے جاتے تھے، اسی لئے اسلام آمدنی کو بڑھانے، معاش کے لئے کام کرنے اور باغبانی وغیرہ کا شوق دلاتا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

> جو بندۂ مومن بھی کھجور لگائے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کھجور سے جتنا بھی پھل نکلے گا سب کا اجر لکھ دے گا (مسند الامام احمد بن حنبل ج۵/ص۱۴۵)

آپ ﷺ نے پودا لگانے اور کھیتی کرنے پر ابھارنے کے مختلف طریقے اختیار فرمائے ہیں فرمایا: اس درخت یا کھیتی سے پرندے، انسان، حتی کہ جانور جو بھی کھائے گا اور فائدہ اٹھائے گا سب کا سب صدقے میں شمار ہوگا اور قیامت کے دن بندہ اپنے اعمال حسنہ کے ترازو میں اس کو موجود پائے گا (آپ نے یہ اسلوب اس لئے بھی اپنایا) تاکہ بندۂ مومن جود وسخا اور مختلف انداز سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے میں دریا دل ہوجائے، جب بندۂ مومن چڑیوں کو کھلا کر اجر کا مستحق ہوگا، جانوروں کو کھلانے میں اس کو نیکی ملی گی تو اپنے پریشان حال پڑوسی اور اعزہ واقربا کو کھلانے پلانے اور ان کی مدد کرنے میں اس کے اجر وثواب کا کیا درجہ ہوگا؟

کاشت اور باغبانی، اقتصادیات کی شہ رگ

اس حدیث سے کہ جو مسلمان بھی پودا لگاتا ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے (الخ) یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات اور زمین کو بے مقصد و بے ضرورت نہیں بنایا ہے، ان کے بنانے کا سب سے اولین منشا یہ ہے کہ وہ انسانی سرگرمیوں اور کدوکاوش کا میدان بنیں اور ان کے ذریعہ انسانی قوت وصلاحیت کو بروئے کار لائے اور اس کو اپنے فائدے اور حصول منفعت کے لئے استعمال کرے، تاکہ اس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بجالائے اور انسانی

معاشرے میں اس کی شریعت کو جاری ونافذ کرنے کے لیے جواب دہ ہو، اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھے، حتیٰ کہ دنیا کے فنا اور قیامت کے آثار ظاہر ہونے لگیں تب بھی اپنا کام نہ چھوڑے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''اگر قیامت آجائے اور تم میں سے کوئی شخص پودا لگانے جارہا ہو، ہاتھ میں پودا ہو تو اس کو لگا دے یہ نہ سوچے کہ اب تو دنیا فنا ہو رہی ہے، اب اس کا کیا حاصل، اس لئے کہ مومن سے عمل مطلوب ہے نتیجہ نہیں''۔

یہ حدیث اسلام میں عبادت کا ہمہ گیر مفہوم پیش کرتی ہے۔ اسلام میں کھیتی باڑی کرنا، کائنات کی چیزوں کو کارآمد بنانا اور فائدہ پہنچانا یہ سب عبادت میں شامل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُو االلّٰه كَثِيْراً لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (الجمعہ:۱۰)

''پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور خدا کا فضل تلاش کرو، اور خدا کو بہت بہت یاد کرتے رہو، تاکہ نجات پاؤ۔''

اس حدیث میں حضور ﷺ نے سب سے پہلے جس چیز کا ذکر فرمایا ہے، وہ یہ کہ جو مسلمان بھی کوئی پودا لگاتا ہے کھیتی باڑی کرتا ہے پھر اس میں سے پرندے، انسان یا کوئی بھی جاندار جو کچھ کھاتا ہے، وہ سب اس بندۂ مؤمن کے حق میں صدقے کا حکم رکھتا ہے۔ پودا لگانے کا لفظ ایسا ہے کہ ہر قسم کے پودوں پر مشتمل ہے، خواہ وہ نباتات کی شکل میں ہو یا درختوں کی شکل میں۔ البتہ کھجور کے پودے کو اولیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ حدیث میں ذکر اولاً اسی کا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اول کھجور کے پانچ سو پودے لگائے ہیں اور ان پودوں کے لگانے میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے آپ کی مدد کی ہے۔ اس قسم کی تمام احادیث میں ''غرس'' کا لفظ کھجور ہی کے پودے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور اُس وقت کھجور کے پودوں کا لگانا اسلامی اقتصادیات کی سب سے نمایاں صورت تھی اور مدینہ میں جو پودے لگائے جاتے تھے، ان میں سب سے اہم کھجور تھا اور اہل مدینہ میں ہی سب سے زیادہ پایا جاتا تھا، یہی ان کا ذریعہ معاش اور وسیلۂ حیات تھا۔ اس کی اہمیت آپ ﷺ کے عہد میں اتنی تھی کہ غلام کو یہ حق تھا کہ آقا سے اس پر مکاتب کا معاملہ کرے، وہ کھجور کے کچھ درخت تیار کر دے، اس طرح کہ ان کے لگانے کے لیے گڈھے کھودے، اہل مدینہ کھجور کی ٹہنیوں اور اس کے تنے سے اپنے گھروں کی چھتیں اور

ان کے ستون بنایا کرتے تھے، جب کہ وہ اس کی چھال سے بھی فائدہ اٹھاتے تھے اوراس کے پتوں سے ٹوکرے اور چٹائیاں بناتے تھے۔اسی طرح کے اور بہت سے فوائد حاصل کرتے تھے اور کھجور کا پھل اہل مدینہ کے لئے سب سے اہم پھل ہوتا تھا جب کھجور کا پہلا پھل تیار ہوتا تو صحابہ کرام اس کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ ﷺ اس کو اپنے دست مبارک میں لے کر دعا فرماتے’’۔اللّٰھم بارك لنا فی ثمرنا‘‘۔ اے اللہ تو ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما۔ (مجتمع المدینہ ص:۲۰۶)

پودے لگانے اور کھیتی باڑی کی یہ تدابیر بہترین نبوی مشورے ہیں، جو کاشت، سبزی اور ہریالی کے فوائد کا راستہ دکھاتے ہیں، علم النباتات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ زمین کو نباتات اور پودوں سے آباد رکھنے کے بہت سے فوائد ہیں۔ مثلاً:

نمبرا : سبزہ زمین پر تسلسل کے ساتھ سورج کی کرنوں کو پڑنے سے روکتا ہے اور درجہ حرارت کو کم کرتا ہے، اس کی تیز حرکت درجۂ حرارت کو کم کرتی ہے اور شب وروز کے حصوں میں گرمی کی شدت کو کم کردیتی ہے۔

نمبر۲ : بھاپ کی شکل میں یہ سبزے اور درخت مٹی سے رطوبت کو ہوا کی طرف منتقل کرتے ہیں۔

یہ فوائد کھجور اور دیگر پودوں میں بھی پائے جاتے ہیں اور یہ مشاہدہ ہے کہ کھجور تنہا وہ پودا ہے، جو اپنے گرد کے ماحول وفضا کو نقصان نہیں پہنچاتا، بلکہ اس کے برعکس وہ زمین پر اپنی بے شمار جڑوں کو مٹی کے اندر داخل کر کے مٹی کو بہنے سے روکتا ہے اور اس کے نمو کی صلاحیت کو قائم رکھتا ہے۔ الغرض کھجور تنہا وہ پودا ہے کہ اس کے پہلو بہ پہلو دوسری چیزیں از قسم سبزی وغلہ بودی جائیں تو کھجور سے ان کو نقصان نہیں پہنچتا۔ نہ کھجور کا اس پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ بلکہ فضائی آلودگی کے اثرات اور گرمی، پالا اور ہواؤں سے بچاتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں فوائد کی طرف حدیث مذکور میں اشارہ فرمایا ہے۔

زراعت کو ترقی دینے اور ماحول کو درست کرنے میں اس حدیث کا اثر

آپ ﷺ کے ارشاد ’’جو مسلمان بھی کوئی پودا لگاتا یا کاشت کرتا ہے، اس میں سے کچھ بھی کھایا جاتا ہے، وہ اس شخص کے حق میں صدقہ ہوتا ہے الخ۔‘‘ نے لوگوں کے اندر کاشت

کرنے اوراس کی دیکھ بھال رکھنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ اس وقت کا یہ عام عرف ہوگیا تھا کہ جس نے کسی غیر آباد زمین کو آباد کیا، بے کار کو کارآمد بنایا۔ وہ زمین اسی کی ملکیت ہوگئی، حضرت عمرؓ نے فرمایا ''جس نے کسی ناکارہ زمین کو کارآمد بنایا، وہ زمین اسی کی ہوگئی''۔

حضرت عروہؓ ام المومنین حضرت عائشہ کے حوالے سے روایت فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے کسی ایسی زمین کو آباد کیا، جو کسی اور کی ملکیت میں نہیں تھی تو آباد کرنے والا شخص اس زمین کا زیادہ حق دار ہے، مزید برآں وادی عقیق اور بالائی خطہ کی زمین کا بڑا حصہ آپ ﷺ نے مہاجرین کو دے دیا، کاشت کے سلسلہ میں اس کا اثر یہ ہوا کہ مدینہ منورہ کے باہر کا حصہ باغات سے بھر گیا، مدینہ منورہ کے اطراف میں باغ ہی باغ نظر آنے لگے۔ عہد نبوی میں کاشت کے نظام کو کامیاب بنانے میں سینچائی کے نظام کو بڑا دخل تھا۔

بنجر علاقہ اور مشرق حرہ کے قابل کاشت بڑے حصہ کے مالک مہاجرین ہوگئے، بعد میں تو مہاجرین، خاص طور سے گیہوں کی کاشت کرنے لگے، اسی کے ساتھ مدینہ منورہ میں بعض میوے پیدا کئے جانے لگے۔ میووں کے بعض باغات تو ایسے تھے جو سال میں دومرتبہ پھل دیتے تھے۔ وہاں کا سب سے مشہور میوہ انگور تھا۔ انگور کی مختلف قسمیں ہوتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کا وادی عقیق میں ایک ایسا شاندار انگور کا باغ تھا، جس کے پھل ایک ہزار دینار میں بکا کرتے تھے۔ کاشت کاری کا پیشہ اپنانے اور اس کو وسیع پیمانے پر ترقی دینے میں یہ بات بہت معاون بنی کہ آپ ﷺ نے بہت بڑی تعداد میں اپنے دست مبارک سے پودے لگائے، جس نے مہاجرین میں کاشت و باغبانی کا شوق پیدا کردیا، اوران میں قابل کاشت زمینوں سے فائدہ اٹھانے اور اس کو کارآمد بنانے کی لگن پیدا ہوگئی ان کے بیشتر کھیت اور کھجوروں کے درخت اسی ٹہنیوں، تنوں اور پتوں کی چہاردیواری سے گھرے ہوئے تھے۔ قرآن مجید درختوں سے گھرے ہوئے ان باغوں کو روئے زمین پر اللہ کی ایک نعمت (جنت) سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعاً (الکہف:۳۲)

''اور ان سے دو شخصوں کا حال بیان کر جن میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ (عنایت) کیے تھے اور ان کے ارد گرد کھجوروں کے درخت لگا دیئے تھے اور ان کے درمیان کھیتی پیدا کر دی تھی۔''

ایسی بہت سی دوسری روایات ہیں، جن میں اہل مدینہ کے کھجوروں کے باغات لگانے اور اس سلسلے میں ان کے اہتمام کا تذکرہ ہے اور رطب (تازہ کھجور) اور کھجور کو غذا کے طور پر استعمال کرنے اور اس کے ذریعے مہمان نوازی اور اکرام ضیف کو بتاتی ہیں۔ یہاں ایسی چند حدیثوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

عبداللہ بن بریدہ کا بیان ہے۔ فرمایا: میں نے اپنے والد کو کہتے ہوئے سنا کہ سلمانؓ جب مدینہ پہنچے تو حضور ﷺ کی خدمت میں خوان میں تازہ کھجور لے کر حاضر ہوئے، اور آپ کے سامنے رکھ دیا، آپ نے سوال کیا سلمان یہ کیا ہے؟ سلمانؓ نے جواب دیا آپ اور آپ کے اصحاب کے لئے صدقہ ہے۔ آپ نے فرمایا اس کو اٹھا لو ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے۔ یہ سن کر سلمانؓ نے وہ خوان اٹھا لیا دوسرے دن پھر سلمان کھجوروں سے سجا ہوا خوان لے کر حاضر ہوئے، آپ ﷺ کے سامنے رکھ دیا۔ پھر آپ نے سوال کیا سلمان یہ کیا ہے؟ سلمانؓ نے جواب دیا آپ کی خدمت میں ہدیہ ہے۔ ہدیہ سن کر آپؐ نے صحابہ کرام کو کھانے کی اجازت دے دی اور فرمایا ہاتھ بڑھاؤ اور کھاؤ، پھر حضرت سلمانؓ نے آپؐ کی پشتِ مبارک پر نظر ڈالی اور فوراً ایمان لائے۔

حضرت سلمانؓ یہودیوں کے غلام تھے، آپ ﷺ نے بہت سے درہم دے کر سلمانؓ کو اس معاوضے پر خرید لیا کہ حضور کھجور کا باغ لگائیں، سلمان اس میں کام کریں تا آنکہ وہ کھجور پھل دینے لگیں۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے کھجور کا باغ لگایا، سوائے ایک کھجور کے کہ اس کو حضرت عمرؓ نے لگایا، یہ باغ اسی سال پھل دینے لگا تھا۔ یہ حضور ﷺ کی کاشت کو بڑھانے اور پروان چڑھانے کا ایک نمونہ ہے۔ آپ خود کام کرتے ہیں تا کہ دوسروں کے لئے مثال اور نمونہ بنے۔ پھر حضرت سلمانؓ کے حوالے فرما دیتے ہیں کہ وہ اس میں کام کریں۔ کھائیں اور کھلائیں، ہدایا پیش کریں اور ایک کارکن مومن بنیں اور آمدنی کے اضافہ میں حصہ لیں۔

مزید برآں آپ ﷺ نے کاشت کاری و باغبانی پر آمادہ کرتے ہوئے یہاں تک

فرمادیا کہ قیامت آرہی ہوتو بھی اپنے ہاتھ سے پودا لگادو، انجام کی فکر نہ کرو، فرمایا: ''اگر تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کوئی پودا ہوتو اسے لگا ہی دے''۔ اس لئے کہ کھیتی اور باغبانی کے فوائد اتنے ہیں کہ گنائے نہیں جاسکتے، خصوصاً گردو پیش کی فضا اور ماحول کو صاف کرنے میں یہ دونوں کام اہم رول ادا کرتے ہیں۔

حیاتیات کے ماہرین پودوں اور حیوانات کے مختلف امتیازات میں فرق کرتے ہیں، جن میں سب سے اہم ہریالی ہے، جو حیوانات میں نہیں پائی جاتی۔ اس مادہ کو سائنس داں خصوصی طور پر بڑی اہمیت دیتے ہیں ان کی تحقیق یہ ہے کہ اگر یہ نہ ہوتو زندگی نہ پائی جائے اور کوئی شئ زمین پر زیادہ دنوں باقی نہ رہے۔ جس کا کام یہ ہے کہ سورج کی روشنی اور کرنوں کو جذب کرکے اعضاءاور غذا کی شکل میں تبدیل کردیتا ہے شیرینی ونشاستہ جو روئے زمین پر غذا ہے، فراہم کرتی ہے۔ اور بڑی مقدار میں بھی اس سے حاصل ہوتی ہے، ان چیزوں کا انسان کتنا محتاج ہے۔ یہ سب ہریالی کے فوائد ہیں۔

ماحول کو صاف و پاکیزہ رکھنے میں درختوں کی اہمیت

مذکورہ احادیث بتاتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہر قسم کے درختوں کو لگانے کا اہتمام فرمایا ہے تاکہ زمین اچھی اور کارآمد ہوجائے، اور دیگر پودوں کو پروان چڑھانے کی اس میں صلاحیت پیدا ہوجائے، اس لیے کہ کائنات کو آباد کرنا ان سارے ہی کاموں پر مشتمل ہے اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کی ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے۔ اس لیے کہ یہ حیوانات اور نباتات دونوں ہی کے لئے راہ ہموار کرتا ہے اور شجر کاری میں کچھ زیادہ خرچہ بھی نہیں ہوتا اس لئے کہ پودے اپنی غذا بڑی حد تک خود ہی حاصل کرلیتے ہیں، وہ اپنی غذا ہوا سے کاربن ڈائی آکسائڈ حاصل کرتے ہیں اور مٹی سے پانی اور نمکیات حاصل کرتے ہیں، ان وجوہات کی بنا پر پودے اپنی غذا آپ فراہم کرتے ہیں۔ پودوں کو کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن و ہائیڈروجن، نائٹروجن کے علاوہ اور بھی چیزیں درکار ہوتی ہیں چنانچہ ان کو مذکورہ چیزوں کے ساتھ تانبہ، گلٹ اور میگنٹ کی بھی کسی حد تک ضرورت ہوتی ہے، یہ چیزیں پودوں کی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔

مٹی سے پانی اور قدرتی نمک حاصل کرنے کا کام خصوصاً تھالے بنا کر جڑوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ پودے غذا کا فاضل مادہ اور اس کے دوسرے اجزا جمع کر لیتے ہیں مثلاً اس کی جڑیں، تنے، شاخیں، پتے، بیج اور پھل۔

پودے ہی غذا بناتے ہیں اور اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر پودے نہ ہوں تو روئے زمین پر زندگی نہ پائی جائے لہٰذا شجرکاری کا کام اور پودوں کی نگرانی اور دیکھ بھال زمین اور دنیا کی آبادکاری کی چیزوں میں سے ایک اہم چیز ہے (علم الاحیاء: ص ۶۷)

درختوں اور پودوں کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ فضا کے اندر کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن کے تناسب کو برقرار رکھتے ہیں۔ تمام پودے شمسی کرنوں کے عمل کے دوران کاربن ڈائی آکسائڈ لیتے اور آکسیجن نکالتے ہیں۔ اس طرح وہ جاندار چیزوں کی سانس سے پیدا ہونے والی کاربن ڈائی آکسائڈ کے تناسب کو جو فضا میں موجود ہوتے ہیں معتدل رکھتے ہیں کہ اس سے نقصان نہ پہنچے۔ اس تفصیل سے آپ ﷺ کے ارشاد ''جو مسلمان بھی کوئی پودا لگاتا ہے یا کاشت کرتا ہے پھر اس میں سے پرندے یا انسان یا کوئی بھی جاندار کھاتا ہے تو وہ اس مسلمان کے حق میں صدقہ ثواب رکھتا ہے''۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ آپ کے فرمودات کس اہمیت کے حامل اور کتنے عظیم فوائد پر مشتمل ہیں۔

ان احادیث میں حضور ﷺ اولیت کھجور لگانے کو دیتے ہیں، اس لئے کہ پانی سے خالی صحرا کے اندر جو عام طور سے شادابی سے خالی ہوتا ہے، اس میں پائے جانے والے درختوں میں سب سے اچھا اور مفید درخت کھجور ہی کا ہے اور یہ پانی کی کمی اور پیاس کو زیادہ عرصے تک برداشت کر لیتا ہے۔

کھجور ہوائی لہروں، ریت اڑانے والی آندھیوں اور گرم ہواؤں سے بچنے کی غرض سے بھی لگائے جاتے ہیں۔ وہ کھیتوں اور باغوں کی حفاظت کے مقصد سے بھی لگائے جاتے ہیں۔ کھجور روئے زمین پر بندوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کی بہترین نعمتوں میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ

وَالْحَبُّ ذُوالْعَصْفِ وَالرَّيْحَانِ فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ
(الرحمٰن:۱۰-۱۳)

''اوراس نے خلقت کے لئے زمین بچھائی،اس میں میوے اور کھجور کے درخت ہیں جن کے خوشوں پر غلاف ہوتے ہیں۔اوراناج جس کے ساتھ بھس ہوتا ہے اورخوشبو دار پھل تو (اے گروہ جن وانس) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟''

دوسری جگہ فرمایا :

وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيدٌ رِّزْقاً لِّلْعِبَادِ وَأَحْيَيْنَابِهٖ بَلْدَةً مَّيْتاً كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ. (ق:۱۰،۱۱)

''اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھاتہ بہ تہ ہوتا ہے (اورسب کچھ) بندوں کوروزی دینے کے لئے (کیاہے) اوراس (پانی) سے ہم نے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کوزندہ کیا۔''

لٰہذا معلوم ہوا کہ کھجور کا باغ لگانا غذا اور کھانے کے لئے بہت اہم ہے اور ایسے ہی ماحول کو بگاڑنے اور پراگندہ کرنے والی چیزوں سے بچانے کے لئے بھی اس کا ہونا ضروری ہے۔اس کی خوبی اوراہمیت وضرورت کوثابت کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پرا۔پنے انعامات اورنعمتوں کوگناتے ہوئے کھجور کا بھی ذکرفرمایاہے۔فرمایا :

فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ.
(الرحمٰن:۶۸،۶۹)

''ان میں میوے، کھجوریں اور انار ہیں۔تو تم اپنے پروردگار کی کس کس کی نعمت کوجھٹلاؤ گے۔''

ان سب کے علاوہ نباتات باغات، پھول پتوں اور جڑی بوٹیوں کی ایک دنیا ہے، جو قسم قسم کے فوائد، حسن وجمال، غذااوردوااوردوسرے بےشمار فوائد کی حامل ہے۔
پاک ہے خدائے بزرگ وبرتر کی ذات جس نے اپنی قدرت سے دانے کو پھاڑا

اوراس میں سے پودے کو نکالا گٹھلیوں کو پھاڑ کر اس میں سے بڑے بڑے درخت نکالے۔ اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا کہ خود سے درخت لگائیں، پودوں کی دیکھ بھال فرمائیں تاکہ بندۂ مومن کا اس دائمی دین پر یقین واعتماد بڑھے کہ وہ عبادت وزراعت اور جہاد سبھی پر حاوی ہے۔ دین ودنیا دونوں کا جامع ہے۔ معاشرے اور اقتصادی ترقی کی بھی فکر کرتا ہے، ماحول ومعاشرہ کی درستگی کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے اور حیوانات ونباتات کا علم حاصل کرنے کی بھی دعوت دیتا ہے۔

کھجور کی غذائی حیثیت

کھجور کے باغات لگانا اسلامی اقتصادیات کا نمایاں مظہر تھا۔ آپ ﷺ کی ترغیب، تشویق اور ہمت افزائی کا صحابہ کرام کی زراعت وباغ بانی سے دلچسپی میں بڑا دخل تھا۔

مسند میں ابوسفیان جابر سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے کوئی درخت لگایا تو اس درخت سے جو بھی انسان پرندہ، درندہ یا جانور کھائے گا وہ اس درخت لگانے والے کے لئے صدقہ میں شمار ہوگا'' (مسند احمد بن حنبل: ج ۳ص۳۹۱)

صحابہ کرام اس حدیث پاک کے دوررس اثرات وفضیلت کو اچھی طرح سمجھ گئے کھیتی اور باغبانی کی قیمت وحقیقت ان پر عیاں ہوگئی، کھجور کی غذائی حیثیت کے علاوہ اس کے باغات سے دل کو فرحت وانبساط، آنکھوں کو لطف وسرور اور زمین کو حسن جمال حاصل ہوتا ہے، کوئی بھی پہاڑی میدانی یا وادی کا علاقہ ایسا نہیں ہے، جو نگاہوں میں اتنا پرکشش ہو جتنا کھجوروں کی شادابی کا منظر کہ انسان اس کے سایہ سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس کے گچھوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتا ہے، اس کے تازہ کھجوروں کی لذت سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ کھجور مسافر وسیاح کا زادراہ ہے۔ اسی وجہ سے کھجور مدینہ منورہ میں اہم ترین درختوں میں شمار ہوتا ہے۔ اہل مدینہ کا مال اکثر وبیشتر کھجور ہی ہوتا ہے اس سے ان کی روزی چلتی اور ضروریات زندگی پوری ہوتی ہیں۔

عہد نبویؐ میں کھجور کی اہمیت اس درجہ تھی کہ غلام اپنے آقا سے اس شرط پر مکاتبت کرتا تھا کہ اس کے لئے کھجور کے کچھ تھالے بنا کر کھجور کے پودے تیار کردے گا۔ وہ حضرات کھجور کی

ٹہنیوں اور تنوں سے مکانات کی چھتیں بنانے تھے۔ ستون بھی اسی کے تنے کے ہوتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس کی چھال اور پتوں سے ڈلیاں چٹائیاں، کھجور ناپنے کے پیمانے جیسی دوسری چیزیں بھی بناتے ہیں جو سب کی سب کارآمد ومفید ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں۔ ہم لوگ خدمت نبویؐ میں بیٹھے ہوئے تھے اسی اثناء میں کھجور کا گوندلایا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا یہ ایسے اچھے درخت سے نکلا ہے جس کی برکت وافادیت بندۂ مومن جیسی ہے، میرے ذہن میں آیا کہ آپ کی مراد کھجور سے ہے (فتح الباری: ج ۹) جی میں آیا میں عرض کروں کہ اللہ کے رسول آپ کی مراد کھجور سے ہے، لیکن چونکہ میں کمسن تھا اس لئے بڑوں کے ہوتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کرنے کی ہمت نہ کرسکا، خاموش رہا، پھر جب کوئی نہیں بولا تو حضور ﷺ نے فرمایا: وہ خاص درخت کھجور ہے۔

اس حدیث سے کھجور کی قیمت، اس کی اہمیت امتیاز خصوصی اور بہت سارے فوائد کا اندازہ ہوتا ہے۔ خواہ وہ غذا کی حیثیت سے ہوں یا چھال پتوں اور تنے کے قابل انتفاع ہونے کے اعتبار سے۔ غرض یہ کہ افادیت کے اعتبار سے آپ ﷺ نے اس کی تشبیہ بندۂ مومن سے دی ہے کہ اس کی ہر بات خیر ہی خیر ہوتی ہے، کھجور بھی ایسا ہے اس لئے اہل مدینہ کے نزدیک کھجور سب سے اہم اور قابل ترجیح پھل تھا۔ چنانچہ جب پہلا پھل لگتا تو صحابہؓ اس کو لے کر خود بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوتے آپ ﷺ اس کو جب اپنے دست مبارک میں لیتے تو فرماتے (اللھم بارك لنا فی ثمرنا) اے اللہ تو ہمارے کھجور میں برکت دے (مجمع المدینہ: ص ۲۰۶)

صحرا میں زندگی گزارنے والے مجاہدین کی سب سے پہلی خوبی وصفت قوت وطاقت تھی اور ان کی دوسری صفات قوت برداشت، صبر، امراض کی قوت مقاومت، یہ صفات ان کو کیسے حاصل ہوئیں؟

یقینی بات ہے کہ قوت ان کو اس غذا (کھجور) سے حاصل ہوئی، جو ان کی اہم اور عمومی غذا ہے۔ حتیٰ کہ علمی تحقیق نے کھجور کو کان سے تعبیر کیا جو قدرتی توانائیوں سے بھرپور ہوتا ہے۔ یہ اس کے ان دوسرے فوائد کے علاوہ ہے، جو اس کی دوسری مستقل غذائیں بنا کر حاصل ہوتے ہیں، جس کی طرف حضور ﷺ نے ایک سے زیادہ حدیثوں میں اشارہ فرمایا ہے حضرت عائشہؓ

سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس گھر میں کھجور موجود ہو وہ فاقہ زدہ نہیں کہلا سکتا۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: عائشہ! جس گھر میں کھجور نہ ہو اس گھر والے فاقہ زدہ ہیں۔ دوبارہ آپ نے فرمایا: عائشہ! جس گھر میں کھجور نہ ہو وہ فاقہ زدہ ہے۔ راوی کو شک ہوا کہ آپ نے جیاع کا لفظ استعمال کیا ہے یا جاع کا، معنی دونوں کے ملتے جلتے ہیں۔ یہ الفاظ آپ نے دو یا تین بار فرمائے۔ (شرح صحیح مسلم)

سیرت نبویؐ اور صحابہ کرام کے واقعات زندگی ان کے جہاد، غزوات اور سرایا میں غذا کے اعتبار سے کھجور نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے، غذائی وسائل میں اسی کو اولیت حاصل رہی ہے جس سے حضور ﷺ کے ارشاد کا اعجاز ثابت ہوتا ہے۔

اطباء کی کتابیں اور غذائی اشیاء پر ریسرچ کرنے والی تجربہ گاہیں، ہمیں ان کھجوروں کی قیمت بتاتی ہیں اور اس کلام نبویؐ کے اعجاز پر دلالت کرتی ہیں کہ جس گھر میں کھجور نہیں گویا اس گھر میں کھانا نہیں''

کھجور مخصوص صحرائی میوہ اور غذائی وٹامن سے بھرپور ہے۔ ایک کلوگرام کھجور تین ہزار (کلوری) حرارت رکھتا ہے، یہ وہ حرارتی طاقت ہے، جس کی ایک دن میں متوسط صحت والے آدمی کو ضرورت ہوتی ہے، وہ ایک کلوگرام کھجور سے حاصل ہو جاتی ہے دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ ایک کلوگرام کھجور وہ حرارت عطا کرتی ہے جو گوشت سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک کلو گرام مچھلی میں جتنی حرارت ہوتی ہے اس سے تین گنی حرارت ایک کلو کچے کھجور میں ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کے ارشاد ''اس گھر کے لوگ فاقہ سے نہیں رہ سکتے جن کے پاس کھجور ہو'' کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کھجور میں وٹامن A ہوتا ہے جس کا تناسب وٹامن A میں پائی جانے والی غذاؤں کے اعتبار سے بہت زیادہ ہوتا ہے، اس میں اتنا وٹامن پایا جاتا ہے، جتنا مچھلی کے تیل اور مکھن میں، چونکہ وٹامن A کو جسم کے بڑھانے اور نمو عطا کرنے والا وٹامن کہا جاتا ہے، لہٰذا وہ بچوں اور نوجوانوں کے جسم کو پروان چڑھانے، نمو، ترقی اور کمال کو پہنچانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے، اسے کھا کر نوجوان چست و مضبوط رہتا ہے۔ کھجور کی اسی غذائی طاقت کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے طبیب امت اور نبی ہدایت ﷺ نے فرمایا ''اے عائشہ! جس گھر میں کھجور نہیں اس گھر والے بھوکے ہیں، آپ نے دو یا تین مرتبہ یہ فرمایا'' گویا آپ ﷺ ڈاکٹروں،

دواسازوں اور غذائی اشیاء تیار کرنے والے کارخانوں کے لوگوں کو کھجور کی اس توانائی کی طرف رہنمائی فرمارہے ہیں اور اس کی دویا تین بار تاکید فرماتے ہیں، موجودہ عہد کے طب جدید کی تحقیق ہے کہ کھجور میں ''فاسفورس'' بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے اور وہ خوبانی، ناشپاتی، اسٹرابیری سے بھی زیادہ وٹامن رکھتا ہے، حتیٰ کہ انگور سے بھی زیادہ، چنانچہ ایک سو گرام کھجور میں ہمیں چالیس ملی گرام ''فاسفورس'' ملتا ہے، جبکہ دوسرے میووں میں بیس ملی گرام سے زیادہ نہیں ہوتی، کھجور کئی قسم کے سکا کر جیسے انگور کا گلوکوز ''لیکولو'' یعنی میوہ جات سے بننے والا گلوکوز ''سکاروز'' گنے سے بنا ہوا گلوکوز کھجور کے اندر گلوکوز کا تناسب تقریباً ستر فیصد معلوم ہوتا ہے جسمانی توانائی حاصل کرنے میں کھجور کو اولیت حاصل ہے، کھجور کے اندر پایا جانے والا ''سکاکر'' پینے میں خوشگوار ہوتا ہے، اور آسانی سے تحلیل ہوکر فوراً خون بن جاتا ہے اور اعضاء کو قوت بخشتا ہے، رگوں میں پہنچتا اور ان کو قوت وگرمی عطا کرتا ہے اس لئے کہ اس کو پینے کے بعد ہضم کرنے کے عمل کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی، اور نہ پیچیدہ کیمیاوی اور حیاتیاتی عمل کی چنداں ضرورت ہوتی ہے۔

معدہ ایک گھنٹے کے اندر اندر کھجور کو ہضم اور اس کے اندر موجود ''سکاکر'' کو جذب کر لیتا ہے اور وہ خون میں شامل ہوکر تیزی کے ساتھ دماغ اور جوڑوں کو طاقت پہنچاتا ہے، اسی لئے طبیب ایسے روزہ داروں کو جن کو خاصی کمزوری، چکر اور نگاہوں میں دھندلا پن کی شکایت محسوس ہوتی ہے ''سکاکر'' کے استعمال ہی کا مشورہ دیتے ہیں کہ اس کے استعمال سے چکر، سستی آدھے گھنٹے کے اندر ختم ہو جاتی ہے، افطار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سنت ہے، آپ افطار میں چند کھجوروں اور پانی پر اکتفا فرماتے تھے، (الاسودان) یعنی پانی اور کھجور۔ طب جدید کے مطابق افطار میں کھجور کے استعمال سے ''سکاکر'' کا فائدہ صرف گرمی، طاقت اور چستی پیدا کرنے ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ کھجور پیشاب میں سہولت پیدا کرتا ہے، گردوں اور جگر کو دھوتا اور صاف کرتا ہے۔

کھجور کے اندر امراض سے شفا کی تاثیر

کھجور میں مذکورہ تمام خصوصیات وصفات کے ساتھ صحت انسانی کے نمو وبقا کی بھی زبردست قوت وتاثیر موجود ہے جس سے کم لوگ واقف ہیں، کھجور الجھن کے شکار، پریشان خاطر شخص کے اندر سکون وقرار کی کیفیت پیدا کرتا ہے، جدید میڈیکل تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ کھجور

مزاج کے اندر چڑ چڑے پن کو دور کر کے گلے کی ان رگوں میں اطمینان وسکون کو برقرار رکھتا ہے، جوغصہ و جھنجھلاہٹ کے وقت پھول آتی ہیں۔ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ بعض نباتات اور پھلوں کی یہ تاثیر ہے کہ وہ جھنجھلاہٹ کو دور کرتے ہیں اور اس مادہ کی پیدائش کو روک دیتے ہیں، ان سبزیوں میں گاجر اور پالک بھی شامل ہیں، لیکن سرفہرست کھجور ہے، جدید طبی تحقیقات جو قوت بخش غذائی وٹامن تیار کرتی ہیں۔ ان میں وٹامن ''A'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے، جو جھنجھلاہٹ کو دور کرنے کی بڑی تاثیر رکھتا ہے اور کھجور میں وٹامن ''A'' بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اور قرآن کریم نے حضرت مریم علیہا السلام کو حالت ولادت ونفاس میں کھجور کو غذا اور علاج دونوں بتایا ہے۔ فرمایا:

وَهُزِّىٓ إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَباً جَنِيّاً فَكُلِى وَاشْرَبِى وَقَرِّى عَيْناً (مریم:۲۶-۲۵)

''اور کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلاؤ تم پر تازہ تازہ کھجوریں جھڑ پڑیں گی تو کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو۔''

اسی لئے حضرت عمرو بن میمون نے کہا کہ نفاس والی عورتوں کے لئے خشک اور تازہ کھجور سے بہتر کوئی چیز نہیں کہ یہ دونوں نفاس والی عورتوں کے لئے بہترین کھانا ہیں، ان طبی خصوصیات کی تاکید آپ ﷺ کے ارشاد سے مزید ہو جاتی ہے جس کو عامر بن سعد نے اپنے والد کے حوالہ سے بیان فرمایا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے ہر روز صبح کو عجوہ کھجور کھالیا اس دن اس کو رات تک زہر اور جادو سے نقصان نہیں پہنچ سکتا''۔ دوسروں نے سات کھجوریں بتائی ہیں۔ ابوضمرہ نے خاص جگہ کی کھجوروں کے بارے میں یہ بات کہی ہے۔ اور یہ الفاظ کہے ہیں کہ ''جس نے صبح کو عالیہ کے عجوہ کھجوروں میں سے سات کھجور کھالئے'' عالیہ ان بستیوں کو کہتے ہیں جو مدینہ منورہ کی بالائی سمت میں ہیں۔

امام نسائی نے حضرت جابر کی روایت ''عجوہ جنت کا پھل ہے، یہ زہر سے شفا دیتا ہے'' کو مرفوعاً بیان کیا ہے، بوملیکہ کی ایک روایت میں ہے'' صبح کو پہلے شفاء ہے یا تریاق ہے''۔ تریاق ایک مرکب اور مشہور دوا ہے عجوہ کو تریاق کے لفظ سے تعبیر کرنا بطور تشبیہ کے اور دن کے رات تک قید لگانے کا مطلب یہ ہے کہ صبح کے وقت کھانے کا وہ اثر جو جادو کے اثر کو دور کرتا ہے رات تک رہتا ہے اس کے بعد ختم ہو جاتا ہے (کتاب الطب باب الدواء بالعجوۃ)

خطابی کا کہنا ہے کہ عجوہ کھجور کا جادو اور زہر کے لئے شفاء ثابت ہونا حضور ﷺ کی برکت سے مدینہ منورہ کی کھجوروں کے لئے ہے، نہ کہ نفس کھجور کی یہ تاثیر ہے۔ ابن قیمؒ نے فرمایا کہ مدینہ منورہ کے کھجور حجاز مقدس کے تمام کھجوروں سے بڑھ کر نفع بخش ہیں وہ ایک خاص قسم کا کھجور ہے، جو سب سے نرم اور سب سے لذیذ ہے۔ انھوں نے فرمایا کھجور کے اندر دیگر پھلوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ غذائیت پائی جاتی ہے اور نہار منہ اس کا استعمال، اس میں تریاقی تاثیر پائی جانے کی وجہ سے جراثیم کش ثابت ہوتا ہے۔ اگر پابندی سے نہار منہ کھانے کا معمول بنالیا جائے تو جراثیم کا مادہ خشک ہو جائے اور اس کو کمزور کردے۔

سب کے خیالات وآراء کا خلاصہ یہ ہے کہ شفاء کی احادیث شرائط کے ساتھ ہیں یہ تاثیر ان شرائط کے پائے جانے پر پائی جائے گی مثلاً حضور ﷺ کا ارشاد ''کلونجی ہر مرض کی دوا ہے۔

خطابی فرماتے ہیں کہ من کل داء میں عموم ہے جس سے خاص مراد ہوتا ہے ایسے ہی آپ ﷺ حلوا اور شہد پسند فرماتے تھے۔

ابوبکر بن عربی نے کہا کہ شہد ڈاکٹروں کے نزدیک کھجور کے مقابلہ میں تقریباً سبھی امراض کے لئے شفا کی تاثیر رکھتا ہے، اگر شہد کے بارے میں قرآن پاک کے ارشاد فيه شفاء للناس سے اکثر اور زیادہ تر امراض مراد ہیں، تو کھجور کو اس پر محمول کرنا قابل قیاس ہے، بعض دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ حضور ﷺ مریض کا حال دیکھ کر دوا تجویز فرماتے تھے تو ممکن ہے کھجور کے متعلق آپ کا ارشاد اس شخص کے لئے ہو جس کا مزاج سرد ہو تو اس وقت آپ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ سرد مزاج والے شخص کے امراض کی شفاء کھجور میں ہے، اور اس طرح کی تخصیص عام ہے۔

ابراہیم بن سعد نے اپنے والد کے حوالے سے بیان کیا ہے، فرمایا: ہم نے عبداللہ بن جعفر کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہم نے حضور ﷺ کو ککڑی سے کھجور کھاتے ہوئے دیکھا ہے، امام نسائی نے صحیح سند سے حمید اور انھوں نے حضرت انس کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ہم نے حضور ﷺ کو خربوزہ اور کھجور ملا کر کھاتے دیکھا ہے'' جس کا مطلب یہ بیان ہوا ہے کہ ایک دوسرے کی گرمی کو کم کرتا ہے۔ جدید طبی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ کھجور ان ضروری غذائی مادوں سے بھرا ہوا ہے، جن کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔

ایک کلوگرام کھجور ایک دن میں تین ہزار (کالوری) مہیا کرتا ہے، یہ مقدار پانی پینے کی طلب کو بڑھاتی ہے، جس سے میدان جہاد میں اور باغبانی و کاشتکاری کے کام میں مشکل ہوتی ہے اور ککڑی پانی کی کمی پوری کرتی ہے اور اس میں وٹامن "A" اور وٹامن "C" کی معتد بہ مقدار پائی جاتی ہے، دوسرے بہت سے غذائی اجزا اس میں نہیں پائے جاتے، کھجور دبلے پتلے لوگوں کے لئے بھی دوا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے کہ میری والدہ نے جب میری رخصتی کے خیال سے یہ چاہا کہ میں موٹی ہو جاؤں تو مجھ کو کھجور اور ککڑیاں کھلائیں اور میں اچھی خاصی موٹی ہوگئی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ "عجوہ جنت کا میوہ ہے اور وہ زہر کے اثرات سے شفاء دیتا ہے" ان سب باتوں کے ساتھ حضور علیہ وسلم کا کھجور کے پودوں کے لگانے پر توجہ مرکوز فرمانا اور اس کے لئے پھل کا اہتمام کرنا اور اس کی مختلف قسموں کو پیدا کرنے کی فکر کرنا اور اس کا اتنا زیادہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ کھجور بہت سی خصوصیات کی حامل ہے اس میں بہت سے فوائد پائے جاتے ہیں، اس میں بہت سے امراض کو دور کرنے کی تاثیر موجود ہے جیسا کہ آج کی جدید طبی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ کان کے امراض کے ماہر اطباء وٹامن (A) کو قوت سماع کی رگوں کو قوی بنانے کے لئے تجویز کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کھجور ان بوڑھوں کے لئے جن کو ثقل سماعت کی تکلیف ہوتی ہے یا زیادہ صحیح تعبیر میں اعصاب سماعت کی رگوں میں کمزوری ہوتی ہے کھجور فائدہ بخش ثابت ہوتی ہے۔

کھجور میں وٹامن (ب ۱) اور (ب ۲) پائے جاتے ہیں اور ان وٹامنوں کی تاثیر یہ ہے کہ وہ اعصاب کو قوت بخشتے ہیں خون کی رگوں کو نرم کرتے ہیں، آنتوں کو تری بخشتے ہیں اور ان کو سوزش و کمزوری سے بچاتے ہیں، ڈاکٹر وٹامن (ب ۱) کو اعصابی تکالیف، اعضاء کے شل ہونے قلبی کمزوری اور معدہ کے زخم، فکری اور اعصابی تکان کے دور کرنے کے لئے بتاتے ہیں، جبکہ وٹامن (ب ۲) امراض قلب و یرقان، ہونٹھ پھٹنے ناخون گرنے، جلد کی خشکی وغیرہ میں بتاتے ہیں، اور کھجور شفا کی ان ساری صفات کا جامع ہوتا ہے۔

جدید طبی تحقیقات کھجور کے اجزاء کی تحلیل اور شفا بخش عناصر کی تحقیق میں برابر کوشاں

ہیں، چنانچہ جدید تحقیق کا کہنا ہے کہ کھجور کے اندر پایا جانے والا ''سکا کر'' صرف حرارت، قوت اور چستی ہی نہیں پیدا کرتا وہ پیشاب بھی خوب لاتا ہے، جو گردوں کو دھودیتا ہے اور جگر کو (زہریلے) اثرات سے صاف کردیتا ہے اور خون کے اندر زہریلے اثر کو ختم کرنے کی واحد دوا اس میں باقی رہ جاتی ہے۔ سچ فرمایا اللہ کے رسول اللہ علیہ وسلم نے کہ '' عجوہ میں زہر سے شفا دینے کی تاثیر ہے''۔

طب کی پرانی کتابوں میں کھجور کا ذکر اس طرح موجود ہے کہ وہ ان اہم پھلوں میں ہے جس کا ست کھانسی اور بلغم اور اعصابی سوزش کو دور کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔

کھجور میں ''فاس فورس'' کا تناسب بہت زیادہ ہوتا ہے اور فاس فورس ہی وہ مہتم بالشان غذا ہے جو انسان کے جسم میں مفید مادہ پیدا کرتی ہے، وہ مادہ دماغ کو بڑھاتی ہے اور تناسل کی قوت پیدا کرتا ہے ہمارے لئے ممکن ہے کہ ہم کھجور کی شفا بخش قدر و قیمت کو معلوم کر کے وہ چیز حاصل کرلیں جو ارباب فکر و قلم کے پاس نہیں ہے، کھجور جنسی قوت کو بھی بڑھاتی ہے، فاس فورس، قوت حافظہ کو بڑھانے کی بڑی تاثیر و صلاحیت رکھتا ہے قرآن و حدیث اور اشعار یاد کرنے میں اسی کا اثر تھا۔

حدیث کا فقہی پہلو

زمین کی آبادی کے سلسلے میں اس حدیث سے باغبانی و کاشتکاری کی فضیلت وافادیت معلوم ہوتی ہے، جس سے جائدادوں کو ملکیت میں لینے اور اس کی دیکھ بھال کا ثبوت ملتا ہے (کہ یہ عمل غیر شرعی نہیں بلکہ شریعت میں مطلوب ہے) یہ حدیث حضرت ابن مسعود کی حدیث کے خلاف ہے جس میں مرفوعاً انھوں نے بیان کیا ہے کہ جائدادیں نہ بناؤ کہ دنیاداری کا شوق پیدا ہو جائے۔

امام قرطبی ان دونوں حدیثوں کو اس طرح جمع کرتے ہیں کہ ابن مسعود کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جائداد کو اتنا نہ بڑھایا جائے کہ دنیا سے دلچسپی بڑھ کر دینی امور سے غفلت کا سبب بن جائے اور اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بقدر کفاف یا مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہچانے کی نیت سے ہو تو باعث اجر و ثواب بنے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ افتادہ زمینوں کو آباد و کارآمد بنایا جائے، فقہ اسلامی نے زمین کے ظاہر سے فائدہ اٹھانے اور آباد کرنے یعنی کاشتکاری، باغبانی، اس پر عمارتوں اور دوسری چیزوں کے بنانے کو لفظ تعمیر (آبادکاری) سے تعبیر کیا ہے۔ اس عرف کی بنیاد و مرجع آیت

قرآنی سے ہے۔

وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَۃُ اَحْیَیْنَاھَا وَاَخْرَجْنَا مِنْھَا حَبًّا فَمِنْہُ یَاْکُلُوْنَ (یٰسٓ: ۳۳)

''اور ایک نشانی زمین مردہ ہے کہ ہم نے اسکو زندہ کیا اور اس میں سے اناج اگایا پھر اس میں سے کھاتے ہیں۔''

آبادکاری کے شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ وہ زمین کسی اور کی ملکیت میں نہ ہو۔شہر کے اندر نہ ہو جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے کہ جس نے کسی ایسے قطعۂ زمین کو جو دوسرے کی ملکیت میں نہیں ہے آباد کیا تو اس زمین کا سب سے زیادہ مستحق وہی شخص ہے جس نے اس کو آباد کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہی فیصلہ دیا ہے کہ خواہ امام وقت نے اس کو اجازت دی ہو یا نہ دی ہو اور جمہور کا قول بھی یہی ہے، امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ امام کی اجازت ضروری ہے۔

امام طحاوی نے جمہور کی تائید میں سمندری اور دریائی پرندوں اور جانوروں کے شکار پر قیاس کر کے کہ امام اجازت دے یا نہ دے دور ہو کہ نزدیک ہو شکار کیا جا سکتا ہے، اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔دلیل میں حدیث مذکور کو پیش کیا ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) اس حدیث سے زراعت و باغبانی کی اہمیت و فضیلت کا پتا چلتا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت زراعت و باغبانی بھی ہے (کہ اقتصادیات کی سب سے اہم چیز یہی ہے یہ نہ ہو تو انسان کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے) لہٰذا اس نعمت کا شکر و قدر دانی یہ ہے کہ زمین سے وہ چیزیں حاصل کی جائیں جو انسان کو فائدہ پہنچاتی ہیں، خواہ باغبانی ہو یا کاشتکاری، ارشاد ربانی ہے:

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْراً لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (الجمعۃ:۱۰)

''پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور خدا کا فضل تلاش کرو اور خدا کو بہت بہت یاد

کرتے رہو تا کہ نجات پاؤ۔''

آیت مذکور سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادات میں ترتیب کا خیال اہمیت کے اعتبار سے بہر حال رکھنا چاہئے ،لہٰذا نماز پہلے اس کے بعد پھر دوسری عبادات کی فکر، اللہ کے فضل اور کسب رزق حلال، تعلیم وتربیت اور جہاد وغیرہ۔

(۲) حدیث روئے زمین پر انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کی بھی کچھ وضاحت کرتی ہے کہ انسان کائنات کو آباد کرے اس کے مادوں اور اشیاء کو کارآمد بنائے ،کھیتی باڑی، باغبانی اس کے لئے کھاد وسینچائی وغیرہ کا نظم کہ کاشت اقتصادیات ومعاشیات کی اہم ترین چیزوں میں سے ہے، جس پر اسلامی اقتصادیات کا انحصار ہے جو انسانوں کے باہمی تعلقات کو مربوط کرتا ہے، جسکو ہم اس آیت کریمہ میں بھی دیکھتے ہیں۔

هُوَالَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِىْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ (الملک:۱۵)

وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو نرم کیا تو اس کی راہوں میں چلو پھرو اور خدا کا (دیاہوا) رزق کھاؤ اور (تم کو) اس کے پاس (قبروں سے) نکل کر جانا ہے۔

(۳) حدیث اس بات کی بھی وضاحت کرتی ہے کہ زمین کے اندر موجود تمام اشیاء انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں، ان کے تابع بنا دی گئی ہیں، انھیں اس لئے تیار کیا گیا ہے کہ جس حد تک ممکن ہو سکے انسان ان سے فائدہ اٹھائے ، اور قدرت کی کارسازی سے پردہ اٹھائے انھیں چیزوں میں شجر کاری بھی شامل ہے اور کھیتی باڑی بھی۔ اسی لئے حضور ﷺ نے اس کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا اور اس کا شوق دلایا ہے۔

(۴) یہ حدیث بندۂ مومن کو وسیع القلب بناتی ہے اس کے دائرہ اخوت کو بڑھاتی ہے، خیر خیرات اور فقراء ومساکین کی دستگیری کی راہ دکھاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کے باغ یا کھیت سے جو کچھ کھالیا جائے اور کوئی بھی کھالے چڑیاں، جانور، چوہے، سب صدقہ ہے تو اس میں اس کے مومن بھائی کو جو نفع پہنچے گا اس پر جو خرچ ہوگا، اس کے اجر کا کیا کہنا۔ اور اگر محتاج رشتہ دار ہو تو اس صدقہ کے اجر کا کیا ٹھکانا کیا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اس خیر کا کہ ایک بندۂ مومن پریشان حال ہے، کمانے سے معذور ہے، یا وسیلۂ معاش نہیں

ہے، یہ سب لوگ اپنے کاشت کار بھائی کے لئے صدقہ کا ذریعہ بنتے ہیں، اس صدقہ سے باہمی غصہ و کینہ ختم ہوتا ہے اور محبت و تعلق بڑھتا ہے۔

(۵) دنیا کے عمل کو آخرت کے عمل سے جوڑ دیتی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ زندگی سے الگ تھلگ رہنا دین داری نہیں ہے بلکہ دین تو عین تقاضہ زندگی ہے، ارشاد ربانی ہے۔

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ، وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (القصص:۷۷)

''اور جو (مال) تم کو خدا نے عطا فرمایا ہے اس سے آخرت (کی بھلائی) طلب کیجئے اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھلایئے اور جیسی خدا نے تم سے بھلائی کی ہے (ویسی) تم بھی (لوگوں سے) بھلائی کرو، اور ملک میں طالب فساد نہ ہو کیونکہ خدا فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِىٓ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (الاعراف:۳۲)

''پوچھو تو کہ جو زینت (و آرائش) اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں ان کو حرام کس نے کیا ہے؟ کہدو کہ یہ چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کے لئے ہیں اور قیامت کے دن خاص انہی کا حصہ ہوں گی۔''

حدیث - ۲۸

ذمے دار سے ذمے داری کی باز پرس ہوگی

عن یونس عن الزہری قال اخبرنا سالم بن عبداللّٰہ عن ابن عمر یقول سمعت رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: کلکم راع وکلکم مسؤل عن رعیته، الامام راع ومسؤل عن رعیته، والرجل راع فی أهله وهو مسؤل عن رعیته، والمرأة راعیة فی بیت زوجها ومسؤلة عن رعیتها۔ والخادم راعٍ فی مال سیدهِ ومسؤل عن رعیته، قال حسبتُ أنه قدقال۔ والرجل راع فی مالِ أبیه ومسؤل عن رعیته وکلکم راع ومسؤل عن رعیته۔

(صحیح البخاری حاشیہ السندی ج ا ص ۱۶۰ صحیح مسلم شرح النووی ج ۱۲ر۲۱۳)

''یونس زہری کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ زہری نے کہا کہ ہم کو سالم بن عبداللہ نے ابن عمرؓ کے حوالہ سے بتایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے ہر شخص نگراں ہے اور اس سے اس کی نگرانی کے بارے میں باز پرس ہوگی، حاکم نگراں ہے اور اس سے اس کی نگرانی کے بارے میں باز پرس ہوگی اور آدمی اپنے گھر والوں کا نگراں ہے اور اس سے اس کی نگرانی کے بارے میں باز پرس ہوگی اور عورت اپنے شوہر کے گھر میں نگراں ہے اور اس سے اس کی نگرانی کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ خادم اپنے آقا کے مال کا نگراں ہے اور اس سے اس کی نگرانی کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے خیال پڑتا ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا۔ آدمی اپنے باپ کے مال کا نگران ہے اور اس سے اس کی نگرانی کے بارے میں باز پرس ہوگی اور تم میں کا ہر شخص نگراں ہے اور اس سے اس کی نگرانی کے بارے میں باز پرس ہوگی۔''

مفہوم

انسان پر خدا تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک انعام یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عقل وادراک کی صلاحیت، قوت وارادہ کی دولت سے نوازا اور اس پر ذمہ داری اور امانت کا بوجھ ڈالا اور انسان کی بلندی وپستی دونوں اس کے مکلّف ہونے سے جڑے ہوئے ہیں اور مکلّف ہونے کا مدار اختیار اور ذمہ داری پر ہے۔

دینِ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اجتماعی ومعاشرتی زندگی کو منظّم کرنے اور مکلّف اور ذمہ داروں کا محاسبہ کرنے کے لئے اس نے ذمہ داریوں کو بہت ہی باریکی کے ساتھ تقسیم کیا ہے۔ ہر ایک اپنے منصب وذمہ داری ہی کے بقدر جواب دہ ہے۔ چنانچہ اس نے ذمہ داری کی ابتدا حاکم سے کی کہ تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ونگراں ہے اور اس کا جوابدہ ہے۔ خلیفہ نگراں ہے اور اپنی نگرانی کا جوابدہ ہے۔ اسلامی حکومت میں سب سے پہلا جوابدہ خلیفہ ہے، اس پر اسلام نے فرض کیا ہے کہ وہ امت کی نمائندگی اور اس کی دیکھ بھال کے فرض کا بار اٹھائے اور اس کے مقابل اسلام نے حاکم کے بارے میں امت پر کچھ ذمہ داریاں ڈالی ہیں، جو امت پر خلیفہ کے حقوق میں سے ہیں، اس لئے کہ ہر ذمے داری کے سلسلے میں ضروری ہے کہ ذمے دار کے بھی کچھ حقوق ہوں۔ لہٰذا حاکم کی اس زبردست ذمے داری اور امانت کی گراں باری کے پیش نظر علماء نے اس ذمے داری کے حدود متعین کئے ہیں، جو حاکم کے کاندھے پر ڈالی گئی ہے اور وہ اس کا جوابدہ ہے۔ چنانچہ ماوردی نے ایسی دس ذمہ داریاں گنائی ہیں جن کا حاکم جوابدہ ہے۔ اور ان کی ادائی اس پر لازم ہے۔ دوسرے بہت سے علماء نے ماوردی کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے۔

(۱) حاکم کا فرض ہے کہ وہ دین کے ان اصولوں اور نبیادی باتوں کی حفاظت کرے جن پر امت کے اسلاف متفق ہیں۔

(۲) لڑنے جھگڑنے والوں پر اسلامی احکام کو نافذ کرکے ان کی لڑائی کا خاتمہ کرنا کہ انصاف کا چلن ہو۔

(۳) عزت وآبرو کی حفاظت، اسلامی ملک کے حدود کو دشمنوں سے محفوظ رکھنا تاکہ لوگ معاش کے سلسلے میں امن واطمینان کے ساتھ نقل وحرکت کرسکیں اور سفر میں رکاوٹ نہ پیدا ہو۔

(۴) شرعی حدود جاری کی جائیں تا کہ اللہ کی قابل احترام قرار دی گئی چیزوں اور احکام کی حفاظت کی جائے اور ان کی بے حرمتی نہ ہو اور بندگانِ خدا کے حقوق ضائع اور برباد ہونے سے بچ جائیں۔

(۵) طاقتور فوجی تیاریوں اور مضبوط دفاعی انتظام کے ذریعہ سرحدوں کو محفوظ کیا جائے تا کہ دشمن کسی بھی سرحد پر دست درازی نہ کر سکے کہ حملہ کر کے احکام خداوندی کو پامال کرے اور مسلمانوں یا جن قوموں سے معاہدہ ہے ان کا خون بہائے۔

(۶) جو لوگ دعوت کے بعد اسلام کی مخالفت کریں ان سے جہاد کیا جائے یا وہ ذمی بننا قبول کرلیں۔

(۷) مالِ غنیمت اور صدقات کو شریعت کے مطابق بلا کسی زیادتی کے وصول کیا جائے خواہ وہ نص قطعی سے ثابت ہو یا علماء کے اجتہاد سے۔

(۸) بیت المال سے لوگوں کو جو حق پہنچتا ہو، اس کے مطابق بلا کسی کمی وبیشی کے صحیح حساب لگا کر دیا جائے، اور بلا کسی تاخیر وتقدیم کے وقت پر دیا جائے۔

(۹) باصلاحیت اور امانت دار لوگوں کو کام پر لگانا اور مالوں کو ان کے حوالے کرنا تا کہ کام ٹھیک ٹھیک انجام پائیں۔ مال محفوظ ہوں۔

(۱۰) حاکم بذات خود کاموں کی نگرانی کرے اور حالات کی تحقیق کرتا رہے تا کہ امت کی قیادت اور ملت کی حفاظت کا فکر واہتمام رہے، لذت کوشی میں پڑ کر یا عبادت میں مشغول ہو کر دوسروں ہی پر بھروسا نہ کرے کہ کبھی کبھی امانت دار شخص سے بھی خیانت سرزد ہو جاتی ہے اور بہی خواہ دھوکا دے دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. (ص:۲۶)

''اے داوَدؑ ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمھیں خدا کے رستہ سے بھٹکا دے گی۔''

اللہ تعالیٰ نے صرف کام حوالے کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ عملاً کرنے کا حکم دیا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں کا ہر شخص اپنی نگہبانی کے بارے میں جوابدہ ہے۔''

امام کی ذمے داری زبردست ذمہ داری اور گرانبار امانت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص مسلمانوں کے کسی معاملے کا ذمے دار بنا پھر کوئی کام کسی ایسے شخص کے حوالہ کیا جس سے بہتر آدمی موجود تھا تو اس نے اللہ و رسول اور مسلمانوں کی خیانت کا ارتکاب کیا۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''جو شخص مسلمانوں کے معاملات میں سے کسی کام کا ذمہ دار بنا پھر اس نے اس میں سے کوئی ذمہ داری، دوستی یا رشتہ کی بنا پر کسی شخص کے حوالہ کی تو اس نے اللہ اور اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی۔

لہٰذا ضروری ہوا کہ حاکم اپنے نائب کے طور پر دوسرے شہروں پر جو گورنر، قاضی یا فوجی جنرل مقرر کرے ان کی صلاحیت اور کام کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی صفات کو اچھی طرح معلوم کر لے، اسی طرح لشکروں کے سپہ سالار اور مالیات کے ذمہ دار وزرا، کلرک، سرکاری دفاتر سے ایسے حقوق نکلوانے والے جن کے حصول میں دشواری ہوتی ہے اور خراج وصدقات اور دیگر مالوں کو جو مسلمانوں کیلئے ہیں وصول کرنے والے عمال، ان میں سے ہر ایک کی ذمہ داری ہے کہ اپنے نائب و عامل اس شخص کو بنائے جو اس کام کے لئے سب سے باصلاحیت ہوں، یہاں تک کہ مساجد کے ائمہ اور مؤذنوں، قاریوں او راستادوں، حج کے امیروں، مالوں کے خزانچی، قلعوں کے پہریدار، لشکروں کے نگراں، قبیلوں، بازاروں کے حالات معلوم کرنے والے ان تمام قسم کے لوگوں کے لے ضروری ہے کہ جو شخص بھی مسلمانوں کے ان معاملات میں سے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنے تو اپنے دائرۂ اختیار میں ایسے ہی شخص کا تقرر کرے جو اس کام کے لئے سب سے بہتر اور اہل ہو۔ اگر اہل و مستحق کے حق سے ہٹ کر محض رشتہ، دوستی، آزاد کردہ غلام یا ایک شہر میں رہنے کے تعلق یا مذہب وقومیت جیسے عربی وفارسی، یا رشوت کی وجہ سے خواہ وہ مال کی شکل میں ہو یا نفع کی یا کسی اور سبب کی بنا پر جیسے باصلاحیت شخص کی طرف سے دل میں کینہ وناراضگی ہو یا دونوں میں دشمنی ہو، اس لئے غیر مستحق کو ذمہ داری دے دی تو اس نے اللہ اور شااللہ کے رسول اور مسلمانوں کی خیانت کی اور آیت پاک میں جس چیز سے اس کو منع کیا گیا ہے اس کا مرتکب ہوا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَاتَخُونُوااللّٰه وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوآ اَمَانَاتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (الانفال:۲۷)

''اے ایمان والو! نہ تو خدااور رسول کی امانت میں خیانت کرواور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرواور تم (ان باتوں کو) جانتے ہو۔''

وَاعْلَمُوآ اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيمٌ۔ (الانفال:۲۸)

''اور جان رکھو کہ تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے اور یہ کہ خدا کے پاس نیکیوں کا بڑا ثواب ہے۔''

انسان اپنے بیٹے کی محبت وآزاد کردہ غلام کے تعلق کی بنا پر متاثر ہوکران کو ایسا منصب دے دیتا ہے، جس کی ان میں صلاحیت نہیں ہوتی اسی طرح اپنے کسی خوشامدی کو عہدہ دیدیتا ہے ان سب صورتوں میں وہ امانت میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ سنت رسول ﷺ سے معلوم ہوا کہ حکمرانی ایک امانت ہے، جس کا، ان مواقع کالحاظ رکھتے ہوئے، جن کا ذکر ہوا، ادا کرنا ضروری ہے۔ آپ ﷺ کا امارت کے سلسلے میں حضرت ابوذرؓ سے فرمانا کہ ''وہ ایک امانت ہے جو قیامت میں ندامت وشرمندگی کا سبب ہوگی۔ سوائے اس شخص کے جس نے اس کے حقوق کے ساتھ اس ذمے داری کو سنبھالا اور اس امانت کے سلسلے میں اس پر جو ذمے داری تھی اس کو پورا کیا۔''

امام بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت فرمایا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جب امانت ضائع کی جانے لگےتو قیامت کا انتظار کرو۔'' حدیث کے اس معنی پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ لہٰذا جس شخص کو یتیم کے مال کے سلسلہ میں (دیکھ بھال) کی وصیت کی گئی ہو یا جو شخص وقف کا نگراں ہو، یا کسی شخص نے اپنے مال میں کسی اور شخص کو وکیل بنا دیا ہو، تو ان سب کو ان ذمہ داریوں کی ادائی میں بہتر سے بہتر طریقہ اپنانا چاہئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَاتَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ اِلَّا بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ (بنی اسرائیل:۳۴) (اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکنا مگر ایسے طریقہ سے کہ بہت بہتر ہو۔) آپ نے احسن کے بجائے حسنة کا

لفظ نہیں استعمال فرمایا اس لئے کہ حاکم لوگوں کا بالکل ایسا ہی نگراں ہے جیسا بکریوں کا چرواہا بکریوں کا نگراں ہوتا ہے، حدیث میں جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی بھی نگراں نہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے نگرانی سونپی ہو پھر وہ اس حال میں مرے کہ دھوکا دہی سے کام لیا ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کی خوشبو حرام فرما دیتا ہے۔ (صحیح مسلم: ملاحظہ ہو کتاب السیاسۃ الشرعیۃ۔امام تیمیہ)

آدمی اپنے گھر والوں کا نگراں ہے اور اس سے اس کی نگرانی کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

دین اسلام نے خاندانی نظام کی طرف خصوصی توجہ دی ہے اور اسی سے معاشرہ کی بنیاد قائم کرنے کا کام لیا ہے۔ تاکہ خاندان کی تعمیر کے سلسلے میں اسلام کا مقصد مضبوط بنیادوں پر عملی شکل اختیار کرے، اسلام نے ذمے داری اور کاموں کو بڑے اچھے ڈھنگ سے تقسیم کیا ہے، جس سے ایک طرف گھر کا نظام درست ہوتا ہے۔ تو دوسری طرف گھر کے باہر کا نظام بھی درست ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مرد وعورت دونوں کی ذمہ داریاں الگ الگ متعین ہو جاتی ہیں۔

جب آدمی اپنے اہل خانہ کا نگراں ہے تو اس کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کمانے کی کوشش اور جدوجہد کرے، جس کی گھریلو نظام کو چلانے کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔ (النساء:۳۴)

مرد عورتوں پر حاکم ومسلط ہیں اس لئے کہ خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے اور اس لئے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

مرد عورت کو سیدھی راہ پر رکھنے والا ہے، وہ اس کا حاکم وسردار ہے۔ اگر ٹیڑھی راہ چلے تو اس کو ادب سکھانے والا اور سیدھی راہ دکھانے والا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو مرد وعورت دونوں کو پیدا کرنے والا ہے مرد کو عورت پر اس کی ان بہت سی صلاحیتوں کے سبب جو عورت میں نہیں رکھی گئی ہیں فضیلت دی ہے۔ اس لئے بھی کہ مرد عورت پر اپنا مال خرچ کرتا ہے مثلاً مہر دیتا

ہے، نان ونفقہ کی ذمہ داری بھی اس پر ہوتی ہے۔جیسا کہ حدیث وقرآن میں بتایا گیا ہے۔لہٰذا مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے اور جب فضیلت حاصل ہے تو عورت کا قیم وسردار یہی ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وللرجالِ علیہن درجۃ۔

علی بن طلحہ بن عباس سے مروی ہے کہ ''الرجال قوامون علی النساء'' (مرد عورتوں کے حاکم ہیں) لہٰذا جن باتوں میں اس کو شوہر کی فرمانبرداری کا حکم ہے، فرمانبردار رہے گی۔اس کے گھر والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھے گی۔اس کے مال کی پوری پوری حفاظت ونگرانی رکھے گی۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱/۴۲۷)

قانون خداوندی اس ذمہ داری کے سلسلہ میں پیدائشی مزاج وصلاحیت کی پوری رعایت کرتا ہے تاکہ مرد وعورت دونوں ہی کا نفس اپنے سے متعلق ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی الگ الگ صلاحیت کا حامل ہو، ذمہ داریوں کو تقسیم کرنے میں شخص کی صلاحیت کا لحاظ رکھنا انصاف کا تقاضا ہے اور انصاف یہی ہے کہ مرد وعورت دونوں کو جو صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں، انھیں کے اعتبار سے ان کی ذمہ داری بھی ہونی چاہئے۔لہٰذا اس اعتبار سے مرد کی حاکمیت مقدم ہے، اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ نے مضبوطی وطاقت کی خصوصیت سے نوازا ہے، اس کو کام شروع کرنے سے پہلے بیدار مغزی اور غور وفکر کرکے اسباب معاش اپنانے اور زندگی کی تمام ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت بخشی ہے، اس لئے کہ مرد کی تمام ذمہ داریاں کام کے آغاز سے پہلے سوچ بچار کی متقاضی ہوتی ہیں۔مرد کی فطری صلاحیتیں عورت پر اس کی حاکمیت کی ذمہ داری کو ادا کرنے کی پوری قدرت عطا کرتی ہیں۔اور وہ اس میدان میں ایسی ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برآ ہوتا ہے۔مثلاً عورت کا نان ونفقہ جو عورت کے حقوق کے سلسلہ میں ایک جزء ہے، اپنی حاکمانہ صلاحیت کے سبب خاندان کے لئے اسباب معاش کو اپنانے اور مال کے خرچ کی نگرانی کے کام کو بہتر طریقہ پر انجام دے سکتا ہے کہ اس کے مزاج وذمہ داری کے شایانِ شان ہے۔

خانگی زندگی میں مرد کی ذمہ داریوں میں سے سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دین دار اور نیک بیوی کا انتخاب کرے، اس لئے کہ اسلام خاندانی نظام قائم کرنے والا دین ہے۔

لہٰذا خاندان اور گھریلو فرائض کے بارے میں وہ مومن کی ذمہ داریاں متعین کرتا ہے۔ اس لئے مسلم گھرانا تربیتی قلعوں میں سے ایک قلعہ ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ قلعہ اندر سے مستحکم و مضبوط ہو، گھر کا ہر فرد سرحد پر ہے کوئی غلط چیز قلعہ میں داخل نہ ہونے پائے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا پوری کی پوری متاعِ قلیل ہے اور اس کی سب سے اچھی متاع نیک بیوی ہے۔''

(سنن نسائی شرح سیوطی وحاشیہ السندی ج ۶ ر ص ۶۸)

ازدواجی تعلقات میں اصل چیز تعلقات میں مضبوطی اور اس پر دوام ہے۔ اسلام اس تعلق کو مختلف پابندیوں سے گھیر دیتا ہے، جو اس تعلق کے بقاء و تسلسل کو سنبھالے رکھیں اور اس مقصد کو عملی شکل دینے کے لئے ذمہ دار مرد کو ٹھہرایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئاً وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْراً كَثِيْراً۔ (النساء:۱۹)

اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے رہو سہو، اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور خدا اس میں سے بہت سی بھلائیاں پیدا کرے۔

اس آیت کی روشنی میں مرد کو حلم وصبر سے کام لینا ہوگا، خواہ ناگوار بات ہی کیوں نہ پیش آئے، مرد کا حلم وصبر ناگواری کے پس پردہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت سی بھلائیاں ہوتی ہیں، جو صبر کا مرحلہ گزار کر ہی حاصل ہوتی ہیں۔ کیا معلوم کہ یہی عورتیں جو ناپسندیدہ ہیں بڑی خیر و برکت کا سبب بنیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لئے اس خیر کو محفوظ رکھے، لہذا یہ ٹھیک نہیں کہ یہ خیر ہاتھ سے نکل جائے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: لوگو! بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کے بارے میں میری وصیت مانو میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کی ان بندیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، نرمی اور مدارات کا برتاؤ رکھو، ان کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے جو قدرتی طور پر ٹیڑھی ہوتی ہے اور زیادہ کجی پسلی کے اوپر کے حصہ میں ہوتی ہے، اگر تم اس ٹیڑھی پسلی کو (زبردستی) بالکل سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو وہ ٹوٹ جائے گی، اور اگر اسے یونہی اپنے حال پر چھوڑ دو گے

(اور درست کرنے کی کوشش نہ کروگے) تو پھر وہ ہمیشہ ویسی ہی ٹیڑھی رہے گی۔ اس لئے بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی میری وصیت ہے۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے ایک دوسری حدیث میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کوئی مومن بندہ مومن عورت کو نقصان نہ پہونچائے اگر اس کی ایک عادت ناپسند آئے گی تو اس کی دوسری عادت کو وہ پسند کرے گا۔'' (نیل الاوطار ۱۱۰؍شوکانی۔ ج ٦)

اسلام بیوی کے انتخاب میں اس کی نشانیوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے کہ اس کی روشنی میں آدمی بیوی کا انتخاب کرے۔

حضرت سعید مقبری حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت فرماتے ہیں کہ انھوں نے بیان کیا کہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سی بیوی اچھی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا ''اچھی بیوی وہ ہے، جسے دیکھ کر شوہر خوش ہو اور اس کو کوئی حکم دے تو وہ اس کو مانے، عورت اپنے جان و مال میں شوہر کی مرضی کے خلاف ایسا تصرف نہ کرے جو اس کو پسند نہ ہو۔ (سنن نسائی ج ٦)

بندے کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں اہل وعیال اور خود بیوی کی تربیت، دعوت واصلاح کی فکر کرلے، اس لئے کہ مسلم گھرانا ہی جماعت اور مسلم معاشرے کی بیج اور بنیاد ہے۔ گھر ہی وہ یونٹ ہے کہ اس سے اور دیگر یونٹوں سے اسلامی معاشرے کا زندہ جسم تیار ہوتا اور پروان چڑھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم مردوں، عورتوں دونوں کے لئے نازل ہو رہا تھا اور گھریلو نظام کو اسلامی طریقہ پر منظم اور درست کر رہا تھا۔ مسلمانوں پر ان کے گھر والوں کی ذمہ داری ایسے ہی ڈال رہا تھا جیسے کہ خود ان کی ذات کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْآ اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَاراً وَّقُوْدُ هَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلآئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللهَ مَآاَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَايُؤْمَرُوْنَ (التحریم:٦)

مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آتش (جہنم) سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تندخو اور سخت مزاج فرشتے (مقرر) ہیں جو ارشاد خدا ان کو

فرماتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم ان کو ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔

عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے اور اس سے اس کی نگرانی کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ یہاں ایک بات قابلِ غور ہے، جس کو دعوت وتربیت کا کام کرنے والے ہر مسلمان مرد اور عورت کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے، وہ یہ کہ دعوت وتربیت کی پہلی کوشش اپنے گھر، اس کے بعد بیوی پھر ماں اور بچے ان کے بعد گھر کے دیگر لوگوں پر صرف کرنی چاہئے، ایسا مسلمان گھرانا جس پر اسلام کی چھاپ نظر آئے اور جس میں بچوں کی تربیت کی فکر پائی جاتی ہو، وہ وجود میں لانے کے لئے بیوی اور شوہر میں باہم اشتراک وتعاون کا پایا جانا بہت ضروری ہے۔ لیکن اس میدان میں پہلی ذمہ داری مسلمان نیک عورت پر آتی ہے۔ اور یہ بات اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک عورت شرعی اعتبار سے اپنے شوہر کے مقام ومرتبہ کو نہ پہچانے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: (اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ (اللہ تعالیٰ کے سوا) وہ کسی اور کو سجدہ کرے تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے شوہر کا بڑا مرتبہ رکھا ہے) حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ (اگر شوہر گھر میں موجود ہو تو اس کی اجازت کے بغیر عورت (نفلی روزہ) نہ رکھے، اسی طرح اس کی موجودگی میں کسی (غیر) کو گھر میں داخلہ کی اجازت نہ دے، شوہر کی کمائی میں سے اس کی اجازت کے بغیر جو کچھ خرچ کرے گی اس کا آدھا اجر اس کے شوہر کو ہوگا) اس کی کمائی میں سے اس انفاق کو بعض علماء نے اس مال پر محمول کیا ہے جس پر شوہر نے بیوی کو مالکانہ حق دے دیا ہو کہ وہ اس کو اپنے خرچہ میں لائے، حضرت ابو ہریرہؓ نے یہی فتویٰ دیا ہے۔ (الاداب: ابوبکر بن الحسین البیہقی رص ٦٢)

شوہر کا اتنا ادب وخیال بلا استثنا اس کے تمام حالات میں ضروری ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے فرمایا کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ گھر کی صفائی کرنے، کھانا دینے، روٹی پکانے، آٹا پیسنے، شوہر کے غلاموں اور جانوروں کو چارہ کھلانے، پانی پلانے کا کام کرے گی کہ نہیں اسی طرح کے اور دوسرے کام۔

بعض علما نے یہ کہا ہے کہ اچھے کاموں میں خدمت کرنا ضروری ہے۔ اور یہی درست ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خلاف شرع کام میں شوہر کی اطاعت نہ کرے گی۔ اس کی حدیث وسیرت

کی کتابوں میں بڑی اچھی اچھی مثالیں موجود ہیں۔صحابہ کرام کی بیویوں کا کردار موجود ہے کہ وہ کس طرح اپنے شوہروں کی خدمت کرتی تھیں۔اور شوہروں کے حقوق کے سلسلہ میں ان پر اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری ڈالی ہے اس سے کس ذوق وشوق کے ساتھ عہدہ برآ ہوتی تھیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی حضرت اسماء اپنا حال بیان کرتی ہیں، فرماتی ہیں کہ ''ہم سے حضرت زبیرؓ نے شادی کی۔ان کے پاس ان کے گھوڑے کے علاوہ اور کوئی مال نہ تھا، اور نہ کوئی غلام تھا۔ہم ہی اس گھوڑے کو چارہ دیتے، اس کی دیکھ بھال کرتے، ان کے اونٹ کیلئے کھجور کی گٹھلیاں کوٹتے، چارہ دیتے، پانی پلاتے، خود ہی آٹا صاف کرتے، گوندھتے، ہم اچھی طرح روٹی پکانا نہیں جانتے تھے، لہٰذا ہماری انصاری پڑوسنیں ہماری روٹی پکا دیا کرتی تھیں۔وہ بڑی مخلص عورتیں تھیں۔حضرت زبیرؓ کو حضور ﷺ نے کچھ زمین عنایت فرمائی تھی، ہم وہاں سے اپنے سر پر کھجور کی گٹھلیاں رکھ کر لایا کرتے تھے، یہ زمین ہمارے گھر سے تین فرسخ کے فاصلہ پر تھی۔فرماتی ہیں کہ ایک دن میں سر پر کھجور کی گٹھلیاں لئے آ رہی تھی کہ راستہ میں حضور ﷺ ملے، آپ رشتہ میں ان کے بہنوئی ہوتے تھے حضرت عائشہ حضرت اسماء کی حقیقی بہن تھیں) آپکے ساتھ آپ کے کچھ صحابہ بھی تھے۔آپ نے مجھے دیکھ کر بلایا کہ اپنے پیچھے سواری پر بٹھالیں، مجھے شرم آئی کہ میں غیر مردوں کے ساتھ چلوں۔ مجھے حضرت زبیرؓ کی غیرت یاد آئی، میں سواری پر نہ بیٹھی۔حضور تشریف لے گئے۔گھر آ کر ہم نے حضرت زبیرؓ سے پورا واقعہ بیان کیا کہ حضور نے اونٹنی بٹھادی اور مجھ کو سوار ہونے کے لئے کہا لیکن میں لجائی اور آپ کی غیرت وشرم یاد آ گئی لہٰذا سوار ہونے سے انکار کر دیا۔واقعہ سن کر حضرت زبیرؓ نے کہا کہ تمھارا کھجور اٹھانا آپ ﷺ کے ساتھ سوار ہونے سے زیادہ میرے لئے باعثِ تکلیف ہے۔فرماتی ہیں کہ پھر میرے والد حضرت ابوبکر نے مجھے ایک خادم دے دیا جس نے گھوڑے کی دیکھ بھال سے مجھ کو مستغنی کر دیا، جس کے سبب میں ایسی سبک دوش ہوئی کہ گویا میں غلام تھی اب آزاد ہوگئی۔(مسند الامام احمد بن حنبل ج ٦ رص ٣٤٧)

یہ گھریلو زندگی کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے، یہ ایک شریف وبلند کردار مرد جلیل کی تصویر ہے، ایک مسلمان خاتون کی مثال کہ انھوں نے بیوی ہونے کی حقیقت اور ذمہ داری کو کس

گہرائی کے ساتھ سمجھا اوراسی سانچے میں ڈھل گئیں۔جن لوگوں نے اسلام کواچھی طرح سمجھا اور ان کواس میں مزا آیا ان پر یہی اثر ڈالا۔شوہر و بیوی دونوں نے ایک دوسرے کا حق ادا کیا۔محبت ورحمت کے جذبات کے ساتھ ادا کیا، سعادت سمجھ کر خوش دلی کے ساتھ ادا کیا، محض ادائے فرض کے طور پر نہیں۔ اس حدیث کی روشنی میں قرآن کریم بندۂ مومن کو آگاہ کرتا ہے، کہ وہ اپنے گھر کے اندر تربیت و یاددہانی کرانے کے فریضے کو ادا کرنے کی پوری فکر کرے، جس سے خود کو بھی آگ (جہنم) سے بچائے اور اپنے گھر والوں کو بھی، ذمے داری مرد وعورت دونوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔اس تربیت کی ابتدا ماں کی نگرانی اور باپ کی رہنمائی سے شروع ہوتی ہے۔ ماں اپنے چھوٹے بچوں کی تربیت، پیار، محبت، لطیف مسکراہٹ اور مکمل دیکھ بھال کے ذریعہ کرتی ہے۔ کمسن بچوں کی مناسبت سے ان کو اچھے قصے سناتی ہے، حسن اخلاق کے نمونے دکھاتی ہے ادب وشایستگی کا خیال رکھتی ہیں۔ جب بچے اس پیار بھرے ماحول میں پروان چڑھیں گے تو اگلے مرحلے میں باپ اپنا فریضہ ادا کرے گا۔ان کی اچھی تعلیم وتربیت کا نظم کرے گا۔ بندۂ مومن کا کام اپنے بارے میں اپنی اولاد کے بارے میں، اپنے متعلقین کے بارے میں بہت نازک اور جان جوکھم میں ڈال کر کرنے کا ہے۔

بچے عمر کے ابتدائی مرحلے میں بڑی شفقت ورحمت کے محتاج ہوتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت حسن بن علی کو بوسہ دیا۔ وہاں اقرع بن جابر بھی موجود تھے انھوں نے کہا اللہ کے رسول! ہمارے دس بیٹے ہیں ہم نے ان میں سے کسی کو بھی آج تک بوسہ نہیں دیا۔ راوی فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ ”جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔“

یہ حدیث چھوٹے بچوں کی تربیت کے سلسلے میں نبوی تربیت کا بڑا خوبصورت نمونہ اور توجہ نامہ ہے۔

حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ حضور ﷺ ہم کو پکڑتے اور اپنی رانِ مبارک پر بٹھاتے اور حضرت حسن کو اپنی داہنی ران پر بٹھاتے پھر ہم دونوں کو چمٹا لیتے اور فرماتے ”اللہم ارحمہما فانی ارحمہما“ (اے اللہ تو ان دونوں پر رحم فرما۔ میں ان دونوں پر

مہربان ہوں) اس طرح سے اور بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ جو خاص طور سے بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں ہمارے سامنے بڑی واضح تصویر پیش کرتی ہیں۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے دو بچیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ سنِ بلوغ کو پہنچ جائیں، تو وہ شخص قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ ہم دونوں اس طرح (ساتھ) ہوں گے۔ آپ نے اپنی دونوں انگلیاں ملا کر فرمایا اس طرح ساتھ ہوں گے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے بھی تین بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں اور وہ شخص ان کے حقوق کی ادائی کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کو پیش نظر رکھے، کوتاہی سے ڈرتا رہے اور حسنِ سلوک کرے تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ (الادب للبیہقی: ص ۴۰، ۴۹)

اس مشفقانہ تربیت کا اجر و ثواب شوہر و بیوی دونوں کو ملے گا، لہذا دونوں پر فرض ہے کہ خود اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو جہنم کی آگ سے بچائیں۔ اور دونوں فکر مند رہیں کہ تربیت کا یہ موقع ضائع نہ ہو جائے کہ بعد میں کفِ افسوس ملنا پڑے۔ آپ ﷺ نے تربیت کی مدت کو جو مطلوب و ضروری ہے مناسب وقت و عمر کے ساتھ متعین فرما دیا ہے۔ لہذا اس مدت میں خصوصاً تربیت اولاد کی پوری فکر رکھنی چاہیے۔

حضرت سرہ بن مصعب معبد جہنی سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اس کو نماز کا حکم دو اور جب دس سال کا ہو جائے تو نماز چھوڑنے پر اس کو سزا دو حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا "جب تمھارے بچے سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز کا حکم دو اور جب دس سال کے ہو جائیں نماز چھوڑنے پر ان کو سزا دو۔ اسی طرح جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو ان کے بستر بھی الگ کر دو۔ یعنی الگ الگ سویا کریں۔ (مختصر سنن ابی داؤد حافظ منذری۔ ج ۱ ص ۲۷۰)

اس مشترکہ ذمہ داری ہی کی وجہ سے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا (الاحقاف: ۱۵) (اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا) یہ ذمہ داریاں گھر اور متعلقین سب پر مشتمل ہیں۔

محض ماں باپ ہونا ہی اس ذمہ داری کا متقاضی ہے۔ دوسری کسی اور کی قید نہیں۔ یہ وصیت یا حکم اللہ رب العالمین کی طرف سے ہے اور قرآن کریم میں متعدد بار آیا ہے، احادیث شریفہ میں بھی بار بار ذکر و تاکید آئی ہے۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید تو بار بار آئی ہے۔ لیکن اولاد کے ساتھ والدین کے سلوک کا ذکر خال خال آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد سے فطری تعلق و محبت خود ہی والدین کو محبت و شفقت پر آمادہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ ذمہ داری اور اولاد کی فکر خداداد ہے۔ جو والدین کو اس پر مجبور کرتی ہے، اس لئے کسی ترغیب و تشویق کی ضرورت نہیں، والدین کے ساتھ حسن سلوک ہی کے تقاضے سے فرمایا گیا کہ (آدمی اپنے باپ کے مال کا نگراں و ذمہ دار ہے اس کے متعلق اس سے باز پرس ہوگی، والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ایک بہترین صورت یہ بھی ہے کہ ان کے مال کو بڑھایا جائے اور ان کے مالی معاملات کی فکر و نگرانی رکھی جائے، ان کے چھوٹے بچوں کی معاشرتی و تربیتی فکر بھی کی جائے کہ وہ حقیقی بھائی بہن ہیں۔ نوخیز و کمسن ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام خاندان کو اپنی عمارت کی پہلی اینٹ قرار دیتا ہے۔ گھر وہ پناہ گاہ اور قلعہ ہے جہاں نوخیز پلتے اور پروان چڑھتے ہیں اور محبت و تعاون، ایک دوسرے کی کفالت و تعمیر ذات کا مشترکہ اور مثبت تعاون، اپنے بڑے بھائی اس کی بیوی اور بچوں سے حاصل کرتے ہیں۔ خادم اپنے آقا کے مال کا محافظ و نگراں ہے اور اپنی اس ذمہ داری کا جواب دہ ہے گھر کے لئے خادم رکھنا انبیاء کرام علماء اور صالحین کے نزدیک ایک اچھی بات اور عادت جاریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَتْ اِحْدٰهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ۔ (القصص:۲۶)

ایک لڑکی بولی کہ ابا ان کو نوکر رکھ لیجئے کیونکہ بہتر نوکر جو آپ رکھیں وہ ہے (جو) توانا اور امانت دار ہو۔

آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ خادم یا خادمہ رکھنے میں اس بات کا اہتمام بھی ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کے ادا کرنے کی قوت و صلاحیت بھی رکھے اور امانت دار بھی ہو۔ چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی نے موسیٰ علیہ السلام کی امانت و پاکدامنی کو دیکھا تو

اپنے والد ماجد کو ان کے نوکر رکھنے کا مشورہ دیا تا کہ وہ ان کے اور ان کی ہمشیر کے کاموں کا بوجھ اٹھالیں کہ بکریوں کی دیکھ بھال اور دوسرے باہری کام وہ انجام دیا کریں اس لئے کہ وہ طاقتور بھی ہیں اور مال وغیرہ کے بارے میں امانت دار بھی، حضرت ابوبکرؓ نے بھی نوکر رکھا تھا اور اپنی صاحبزادی حضرت اسماء کے لئے بھی نوکر رکھ دیا تھا جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ آپ ﷺ نے بھی ایک خادم رکھا اور دوسرے خادم اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ کو دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خادم کا رکھنا شریعت سے ثابت ہے۔ لیکن اسلام نے خادم کے مرتبہ کو بلند رکھا ہے اس کے ساتھ توہین آمیز سلوک کی اجازت نہیں دیتا۔ عہد نبوی میں مدینہ منورہ کا معاشرہ نوکروں، خادموں اور غلاموں سے پُر تھا، اور آبادی میں ان کا اچھا خاصا تناسب تھا، اسی وجہ سے اسلام نے ان غلاموں اور خادموں کا تربیتی اور سماجی اعتبار سے بہت اہتمام کیا اور دین اسلام جو اللہ کا اتارا ہوا دین ہے یہ غلاموں کی مشکلات کا برابر مداویٰ کرتا رہا اور ان کی شان و مرتبہ کو بڑھاتا رہا، تا کہ وہ اس مدنی معاشرہ کا جس کی تشکیل بھائی چارہ پر تھی اس کا مفید عنصر بنیں۔ حضرت عمرةؒ بنت عبدالرحمٰنؒ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: حضرت جبریل علیہ السلام مجھ کو پڑوسی کے حقوق کے بارے میں برابر وصیت فرماتے رہے۔ اتنا کہ مجھے یہ خیال ہونے لگا کہ پڑوسی کو وراثت میں شریک کردیں گے، ایسے ہی غلام کے بارے میں اور اس کے حقوق کی رعایت کے سلسلہ میں وصیت فرماتے رہے حتیٰ کہ مجھے یہ خیال آنے لگا کہ اس کے لئے کوئی مدت مقرر فرمادیں گے کہ جب اتنی مدت گذر جائے تو اس کو آزاد کردیں۔''

حضرت مغیرہ ام موسیٰ سے اور وہ حضرت علی سے روایت کرتی ہیں کہ ''حضور ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے آخری الفاظ ''الصلوة الصلوة. اتقواللّٰہ فیما ملکت ایمانکم''، ''نماز کے پابند رہو اور اپنے غلاموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ ان پر کوئی زیادتی یا ان کی حق تلفی نہ ہوجائے۔''

خادموں کے حقوق و مرتبہ کے سلسلہ میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، حضرت شعبہ بیان کرتے ہیں کہ ہم سے واصل احدب نے بیان کیا۔ فرمایا ''میں نے معرور بن سوید کو کہتے ہوئے سُنا کہ ہم نے ابوذر غفاریؓ کو دیکھا کہ جو جوڑا خود پہنے ہوئے ہیں ویسا ہی جوڑا ان کا خادم

پہنے ہوئے ہے۔ ہم نے ان سے اس کا سبب معلوم کیا، تو فرمایا میں نے ایک شخص سے ناشائستہ انداز میں بات کی، اس نے حضور ﷺ سے میری شکایت کردی آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم نے اس کی ماں کا ذکر کر کے اس کو شرم دلائی ہے''، میں نے تسلیم کیا کہ ہاں اللہ کے رسول۔ پھر آپ نے فرمایا: ''تمھارے خدمت گذار تمھارے بھائی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو تمھاری قوت بنایا ہے۔ تو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ جس کا بھائی اس کے ماتحت ہو وہ اپنے بھائی کو بھی وہی کھلائے جو خود کھائے، اس کو بھی وہی پہنائے جو خود پہنے، اس پر ایسے کام کی ذمہ داری نہ ڈالو جو اس کے بس سے باہر ہو، اور اگر ان پر یہ ذمہ داری ڈالو تو اس کے پورا کرنے میں ان کی مدد کرو۔''

(الادب: بیہقی۔ ص ۶۵، ۶۶)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے جب کسی کا خادم کھانا تیار کرے اور کھانا لے کر تمھارے پاس آئے تو اس کو بھی کھانے میں اپنے ساتھ بٹھالو کہ وہ بھی کھائے کہ اس نے کھانا پکانے میں گرمی اور دھنویں کی تکلیف اٹھائی ہے اگر معمولی کھانا بھی ہو تو اس کے ہاتھ میں ایک دو لقمہ ہی رکھ دے۔''

اس برادرانہ و شریفانہ انسانی سلوک کی تعلیم کے بعد اسلام نے خادم سے بھی اس کے مقابلہ میں مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے آقا کے مال کو بڑھانے اور اس کی حفاظت اور خرچ کے سلسلہ میں امانت دار رہے، اس میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔ اس سلسلہ میں اپنے بھائی ہونے میں وفاداری اور امانت داری کا پورا پورا خیال رکھے، مالک کے مال کو اپنا مال سمجھے، اور اس کی دیکھ بھال کا اپنے کو سب سے زیادہ ذمہ دار و حقدار سمجھے، آپ ﷺ نے اپنے ارشاد مبارک میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''اگر خادم اپنے آقا کا ہمدرد و بہی خواہ ہو اور اچھی طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تو اس کو دہرا اجر ملے گا۔'' (بخاری و مسلم)

حدیث کا فقہی پہلو

(۱) آدمی اپنے متعلقین کا ذمہ دار ہے اس کی رو سے ان لوگوں کا کپڑا مہیا کرنا بھی اس کے

ذمہ ہوگا۔ جو اس کی حیثیت واستطاعت کے بقدر واجب ہوگا، خوشحالی ہے تو اس معیار سے، تنگی ہے تو اس کے اعتبار سے، بقدرِ گنجایش دونوں صورتوں میں جو معیار ہو اس کے اعتبار سے ان کے لیے مکان بستر، لحاف اور تکیے وغیرہ کا انتظام کرے۔

(۲) اگر بیوی ایسی ہو کہ خود اپنا کام نہ کرسکتی ہو کہ وہ باحیثیت ہے یا بیمار ہے تو اس کے لئے خادم کا نظم کرنا واجب ہے اس لئے کہ حسن معاشرت کا تقاضا ہے کہ اس کے لئے خادم رکھے۔ شوہر ہی کے اوپر خادم کے بھی اخراجات کھانا کپڑا بھی ہے۔ اگر شوہر بیوی کے اخراجات حسب حیثیت نہیں ادا کرتا۔ یا اس کی ضرورت سے کم دیتا ہے تو بیوی کو حق پہنچتا ہے کہ شوہر کے مال میں جتنا شوہر پر واجب ہے لے لے، خواہ اجازت دے یا نہ دے، اس کا ثبوت حضور ﷺ کے اس ارشاد سے ملتا ہے جو آپ نے حضرت ہندہؓ سے فرمایا تھا۔ (تم ابوسفیان کے مال سے) اتنا لے لو جو تمہارے اور تمھارے بچے کے لئے کافی ہو

آپ کے اس ارشاد سے عورت کو اپنی اور اپنے بچے کی ضرورت کے بقدر شوہر کے مال میں سے لے لینے کی اجازت ثابت ہوتی ہے۔ شوہر اجازت دے یا نہ دے۔

(۳) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی پر غلام کا وہ نفقہ بھی ضروری ہے، جس کی اس میں استطاعت نہ ہو، اسی طرح اس کا کپڑا بھی، جس کا ثبوت حضرت ابو ہریرہ کی حدیث سے ملتا ہے۔ (الکافی ابن قدامہ: ج ۳ ص ۳۸۸)

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے معلوم ہوا کہ خلیفہ کے فرائض میں سے یہ بھی ہے کہ اہم کاموں اور شعبوں کے لئے مناسب افراد کا انتخاب کرے، اس انتخاب میں ان کی امانت داری سچائی اور اخلاص کو مدنظر رکھے۔

(۲) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شادی کے سلسلہ میں مسلمان نیک بیوی کے انتخاب کی کوشش کرے، آپ ﷺ کا ارشاد یاد رکھے۔ ''بھلے آدمی بیوی کی دینداری کو دوسری

چیزوں پر ترجیح دو۔'' اللہ تعالیٰ نے ان بیویوں کی اس طرح تعریف کی ہے:

فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ

(النساء:۳۴)

تو جو نیک بیویاں ہیں وہ مردوں کے حکم پر چلتی ہیں اوران کے پیٹھ پیچھے خدا کی حفاظت میں (مال وآبرو کی) خبرداری کرتی ہیں۔

نیک مومن بیوی کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ اپنے فرائض کے حدود کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ اوراپنے ایمان ونیکی کی وجہ سے بیوی ہونے کے معانی کو پوری طرح جانتی ہے، شوہر بیوی کے مقدس رشتے کی اس کی موجودگی اور عدم موجودگی دونوں صورتوں میں حفاظت کرتی ہے۔

(۳) حدیث سے شوہر کی خدمت، بچوں کی تربیت ونگرانی کے بوجھ کو اٹھانے کی رہنمائی ملتی ہے۔ عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں وذمہ دار ہے۔ اس لئے کہ اس میں نرم دلی، مہربانی، رقت قلب اور بچے کی ضروریات کو قبول کرنے اور پورا کرنے میں امتیازی شان پائی جاتی ہے۔

(۴) حدیث نوکروں اور غلاموں کے ساتھ اچھے سلوک کی تعلیم دیتی ہے۔ ایسا سلوک کہ ان کو بھائی کے مرتبہ کو پہنچادے اورانھیں اپنی ذمہ داری کو مال اور گھریلو کام میں امانت کے ساتھ ادا کرنے پر آمادہ کرے، حتیٰ کہ وہ اپنے کو اس خاندان کا ایک فرد تصور کریں اور یہ سمجھیں کہ ان پر گھر کے نظام کو ترقی دینے کی ایسی ہی ذمہ داری ہے جیسی کہ دوسرے افراد خاندن پر۔

حدیث - ۲۹

رعیت کے ساتھ انصاف

حدثنا شیبا بن فروخ حدثنا ابوالاشهب عن الحسن قال عاد عبداللّٰه بن زیاد معقل بن یسار المزنی فی مرضه الذی مات فیه، قال معقل: انی محدثك حدیثاً سمعته من رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم لوعلمت ان لی حیاة ما حدثتك وانی سمعت رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم یقول: "مامن عبد یسترعیه اللّٰه رعیة یموت یوم یموت وهوغاش لرعتیه الاحرم اللّٰه علیه !لجنة۔

(صحیح بخاری: کتاب الاحکام، باب من استرعیٰ رعیۃ فلم ینصح، صحیح مسلم، کتاب الایمان)

"شیبان بن فروخ ابوالاشہب اور انھوں نے حضرت حسن کے حوالہ سے بیان کیا عبید اللہ بن زیاد معقل بن یسار مزنی کے مرض وفات میں ان کی عیادت کو گئے، تو حضرت معقل نے کہا میں تم سے ایک حدیث بیان کروں گا جس کو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ابھی میری زندگی باقی ہے تو میں تم سے یہ حدیث نہ بیان کرتا۔ بلاشبہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا ہے کہ "جس بندے کو بھی اللہ تعالیٰ کسی نوعیت کا راعی (حاکم) بناتا ہے اور وہ اس حال میں مرتا ہے کہ اپنی رعیت کے ساتھ دھوکہ کیا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ جنت حرام کردیتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰاَیُّهَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اَطِیۡعُوۡاللّٰهَ وَاَطِیۡعُوۡا الرَّسُوۡلَ وَاُوۡلِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ، اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا۔ (النساء:۵۹)

''مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔''

قرآن کریم اطاعتِ خداوندی کو اصل قرار دیتا ہے اور اطاعت رسول بھی اصل ہی کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لئے کہ رسول تو خدا کے بھیجنے سے آئے ہیں اور حاکم کی اطاعت کو اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کے تابع بناتا ہے۔ اس لئے کہ حاکم کی اطاعت شرعی فریضہ میں شامل ہے جو اللہ ہی کے حکم سے ہے، صحیحین میں حضرت اعمش سے حدیث مروی ہے:

انما الطاعة فی المعروف'' (اطاعت صرف نیک اور بھلے کام میں ضروری ہوگی) صحیحین ہی میں حضرت قطان کی حدیث ہے: السمع والطاعة علی المرء المسلم فیما احب اوکرہ مالم یؤمر بمعصیة اللہ۔ (جب تک کسی گناہ کا حکم نہ دیا جا رہا ہو بندہ مومن پر حاکم کی اطاعت ضروری ہے) (فتح الباری ج ۱۳ ص ۱۲۱) چاہے تعمیل حکم پسند ہو یا ناپسند ہو۔ اور جب گناہ کا حکم دے تب اطاعت نہیں ہے۔ حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا (حاکم) کی اطاعت وفرمانبرداری کرو خواہ تم پر ایک ایسا حبشی غلام حاکم بنا دیا جائے جس کا سر کشمش جیسا چھوٹا ہو۔ (فتح الباری ج ۱۳ ص ۱۲۱)

اسلام حاکم اور ذمہ دار کی اہمیت پر برابر زور دیتا رہا ہے اور اس کے حاکمانہ اختیارات اور صلاحیتوں کو لوگوں میں واضح کرتا رہا ہے تاکہ معاملات طے ہوتے رہیں اور لوگوں کو حدود معلوم ہوں، اور زندگی کی کشتی صحیح رخ پر سمجھ بوجھ کے ساتھ چلتی رہے اور اسلامی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ ہو، ہر شخص اپنی ذمہ داری اور دائرہ کار کو جانتا ہو اس پر امانت کا بوجھ ہے اس کو پہچانتا ہو، اس کو معلوم ہو کہ اپنی ذمہ داری اور امانت کے بارے میں دنیا و آخرت دونوں جگہ باز پرس ہوگی، اسی بنیاد پر امیر کو حق دیا گیا ہے کہ رعیت پسند و ناپسند دونوں صورتوں میں اس کی اطاعت کرے سوائے اس کے کہ وہ گناہ کا حکم دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا! جو شخص اپنے حاکم میں ایسی کوئی بات دیکھے جو اس کو ناپسند ہو تو صبر سے کام لے اس لئے جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہو کر مرے گا وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔ (فتح الباری ج ۱۳، ص ۱۲۱) اسلام نے حاکم کو اہمیت دی تو اس پر ادائے امانت کی ذمہ داری بھی ڈالی، رعیت کے ساتھ بہی خواہی اور اخلاص کا معاملہ کرنے پر

بہت واضح الفاظ اور آمادہ عمل کرنے والی عبارتوں میں ابھارا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جس بندے کو بھی اللہ تعالیٰ کسی رعیت کا حاکم بناتا ہے تو اگر وہ اس حال میں مرتا ہے کہ اپنی رعیت کی حق تلفی کی ہے، اس کو دھوکا دیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کر دیتا ہے۔'' اس فرمان نبوی کی رو سے اسلام ہر فرد کو شریعت الٰہی اور سنتِ رسول ﷺ کا امین بنا دیتا ہے، اس کے دین وایمان کا امین بنا دیتا ہے، اپنے نفس وعقل کا امین بنا دیتا ہے، اس کی جماعت اور ماتحتوں کا امین بنا دیتا ہے۔ دنیا وآخرت کے انجام کا امین بنا دیتا ہے۔ یہ حدیث بہترین توجہ ناموں میں سے ایک ایک توجہ نامہ ہے۔ معقل مزنی جلیل القدر مشہور صحابی ہیں، وہ بہت سخت بیمار پڑے تو فکر مند ہوئے کہ قول وفعل کی امانت کے بارے میں کس طرح سبکدوش ہوں، آپ ﷺ کی حدیث کی امانت کو حکام تک کسی طرح پہنچائیں، وہ اسی فکر میں تھے اسی اثناء میں حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں بصرہ کے گورنر عبیداللہ بن زیاد، ان کے پاس آئے تو ان کو یہ امانت پہنچا دی۔

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے ان (عبیداللہ بن زیاد) سے کہا کہ میں تم سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں، اگر میں حالت موت میں نہ ہوتا تو تم سے یہ حدیث نہ بیان کرتا۔ پھر حدیث بیان فرماتے ہیں ''مامن أمیر یلی أمر المسلمین ثم یجھد لھم وینصح الالم یدخل معھم الجنة'' (جو شخص بھی مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار بنے پھر ان کے لئے محنت ومشقت نہ اٹھائے ان کا بہی خواہ نہ ہو تو وہ ان کے ساتھ جنت میں نہیں داخل ہوگا۔)

حضرت معقل کا یہ کہنا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں ابھی زندہ رہوں گا تو تم سے یہ حدیث نہ بیان کرتا۔ شاید اس اندیشہ سے ہو کہ ان کو اس صورت حال سے قبل اپنی جان کا خطرہ ہو، انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ ان کے پاس جو علم ہے اسے لوگوں کو بتا دیں تا کہ وہ اس علم کے ضائع ہو جانے کا سبب نہ بنیں، صورت حال ادائے امانت کی فکر واہمیت کی تصویر کشی کر رہی ہے۔

یہ حدیث حاکم کی امانت وذمہ داری کے حدود کو واضح کرتی ہے، اس سلسلہ میں دوسری حدیثیں بھی وارد ہوئی ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ نے اس موضوع پر (السیاستہ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیۃ) کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے، اس میں انھوں نے حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا کہ (جس نے مسلمانوں کے کسی معاملہ کا کسی کو ذمہ دار بنایا، ایسی صورت میں کہ اس کام کے لئے بہتر شخص موجود تھا تو اس نے اللہ اور اس کے رسول کی خیانت کی، اس حدیث کو حاکم نے اپنی

صحیح میں روایت کیا ہے بعض لوگوں نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے ابن عمر سے فرمایا تھا، حضرت عمرؓ نے فرمایا! ”جو شخص مسلمانوں کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنایا گیا پھر اس نے کسی شخص کو محض اپنی دوستی یا رشتہ کی وجہ سے کوئی عہدہ دے دیا تو اس نے اللہ۔ کے رسول اور مسلمانوں کی خیانت کی۔

علامہ ابن تیمیہؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں، اس حدیث کی رو سے عہدوں کے اہل اور مستحق لوگوں کی تلاش شہروں کے ان احکام کے ذریعہ سے ضروری ہے جو خلیفہ اور قاضیوں کے قائم مقام ہوتے ہیں، وہ لشکروں کے کمانڈر ہوں کہ فوجی دستوں کے سپہ سالار، ایسے ہی صیغۂ مالیات کے وزراء اور سکریٹری وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے ضروری ہے کہ جو بہتر سے بہتر شخص ملے اس کو نائب و عامل بنائے حتیٰ کہ ائمہ مساجد اور موذنوں قرأ، اساتذہ، حج کے امیر وغیرہ سبھی کے تقرر میں اس کا لحاظ کرنا ہوگا۔

جو شخص بھی مسلمانوں کے کسی کام کا ذمہ دار بنے اس پر لازم ہے کہ اپنے ماتحتوں کے تقرر میں اس کا خیال رکھے، کسی شخص کو اس کی درخواست و مطالبہ کی بناء پر نہ مقرر کرے، اگر وہ کسی رشتہ، دوستی یا اپنے ہم خیال ہونے کی وجہ سے یا اپنے مسلک یا ہم جنس مثلاً عربی یا فارسی، ترکی رومی ہونے کی وجہ سے اہل اور مستحق پر ترجیح دے گا یا رشوت کے سبب خواہ وہ مال کی شکل میں ہو یا کسی اور نفع وغیرہ کی صورت میں، یا دل میں اہل کی طرف سے کینہ و ناراضگی کی وجہ سے، غیر مستحق کو ترجیح دے گا تو یہ اللہ اور اللہ کے رسول اور مسلمان کے ساتھ خیانت کا مرتکب ہوگا، اور اس کا شمار اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مخالفین میں ہوگا۔

يَآاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَخُوْنُوْا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمَانَاتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (الانفال:۲۷)

”اے ایمان والو! نہ تو خدا اور رسول کی امانت میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور تم (ان باتوں کو) جانتے ہو۔“

خلفائے بنو عباس میں سے کسی نے علماء سے کہا کہ اس ذمہ داری کے سلسلہ میں کوئی عملی نمونہ بیان ہو تو بیان کریں۔ انھوں نے جواب دیا حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان سے کسی نے کہا امیر المؤمنین خلیفہ ہونے کی بعد تو آپ نے اپنے گھر والوں کو فاقے میں

ڈال دیا، ان کو آپ نے فقیر بنا کر رکھ دیا، ان کے لئے کچھ بھی باقی نہ رکھا، یہ سن کر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا ان کو ہمارے پاس لاؤ، جب وہ لائے گئے تو دس کم عمر اہل خاندان تھے جب ان کو دیکھا تو آنکھیں اشک بار ہوگئیں اور ان سے کہا، اے میرے پیارے بیٹو! ہم نے تم سے تمھارا کوئی حق روکا نہیں ہے اور لوگوں کا جو مال لے رہا ہوں اس کو تمھیں دوں اس کا مجھے کوئی حق نہیں، تم لوگ دو قسم کے لوگوں میں سے ایک ہو، یا تو نیک ہو اور اللہ تعالیٰ نیکوں کا نگہبان ہوتا ہے، یا نیک نہیں ہو تو ایسے شخص کے لئے جو نیک نہ ہو ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑ سکتا جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مدد لے، تم ہمارے پاس سے چلے جاؤ، واقعہ بیان کرنے والے صاحب کہتے ہیں کہ اس تقویٰ اور رعیت کے ساتھ عدل وانصاف اور احساس ذمہ داری کی برکت سے ہم نے دیکھا کہ ان کے بعض لڑکوں کے پاس سو گھوڑے تھے۔

بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جب امانتیں ضائع کی جائیں تو قیامت کا انتظار کرو، آپ سے پوچھا گیا اللہ کے رسول امانت کا ضائع کرنا کس طرح ہوگا۔ آپ نے فرمایا: ''جب ذمہ داریاں اور معاملات نااہلوں کے حوالہ کئے جانے لگیں۔''

ایک دوسرا قصہ بھی قابل ذکر ہے جو نگرانی وحکومت کی حقیقت کو واضح کرتا ہے، ابو مسلم خولانی حضرت امیر معاویہؓ کے پاس آئے تو اے مزدور کہہ کر سلام کیا۔ ''السلام علیکم ایھا الأجیر'' حاضرین نے کہا امیر کہہ کر سلام کرو (السلام علیك أیها الأمیر) اس تنبیہ کے بعد انھوں نے اے مزدور کہہ کر سلام کو دہرایا، انھیں پھر کہا گیا کہ اے امیر کہہ کر سلام کرو، تین مرتبہ اس سلام وتنبیہ کی تکرار ہوئی تب حضرت امیر معاویہؓ نے کہا، ابو مسلم کو چھوڑ دو، وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کو زیادہ جانتے ہیں، امیر معاویہ کے الفاظ سن کر انھوں نے کہا، تم مزدور ہو تمھیں اللہ تعالیٰ نے رعیت کی نگرانی کے لئے مزدور رکھا ہے۔ جیسے وہ اپنے ان الفاظ سے آپ ﷺ کے اس ارشاد کو یاد دلا رہے ہوں ''کوئی بھی ایسا حاکم جس کو اللہ تعالیٰ کسی رعیت کا نگراں بنائے اور وہ اس کو دھوکہ دے تو اللہ تعالیٰ موت کے بعد اس پر جنت کو حرام کردے گا۔''

یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ مخلوق اللہ کی غلام ہے اور حکام اس کے غلاموں پر اس کی طرف سے نائب ہیں وہ اللہ کے غلاموں کی جانوں کے وکیل وذمہ دار ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ دو شریک کار ایک دوسرے کے نائب وذمہ دار ہوتے ہیں۔ پھر یہ حاکم ووکیل جب کسی کو اپنے فرائض اور کاموں کا نائب بنائیں گے اور اس میں زیادہ بہتر اور مناسب آدمی کو بنانے کے بجائے

کہ جو کاروبار کی لائن کیلئے موزوں اور مناسب ہوں، کسی نااہل و ناموزوں کو بنائیں گے تو اس حدیث کے خلاف ہوگا۔ (السیاسۃ الشرعیۃ، ص ۱۸ تا ۲۴)

حدیث کا فقہی پہلو

(۱) حاکم کا فرض ہے کہ وہ دین و دنیا دونوں کے لئے رعیت کا ہمدرد و بہی خواہ ہو۔

(۲) موت سے پہلے علم کا دوسروں تک پہنچانا فرض ہے۔

(۳) اہل کو چھوڑ کر کسی نااہل کو کسی منصب کا ذمہ دار بنانا سخت ترین خیانت ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے معلوم ہوا کہ منصب و حکومت ایسی امانت ہے جس کا اہل حق تک پہونچانا واجب ہے۔ امارت کے سلسلہ میں آپ ﷺ کا حضرت ابوذر سے فرمانا کہ "وہ ایک امانت ہے جو شخص ذمہ دارانہ طور پر اس بار کو سنبھالے گا وہ تو کامیاب ہے ورنہ یہ امارت قیامت کے روز ندامت و رسوائی کا سبب بنے گی۔" اسی طرف شارہ کرتا ہے۔
(صحیح مسلم، شرح نووی)

(۲) حدیث یہ بتاتی ہے کہ مخلوق اللہ کا بندہ اور غلام ہے اور حکام اللہ کے بندوں اور غلاموں پر اللہ کے نائب ہیں، وہ وکیل کی حیثیت رکھتے ہیں، لہذا حاکموں کو چاہئے کہ بہت دیکھ بھال کر اپنے نائب اور وکیل مقرر کریں اور حتی الامکان نفس کے تقاضے پر عمل کرنے سے بچیں۔ اللہ ھو الموافق۔

حدیث - ۳۰

امانت و ذمہ داری کی اہمیت

عن عدی بن عمیرة الکندی قال: سمعت رسول اللهﷺ یقول: من استعملناه منکم علیٰ عمل فکتمنا مخیطاً فما فوقه، کان غلولاً یأتی به یوم القیامة'' قال فقام الیه رجل اسود من الانصار کأنی انظر الیه فقال یا رسول الله! قبل عنی عملك قال''ومالك'' قال سمعتك تقول کذاوکذا. قال ''وانا اقوله الآن من استعملناه منکم علی عمل فلیجیء بقلیلة وکثیرة فما أوتی منه أخذ وما نہی عنه. انتہی.

''حضرت عدی بن عمیرہ الکندی سے مروی ہے فرمایا: ہم نے حضورﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے ہم نے جس کو کسی کام پر مامور کیا (یعنی زکوۃ وغیرہ کے وصول کرنے کے لئے مقرر کیا) اور اس نے اسمیں سے ایک سوئی یا اس سے بھی چھوٹی چیز چرالی تو یہ خیانت میں شامل ہوگا۔ وہ قیامت کے دن اسے لے کر حاضر ہوگا۔'' عدی کہتے ہیں کہ آپ کا یہ ارشاد سن کر انصار میں سے ایک کالا آدمی آپ کے پاس کھڑا ہوگیا جیسے اس وقت بھی میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔'' اس نے کہا اے اللہ کے رسول آپ نے جو کام ہمارے سپرد کیا ہے واپس لے لیجئے۔ آپ نے فرمایا! ''کیا یہ بات ہے'' اس نے عرض کیا ہم نے آپ کو اس اس طرح کہتے ہوئے سنا ہے، آپﷺ نے فرمایا'' وہ بات میں اس وقت بھی کہہ رہا ہوں کہ ہم نے تم میں سے جس کو کسی کام پر متعین کیا (یعنی وصولی) تو کم زیادہ جو بھی ہو ہمارے پاس لائے، اس میں سے جو اس کو دیا جائے لے لے اور جو نہ دیا جائے اس سے باز رہے۔''

حدیث کا مقصود یہ بتانا ہے کہ جب اسلام امت مسلمہ کی تہذیب وتربیت کے دور سے گذر رہا تھا اور اسلام کے پسندیدہ نقوش کو اجاگر کر رہا تھا تو اس کے نکھارنے کے لئے اس نے جاہلیت کے اثرات کو مٹانا اور اس وقت کے رسوم وعادات ختم کرنا شروع کیا۔

حضرت معقل انصاریؓ نے اپنے مرض وفات میں فرمایا میں تم (عبیداللہ بن زیاد) سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں اگر میں موت کی حالت میں نہ ہوتا تو تم سے نہ بیان کرتا، ہم نے حضور ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ ''جو حاکم بھی مسلمانوں کی معاملات کا ذمہ دار ہو پھر انکے لئے محنت مشقت نہ اٹھائے اور ان کا بہی خواہ نہ ہو تو وہ ان کے ساتھ جنت میں نہ داخل ہوگا۔

(صحیح مسلم، شرح نووی ج ۱۲، کتاب الامارۃ، عون المعبود، شرح سنن ابی داؤد کتاب الخراج)

اسلام اس صاف گوئی کے ساتھ مسلمانوں کو اصلاح کے میدان میں لے کر اترا کہ لوگوں کے دلوں میں جمی ہوئی غلط اور بری رسموں اور عادتوں کا مقابلہ کرے، انھیں بری عادتوں میں سے غلط کمائی اور بلا استحقاق عہدوں کا حاصل کرنا بھی تھا، چنانچہ حضرت معقل ہی کی روایت ہے، کہتے ہیں کہ ہم نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''جس بندہ کو بھی اللہ تعالیٰ کسی رعیت کا حاکم بنائے اور پھر اس کی موت اس حال میں آئے کہ اس نے اپنی رعیت کے ساتھ خیانت سے کام لیا ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کردے گا۔ یہ ایک بالکل نئی بات اور بلند قدر تھی، جس کا پرانے معاشروں میں کہیں وجود نہیں تھا، اسی لئے وہ اس کو اپنی عملی زندگی کے اندر جاری کرنے کو بہت مشکل ودشوار سمجھتے تھے۔ لہذا قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی آمد کے مقصد کو ان لوگوں کے سامنے اچھی طرح بیان کیا، فرمایا:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

(النساء:۶۴)

''اور ہم نے جو پیغمبر بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ خدا کے فرمان کے بعد اس کا حکم مانا جائے۔''

ان کے ایمان کے لئے اتنا کافی نہیں کہ اپنے معاملات اللہ کے رسولؐ کے پاس صرف اس لئے لے جائیں کہ وہ مسلمان سمجھے جائیں، بلکہ آپ کے حکم کو پوری خوش دلی کے ساتھ قبول کریں اور اس کے لئے تیار ہوں، اسی لئے قرآن کریم نے بہت صاف صاف کہہ دیا کہ اپنے

اختلافات اور جھگڑوں میں جب تک آپ ﷺ کو حَکَم نہ بنائیں اور پھر بے تکلف آپ کے فیصلہ کو مان نہ لیں مؤمن صادق نہیں ہو سکتے ہیں فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيماً (سورۃ نساء:۶۵)

''تمھارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمھیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کرو اس سے اپنے دل میں تنگ دل نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں۔تب تک مومن نہیں ہوں گے۔''

اللہ کے رسول ﷺ یہ باتیں مختلف مواقع پر لوگوں کے دلوں میں اتارتے رہے، چنانچہ کھول کر بیان فرمادیا۔''کہ جس کسی کو بھی کسی کام پر متعین کیا اور اس میں سے اس نے ایک سوئی یا اس سے بھی کم درجہ کی چیز بھی ہم سے چھپائی تو یہ خیانت ہوگی اور وہ قیامت کے دن اس کو لے کر آئے گا۔'' غلول یہ ہے کہ محصل کوئی چیز لے کر اپنے سامان میں رکھ لے، یوں غلول کے اصل معنی مطلق خیانت کے ہیں جس طرح بھی خیانت ہو لیکن یہ پھر مال غنیمت میں استعمال کے لئے خاص ہو گیا چنانچہ اس بلیغ لفظ کا ذمہ داروں اور حاکموں کے دلوں پر پورا اثر پڑا اور کیوں نہ ہو جبکہ خیانت کا وبال اتنا سخت ہے جو بیان ہوا، چنانچہ گھبرا کر ایک انصاریؓ نے جو کالے رنگ کے تھے، اٹھے اور عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ آپ اپنا دیا ہوا کام ہم سے واپس لے لیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا کیوں، کیا بات ہے؟ اس نے عرض کیا ہم نے آپ کو ایسا ایسا کہتے ہوئے سنا ہے۔ گویا ان انصاری صحابی کے فہم سے یہ بات بالاتر تھی کہ یہ بارِ امانت اس احتیاط کے ساتھ اٹھانا کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے جبکہ موجودہ معاشرہ ادائیگی امانت کے بارے میں تساہلی کا شکار چلا آرہا ہے۔ ان جلیل القدر صحابیؓ نے محسوس کیا کہ وہ اس میں ناکام ثابت ہوں گے۔ لہذا ارادہ کیا اس سے سبکدوش ہو کر مطمئن ہو جائیں۔

لیکن مربی کامل آپ ﷺ نے یہ فرما کر ''کیوں کیا بات ہے؟'' ان کی ہمت وقوت ارادی کو ابھارا اور اس کی مزید تاکید کی۔ امانت کا تقاضا اور فریضہ وہی ہے جو ہم نے کہا تم جیسوں کو امانت کے قدیم مفہوم کو اب بدلنا چاہئے اور قرآنی مفہوم کے سانچے میں ڈھالنا چاہئے اس

طرح سے آپ گویا پوری امت مسلمہ سے یہ مطالبہ فرما رہے ہیں کہ وہ ان اموراور ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے چنانچہ آپ نے صاف صاف فرمادیا۔''اس وقت بھی وہی بات کہتا ہوں کہ تم میں سے جس کو ہم حامل بنائیں وہ کم زیادہ جو کچھ بھی لا کر حاضر کرے،قرآن بھی اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے:

یٰٓاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔ (سورۃ نساء:۵۹)

''مومنو! خدااوراس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرو۔ جوتم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہوتو اگر خدااور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوتو اس میں خدااوراس کے رسولؐ (کے حکم) کی طرف رجوع کرو۔ یہ بہت اچھی بات ہے اوراس کامآل بھی اچھا ہے۔''

اسلام نے غلول (یعنی خیانت کے ازالہ کی مختلف موقعوں اور مناسبتوں سے مکمل تدبیر کی ہے اوراس پر زور دیا ہے۔ چنانچہ حضرت مسعودؓ انصاری نے فرمایا کہ:''مجھ کو حضور ﷺ نے عامل (محصل) بنا کر بھیجا۔ پھر فرمایا:''ابومسعودؓ جاؤ! میں تم سے قیامت کے دن اس طرح نہ ملوں کہ تم آؤ تمھاری پیٹھ پر چلاتا ہوا صدقہ کا وہ اونٹ ہو جس کو تم نے خیانت کر کے اپنا لیا ہو، (یہ سن کر) ابومسعودؓ نے عرض کیا اللہ کے رسول تب تو ہم نہیں جائیں گے،تو آپ نے فرمایا کہ پھر تم کو مجبور بھی نہ کریں گے۔''

اس تربیت نبوی میں ہر پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے لہذا جہاں اتنی شدت ہے وہیں ذمہ داروں کو کچھ اقتصادی خصوصیات وامتیازات بھی دیئے گئے ہیں۔ حضرت مستورد بن شدادؓ سے مروی ہے کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا۔''جو ہمارا عامل ہو وہ شادی کرلے اوراگر اس کے پاس خادم نہ ہوتو ایک خادم لے لے، رہنے کے لیے گھر نہ ہوتو گھر لے لے، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا مجھے بتایا گیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو اس سے زیادہ لے وہ خائن یا چور ہے۔

یہ حدیث حاکم کی تربیت کے سلسلے میں جو امور حکومت ورعیت یا اپنی خاص ذمہ داری کا

جوابدہ ہے بڑا اچھا توجہ نامہ ہے جو امانت کے وسیع معنی کو سمجھنے اور منصب کی ذمہ داری کو ہر اعتبار سے جاننے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی رہنمائی بھی کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ حاکم کے معاشی معیار زندگی کو بلند کرنے کے ساتھ غرور و گھمنڈ پیدا کرنے والی چیزوں سے بچانے اور لغزش کے دروازوں کو بند کر کے عنداللہ لوگوں کی نظروں میں اس کا مرتبہ بلند کرتی ہے انھیں تربیتی وسائل میں سے ایک بات یہ ہے کہ شریعت نے ہدیہ اور رشوت کے فرق کو واضح کیا ہے۔

ہدیہ اور رشوت کا فرق

حاکم یا ذمہ دار کو ہدیہ کرنا خیانت کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔ اسی لئے اسلام نے اس پر پوری نظر رکھی ہے کہ ہدیہ کے نام پر رشوت کا دروازہ نہ کھل جائے، اس موضوع پر بحث کی اور شک وشبہ کو دور کیا۔

ہشام نے اپنے والد ابوحمید ساعدیؓ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے ازد کے ایک آدمی کو بنوسلیم کے صدقات وصول کرنے پر مقرر کیا۔

جب وہ وصولی کے بعد واپس آیا تو آپؐ نے اس کا حساب لیا، اس نے کہا یہ تمھارا مال ہے اور یہ (ہم کو) ہدیہ ہے، یہ سنکر حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم سچے ہو تو ایسا کیوں نہ کیا کہ تم اپنے باپ ماں کے گھر میں بیٹھے رہتے اور گھر بیٹھے تمھارا ہدیہ تم کو مل جاتا، اسکے بعد آپ نے تقریر فرمائی۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی پھر فرمایا: اُما بعد! میں تم میں سے کسی آدمی کو ان کاموں کے لئے جن کی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ذمہ داری ڈالی ہے، عامل مقرر کرتا ہوں، وہ جب وہ وصول کر کے واپس آتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ تمھارا مال ہے اور یہ مجھ کو ہدیہ کیا گیا ہے، تو اگر وہ سچا ہے تو کیوں نہ اپنے ماں باپ کے گھر میں بیٹھا رہا، اس کا ہدیہ وہیں آ جاتا، خدا کی قسم تم میں سے جو شخص بھی اس میں سے کچھ لے لے گا وہ اس کو قیامت کے دن لے کر حاضر ہوگا۔ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ قیامت کے دن اللہ سے اس طرح ملے کہ بلبلاتا ہوا اونٹ یا ڈکارتی ہوئی گائے یا چلاتی ہوئی بکری اپنے اوپر لادے ہوئے ہو۔ پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا اتنا کہ بغل کی سفیدی نظر آنے لگی۔ پھر فرمایا اے اللہ ہم نے (تیرا حکم) پہونچا دیا، میری آنکھوں نے دیکھا اور کانوں سے سنا۔'' (صحیح بخاری نو وی)

یہ وہ عام تربیتی مواقع ہیں جو مسلمانوں میں بلند قدریں پیدا کرنے کی آپ ﷺ کی تڑپ وبے کلی کو بتاتے ہیں، کام کے اندر اخلاص وامانت داری اور مصلحت عامہ کو پیش رکھنے کی تعلیم دیتے ہیں تاکہ حاکم وذمہ دار مشتبہ چیزوں میں غلطیوں سے محفوظ رہ کر وہ نمونہ بنے جس کی عوام اقتدا کریں وراس کو قدرواحترام کی نظر سے دیکھیں۔

حدیث کا فقہی پہلو

حدیث اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ محصلین وعمال کو ہدیہ لینا حرام ہے اس کا شمار خیانت میں ہے۔ اس لئے کہ اس نے اپنی ذمہ داری وامانت میں خیانت کیا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے ہدیہ کے حرام ہونے کے سلسلہ میں فرمادیا ہے کہ یہ ہدیہ منصب کی وجہ سے مل رہا ہے جو ہدیہ غیر عامل کو ملتا ہے۔ وہ پسندیدہ ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

یہ حدیث اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ عمال کا ہدیہ حرام ہے، اس کا معاملہ دیگر ہدایا کی طرح نہیں ہے جو مباح ہے۔ اس لئے کہ عمال کو ہدیہ اس لئے دیئے جانے کا احتمال قوی ہے کہ عامل وصولی میں رعایت برتے (جس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں) یہ اس کی طرف سے خیانت اور واجب شدہ حق میں کمی کا موجب ہے جس کو مستحقین تک پہونچنا ضروری تھا۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حاکم کو رعیت کے بارے میں احساس ذمہ داری دلانا اور متوجہ کرنا اچھی بات ہے جس سے اسلامی معاشرے کی خدمت ہوگی اور مسلمان حکام کو ترقی حاصل ہوگی۔

(۲) ان ذرائع اور راستوں کا بند کرنا جن سے حاکم کے کام کو بگاڑنے اور معیشت کو ناجائز کردینے کا راستہ کھلتا ہے۔

(۳) حدیث سے نفوس کی تربیت ہوتی ہے اور صحابہ کرامؓ کا اس صحیح طریقہ حکومت کے التزام کا نمونہ سامنے آتا ہے جس سے مقصد تک رسائی کی راہ کھلتی ہے۔

(۴) یہ حدیث خیانت سے نفرت پیدا کرتی ہے اور بندۂ مومن کو مشتبہ چیزوں سے دور رکھتی ہے۔

حدیث - ۳۱

اسلامی نظام میں سزا سے کوئی مستثنیٰ نہیں

عن عائشة رضی اللّٰہ عنها ان قریشااهمهم شأن المراةالمخزومیة التی سرقت فقالوا: ومن یکلم فیها رسول اللّٰہﷺ؟ فقالوا: من یجتری علیه الاأسامة بن زید حب رسول اللّٰہﷺ فکلمة اسامة، فقال رسول اللّٰہﷺ : أتشفع فی حد من حدود اللّٰہ؟ ثم قام فخطب ثم قال: انما اهلك الذین من قبلکم انهم کانوا اذا سرق فیهم الشریف ترکوه واذاسرق فیهم الضعیف اقاموا علیه الحد: وایم اللّٰہ لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یدها۔ (فتح الباری ج۶، ۵۹۳)

''حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ قریش کے لوگ بنومخزوم کی ایک عورت کے بارے میں جو چوری کی مرتکب ہوئی تھی فکر مند ہوئے، آپس میں بات کی کہ اس کے سلسلہ میں حضورﷺ سے کون سفارش کرے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اسامہ بن زید کے علاوہ اس کی اور کون ہمت کرسکتا ہے، وہ آپ کے محبوب ہیں۔ چنانچہ حضرت اسامہؓ نے حضور سے بات کی، آپﷺ نے فرمایا تم اللہ کے حدود میں سفارش کرتے ہو؟ (آپ پر ایسا تأثر ہوا کہ) آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور تقریر فرمائی آپؐ نے فرمایا: تم سے پہلی قومیں اس لئے برباد ہوئیں کہ جب ان میں سے کوئی معزز آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور کوئی کمزور چوری کرتا تھا تو اس پر حد جاری کرتے تھے۔ خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

حق کو قائم کرنے کے لیے عدل وانصاف ضروری ہے کہ عدل سے اطمینان وسکون کی

فضا قائم ہوتی ہے۔امن پھیلتا ہے اور لوگوں کے باہمی تعلقات کو عدل مضبوط کرتا ہے۔ان کے آپسی میل جول میں توازن واعتدال پایا جاتا ہے،آپس میں باہم بھائی چارے اور جوڑ کی فضا بنتی ہے۔اس لئے ہم قرآن کی آیات اور احادیث رسول ﷺ کو عدل وانصاف قائم کرنے کے حکم سے بھری ہوئی پاتے ہیں۔وہ ظلم اور ناانصافی سے ڈراتی اور روکتی ہیں! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔

(النحل:۹۰)

''خدا تم کو انصاف اور احسان اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمھیں نصیحت کرتا ہے تا کہ تم نصیحت قبول کرو۔''

انصاف انبیاءکرام کا شعار ہے۔ارشاد قرآنی ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (الحدید:۲۵)

''ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو یعنی قواعد عدل کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔''

عدل وانصاف کا قائم کرنا کار نبوت کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری ہے جیسا کہ آیت پاک میں ارشاد ہے:

اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ۔

(الشوریٰ:۱۵)

''جو کتاب خدا نے نازل فرمائی ہے میں اس پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تم میں انصاف کروں۔''

اسلام جس عدل کا اعلان کرتا ہے وہ تمام لوگوں کے لئے ہے سب میں برابری کا حکم دیتا ہے۔قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء:۵۸)

اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔

لوگوں سے عداوت و دشمنی، ظلم کا جواز نہیں پیدا کرتی کہ عدل کو نظر انداز کر دیا جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآاَيُّهَاالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعۡدِلُوۡا اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ۔ (المائدۃ:۸)

''اے ایمان والو! خدا کے لئے انصاف کی گواہی دینے کے لئے کھڑے ہو جایا کرو، اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیز گاری کی بات ہے اور خدا سے ڈرتے رہو کچھ شک نہیں کہ خدا تمھارے سب اعمال سے خبردار ہے۔''

جس طرح کسی فرد کے عادل ہونے کا تذکرہ و تعریف ہوتی ہے، اسی طرح عدل پر قائم معاشرہ کی خوبی بھی بیان کی جاتی ہے۔ افراد کا عدل یہ ہے کہ ہر شخص دوسرے کا حق ادا کرے اور معاشرے کا عدل یہ ہے کہ اس کا قانون اور نظم و ضبط ایسا ہو کہ شخص اپنا حق پا سکے، وہ عدل جس کا اسلام مطالبہ کرتا ہے، یہ ہے کہ معاملات و مقدمات میں صحیح اور دوٹوک فیصلہ ہو۔ یہ عدل کمزوروں کے ساتھ انصاف اور دولڑنے جھگڑنے والوں کے درمیان صحیح صحیح فیصلہ کا حکم دیتا ہے، خواہ ان دونوں فریقوں کی صفات ایک دوسرے سے مختلف ہی کیوں نہ ہوں، انصاف بہر حال انصاف ہے، دونوں کی رعایت کرے۔ اور صاحب حق کو حق دلائے گا، بالکل اسی طرح جس طرح کہ حقوق و واجبات کی ادائی، قصاص اور حدود کے جاری کرنے میں عدل نافذ کیا جائے گا۔ اسی لئے حکمتِ خداوندی کے تقاضے سے مدینہ منورہ کے پاکیزہ معاشرہ میں بھی واقعات پیش آئے جن پر شریعت اسلامی کو عملی طور پر نافذ کر کے آئندہ کے لئے نمونہ و مثال قائم کر دی جائے کہ عدل و انصاف اور حد شرعی جاری کرنے میں کسی کی رعایت نہ کی جائے اور آیت کریمہ ''وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقۡطَعُوۡا اَيۡدِيَهُمَا (المائدۃ: ۳۸) اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت، ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو ---- کے حکم پر عملی مثال قائم کر دی جائے، واقعہ یہ پیش آیا کہ فتح مکہ کے وقت بنی مخزوم کی ایک نیک خاتون سے چوری کا جرم سرزد ہو گیا، قریش کو فکر ہوئی کہ اب ان

خاتون کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ اس لئے کہ ان کو یہ یقین تھا کہ حضور ﷺ حد جاری کرنے میں نرمی نہیں برتیں گے۔ اس لئے کہ اسلام سے پہلے بھی ان کے یہاں چور کا ہاتھ کاٹنے کی سزا جاری تھی اور جب قرآن کریم میں یہ حکم نازل ہو گیا تو وہ سزا جاری رہی۔ بنی مخزوم کی ان خاتون کی کچھ سابقہ خطائیں تھیں اور لوگوں کو اس کا علم ہو چکا تھا کہ ان خاتون نے مالیات میں کچھ اس طرح کا تصرف کیا ہے جو اسلامی معاشرہ کے شایانِ شان نہیں۔'' حضرت عروہؓ نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک مخزومی خاتون تھیں جو لوگوں سے سامان مستعار لیتی تھیں پھر انکار کر جاتی تھیں، چنانچہ حضور ﷺ نے حکم دیا کہ ان کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔'' ان خاتون کا اصل نام فاطمہ بن اسود بن عبدالأسد بن عمرو بن المخزوم تھا، یہ جلیل القدر صحابی سلمہ بن عبدالأسدؓ کی بھتیجی تھیں، جو حضور ﷺ سے پہلے ام المؤمنین ام سلمہ کے شوہر تھے۔ (فتح الباری: ج ۱۲ ؍ص ۸۸)

چونکہ ان خاتون کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا جس کے قریش کی ایک اہم شاخ سے گہرے روابط وتعلقات تھے، لہٰذا ان چیزوں نے صحابہ کرامؓ کو آمادہ کیا کہ اس بارے میں فکر کریں اور ان کو بچانے کی کوئی صورت نکالنے کی کوشش کریں کہ حد نہ جاری ہو۔ ان حضرات نے آپس میں مشورہ کیا کہ ان خاتون کے متعلق آپ سے کون بات کرے، کچھ لوگوں نے کہا کہ اسامہ بن زیدؓ کے علاوہ اس کی ہمت کون کر سکتا ہے کہ وہ حضور ﷺ کے محبوب ہیں۔ اسامہؓ ان خاتون کو لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے سلسلہ میں گفتگو کی۔ حضرت اسامہؓ کی یہ جرأت حد شریعت کے نفاذ کے لئے جبکہ وہ حضور ﷺ کے محبوب ترین صحابیؓ تھے بڑی نازک تھی۔ لیکن حضور ﷺ کا مقام ایک نبی عادل کا مقام تھا۔ اسامہؓ کی سفارش سن کر آپ کپکپا اٹھے، غصہ سے آنکھیں سرخ ہو گئیں، چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اللہ کی حدود میں سفارش کرتے ہو؟ حضرت اسامہ وقت کی نزاکت کو فوراً سمجھ گئے۔ افسوس کیا، نادم وشرمندہ ہوئے اور آپ ﷺ سے عرض کیا، اللہ کے رسول ﷺ آپ ہماری معافی کی دعا فرمایئے۔ آپ ﷺ اسامہؓ کی پوزیشن کو سمجھ گئے کہ انھوں نے یہ اقدام مدینہ منورہ کی موجودہ فضا اور بعض صحابہ کرام کے دباؤ سے کیا ہے۔ یہ مسئلہ صرف اسامہؓ کا نہیں۔ بلکہ اس وقت نصیحت اور معیار و پیمانوں کو درست رکھنے اور معاملات کو صحیح ڈھنگ پر کرنے کی تلقین و رہنمائی کا موقع ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ تقریر کے لئے اٹھے، پھر فرمایا: امابعد! ''تم سے پہلے لوگ اس لئے برباد ہوئے کہ اگر ان میں کوئی معزز شخص چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور کوئی مزدور معمولی آدمی چوری کرتا تھا

تو اس پر حد جاری کرتے تھے۔'' اس موقع پر آپ ﷺ واضح فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی امت سب امتوں سے بہتر امت ہے۔ ''کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔'' اور خیر امت ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ امت بہت سی خوبیوں اور امتیازات میں دوسری امتوں سے بلند و ممتاز ہو، انھیں خوبیوں اور امتیازات میں سے انصاف قائم کرنا اور حدود کا جاری کرنا بھی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اس کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے تاکیدی کلمات اور قسم سے کام لیا۔ اور فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔'' اس کے بعد آپؐ نے اس عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

اس زبردست واقعے کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ایک نمونہ ہے کہ قریش کا معزز ترین گھرانا بنی مخزوم و بنی عبد مناف جب اس کی ایک عورت کا ہاتھ کاٹنا واجب ہوگیا تو کسی اور کا کیا ذکر خواہ وہ مال مستعار لے کر اس سے انکار کر دینے کے سبب سے ہو جیسا کہ بعض علماء کی رائے ہے یا چوری کے سبب سے، جو بعض دوسرے علماء کا خیال ہے۔ یہ عورت معزز ترین قبیلہ اور شریف ترین گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور سفارش حضور ﷺ کے محبوب حضرت اسامہؓ فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ حضرت اسامہؓ پر غصہ ہوگئے اور ایسی چیز کے بارے میں جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے ان کے دخل دینے کو ناپسند فرمایا۔ جو حدود کے اندر شفاعت کی صورت میں تھا، اور مثال ساری دنیا کی عورتوں کی سردار، اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کی بیان کی کہ اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹتا۔ اس طرح حضور اکرم ﷺ نے انتہائی ہنگامہ خیز حالات میں بھی شریعت کو نافذ کیا اور یہ واقعہ مخلصانہ توجہ اور اسلامی احکام کی بالادستی قبول کر لینے پر ختم ہوا۔

حضرت عروہؓ حضرت عائشہؓ سے روایت فرماتے ہیں کہ بعد میں اس عورت نے سچی توبہ کرلی اور شادی کرلی۔ اس کے بعد وہ ہمارے پاس آتی تھی اور میں نے اس کی ضرورت حضور ﷺ تک پہنچائی تھی۔ (شرح صحیح مسلم للنووی: ج ۱۱ ص ۱۸۷)

حدیث کا فقہی پہلو

(۱) علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ حاکم کو معلوم ہونے کی بعد حد والے جرم میں سفارش کرنا

حرام وناجائز ہے۔ لیکن حاکم کو معلوم ہونے سے قبل اکثر علماء کے نزدیک سفارش جائز ہے جب کہ جرم کا مرتکب شخص شرارتی ور لوگوں کو ستانے کا عادی نہ ہو۔

رہے وہ گناہ جن میں حد نہیں، بلکہ تنبیہ اور زجر وتوبیخ ضروری ہو تو اس میں سفارش کرنا اور سفارش کو قبول کرنا جائز ہے خواہ حاکم کو معلوم ہوا ہو یا نہ معلوم ہوا ہو۔

(۲) اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ کسی مناسب مقصد کی خاطر بات کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے اگر بلا مطالبہ کے قسم کھائی جائے تو یہ جائز ہے۔ (السیاسۃ الشرعیۃ: ص ۱۸)

(۳) علماء کی تحقیق یہ ہے کہ اس عورت کا ہاتھ چوری کے سبب کاٹا گیا تھا۔ مال عاریتاً لینے کا تذکرہ تو اس کی عادت بیان کرنے کے لئے کیا گیا۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث ہر حاکم کو یہ حکم دیتی ہے کہ وہ لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے، اپنی خواہش کا پیرو نہ بنے کہ سیدھے راستہ سے بھٹک جائے، آپ ﷺ نے اپنے قول وعمل سے یہ واضح فرمادیا کہ عدل وانصاف حاکم کی حکومت کو مضبوط ومقبول بناتا ہے اور جب انصاف کو نظر انداز کر دیا جائے گا تو نظام حکومت کمزور ہوگا اور حکومت ختم ہو جائے گی۔

۲۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ قضا (مقدموں کا فیصل کرنا) اہم دینی فریضہ ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اس اہم فریضہ کو حق کے جاری ونافذ کرنے کے لئے صلاحیت واستقلال کی ضمانت حاصل ہو۔ کہ انصاف کو نافذ کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ حائل ہو، حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے: ''بیشک قضاء طے شدہ فریضہ ہے اور ہمیشہ سے جاری طریقہ ہے لہذا تمھارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو اچھی طرح سمجھ کر فیصلہ کرو۔'' (معالم الثقافۃ الاسلامیۃ)

حدیث - ۳۲

قیامت کے دن عرش کے سائے میں

عن ابی هریرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: سبعة یظلهم اللّٰه فی ظله یوم لاظل الاظله۔ الامام العادل، وشاب نشأفی عبادة ربه، ورجل قلبه معلق فی المساجد ورجلان تحابافی اللّٰه اجتمعاعلیه وتفرقا علیه، ورجل طلبته امرأة منصب وجمال فقال انی اخاف اللّٰه، ورجل تصدق اخفی حتی لاتعلم شماله ما تنفق یمینه، ورجل ذکر اللّٰه خالیاً ففاضت عیناه۔

(صحیح البخاری ((حاشیہ السندی) ج ۱ ص ۱۲۱)

''حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات (قسم کے) آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے (عرش کے) سائے میں رکھے گا، جس دن (قیامت) کوئی اور سایہ نہ ہوگا، (۱) عادل بادشاہ، (۲) ایسا نوجوان جس نے اپنی جوانی عبادت میں گذاری ہو، (۳) ایسا آدمی جس کا دل ہر وقت مسجد میں لگا رہتا ہو، (یعنی ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں رہتا ہو، (۴) ایسے دو آدمی جو آپس میں اللہ کے واسطے محبت رکھتے ہوں، اللہ ہی کے لئے ملتے اور اللہ ہی کے لئے جدا ہوتے ہوں، (۵) ایسا شخص جس کو معزز وخوبصورت عورت بلائے اور وہ جواب دے کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، (۶) ایسا آدمی جو اس طرح چھپا کر صدقہ کرے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دایاں ہاتھ کیا خرچ کر رہا ہے، (۷) ایسا آدمی جس نے تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا اور اس کے آنسو بہہ پڑے۔''

یہ حدیث قیامت کے دن تمام مخلوق کے جمع ہونے اور حساب کی اس گھڑی کی ہولنا کی

کو پیش کرتی ہے، جب سورج بہت قریب آ جائے گا اور اس کی آگ جیسی کرنیں چہروں کو جلا دیں گی جسموں اور جلد کو بھون کر رکھ دیں گی. انسان حیران و پریشان کسی جائے پناہ اور ایسے سائے کی تلاش میں ہوگا، جو اس کو سورج کی جان لیوا گرمی سے بچا سکے۔ اس خوفناک و ہلاکت خیز گھڑی میں اللہ تعالیٰ سات قسم کے لوگوں کو بلائے گا کہ اس کے عرش کے سائے میں آ جائیں، ان میں سب سے پہلا شخص عادل بادشاہ ہوگا، اس زمرہ میں وہ تمام ہی لوگ آ جائیں گے جو مسلمانوں کے کسی کام کے ذمہ دار تھے اور اس میں انصاف سے کام لیا تھا، اہل حقوق کے حقوق صحیح صحیح ادا کیے تھے اس کی تائید مسلم شریف کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ: ''انصاف کرنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کی داہنی جانب نور کے منبر پر ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنے دائرہ اختیار اور اہل وعیال نیز متعلقین میں انصاف کیا ہوگا، جس کام کی بھی ذمہ داری ڈالی گئی تھی اس کا پورا پورا حق ادا کیا ہوگا۔ عادل کی یہ بہترین تفسیر کی گئی ہے کہ عادل وہ شخص ہے جس نے ہر چیز کو اللہ کے حکم کی تابعداری میں اس کے صحیح موقع ومحل پر رکھا ہو اور ذرا بھی کمی زیادتی نہ کی ہو، حاکم عادل کو سب سے مقدم اس لئے کیا کہ اس کا فائدہ عام ہے۔ (فتح الباری: ج ۲ ص ۱۴۴)

اسلام جس عدل کا حکم دیتا ہے وہ مطلق اور عمومی عدل ہے جس میں سبھی لوگوں کو پورے پورے حقوق ملیں کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء:۵۸)

''لوگوں میں باہمی لڑائی اور دشمنی، ظلم اور عدل کو چھوڑنے کا جواز ہرگز نہیں پیدا کر سکتی۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

(المائدۃ:۸)

"اے ایمان والو! خدا کے لئے انصاف کی گواہی دینے کے لئے کھڑے ہو جایا کرو۔ اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیز گاری کی بات ہے اور خدا سے ڈرتے رہو۔ کچھ شک نہیں کہ خدا تمھارے سب اعمال سے خبردار ہے۔"

یہ تو عدل کی ایک مختصر سی صورت بیان ہوئی۔ عدل کا دائرہ بہت وسیع ہے، جس کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ منصب خلافت سنبھالنے کے بعد اپنی پہلی تقریر میں فرماتے ہیں:

"ہمارے نزدیک تمھارا کمزور شخص طاقتور ہے تا آنکہ اس کا حق نہ دلا دوں، تمھارا طاقتور شخص ہمارے نزدیک کمزور ہے جب تک کہ اس سے دوسرے کا حق دلوا نہ دوں۔ یہ اس امام عادل کے عدل کی ایک ادنیٰ سی جھلک ہے جو اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں رہے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گورنروں، حکام اور کارندوں کو انصاف کے ساتھ پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ کام انجام دینے کے ایسے حریص وفکرمند تھے کہ جن لوگوں کو کوئی ذمہ داری دیتے ان کے ساتھ نکلتے کچھ دور ان کی مشایعت کرتے اور ان کو نصیحت کرتے، ہدایت دیتے کہ ان کو اس لئے حاکم نہیں بنایا ہے کہ لوگوں کی خوشنودی حاصل کریں ان کا مال اور جائداد وصول کریں بلکہ ان کو اس لئے بھیجا ہے کہ لوگوں کو اللہ کی کتاب اور سنت رسول ﷺ کی تعلیم دیں اور ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلے کریں اور ان کے حصے برابر لگائیں، تقسیم کے وقت کسی کی حق تلفی نہ ہو، وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے "جس پر اس کا حاکم ظلم کرے وہ اس کے ظلم کی مجھ کو خبر دے تا کہ میں اس سے اس کا بدلہ دلاؤں" جب ان سے حضرت عمرو بن العاصؓ نے یہ عرض کیا کہ امیر المؤمنین اگر حاکم اپنی رعیت کے کسی شخص کی تادیب کرے اس کو سزا دے تو کیا ہم اس سے بدلہ لیں، آپ ﷺ نے فرمایا اس سے کیوں نہ بدلہ لیں جب کہ ہم نے حضور ﷺ کو اپنی ذات کا بدلہ دلاتے دیکھا ہے۔ ایک دن حضرت عمرؓ کا مکہ سے گذر ہوتا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ خادم کھڑے ہیں اور ان کے ملک و سردار کھانا کھا رہے ہیں، کھانے میں خادموں کو نہیں شریک کرتے، حضرت عمر کو غصہ آ جاتا ہے، ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے سرداروں سے کہتے ہیں "کچھ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے

کہ خود کو اپنے خادموں سے برتر سمجھتے ہیں) یہ فرما کر خادموں کو سرداروں کے ساتھ ایک ہی لگن میں کھانا کھانے کا حکم دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی مدت خلافت کی پوری زندگی عدل وانصاف کے درخشندہ واقعات سے بھری ہوئی ہے، جو امام عادل کی سچی تصویر پیش کرتی ہے، آپ لوگوں کے سامنے تقریر کرتے ہیں اور تقریر میں یہاں تک فرماتے ہیں کہ ''اگر تم لوگ میرے اندر کوئی خامی اور کجی دیکھو تو مجھ کو سیدھا کردو'' آپ کے یہ جملے سن کر ایک معمولی مسلمان سامنے آتا ہے اور کہتا ہے ''عمرؓ! اگر ہم نے تمھارے اندر کوئی کجی دیکھی تو ہم اپنی تلواروں سے اس کو درست کردیں گے'' اس مسلمان کے اتنے سخت الفاظ سن کر حضرت عمرؓ اس کے سوا کچھ نہیں فرماتے کہ ''اس خدا کی حمد وثنا بیان کرتا ہوں جس نے عمرؓ کی رعیت میں ایسے لوگ بنائے ہیں جو اس کو اپنی تلوار سے درست کردیں گے۔''

حضرت حسن بصریؒ نے خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو جو خط لکھا تھا، اس خط سے حاکم عادل کی تصویر بہت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے وہ لکھتے ہیں:

''اے امیر المؤمنین اللہ تعالیٰ نے امام کو حق سے ہٹنے والے ہر شخص کو سیدھی راہ پر لانے والا بنایا ہے، ظالم کو صحیح رخ پر چلنے کا حکم دینے والا، ہر بگڑی چیز کو درست کرنے والا کمزور کی طاقت، مظلوم کی دادرسی کرنے والا اور ہر لٹے پٹے غم کے مارے کے غم کو فی الفور دور کرنے والا بنایا ہے۔

امیر المؤمنین امام عادل اپنے بچے پر مہربان باپ کی طرح ہے جس کی ساری تگ ودو بچوں کی خاطر ہوتی ہے، بڑے ہونے پر ان کو سکھاتا پڑھاتا ہے، اپنی زندگی میں ان کے لئے کماتا ہے اور مرنے کے بعد کے لئے جمع کرتا رہتا ہے۔ امیر المؤمنین! امام عادل مہربان ومشفق ماں کی طرح ہے جو اپنے بچے پر نہایت مہربان ہوتی ہے دکھ تکلیف جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھتی ہے، پھر نہایت تکلیف کی حالت میں اس کو جنتی ہے طفل شیر خوار ہونے کی حالت میں اس کو پالتی پوستی ہے، اس کی خاطر رات رات بھر جاگتی ہے، اس کے سکون اور چین سے اس کو سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ایک مدت تک اس کو اپنا دودھ پلاتی ہے پھر دودھ چھڑا دیتی ہے، وہ تندرست وبعافیت رہتا ہے تو خوش ہوتی ہے، اور وہ بیمار پڑتا ہے تو وہ بے چین اور غمزدہ ہوجاتی ہے۔

امیر المؤمنین ! امام عادل یتیموں کے سرپرست وصی کی طرح ہے وہ مسکینوں کا خزانچی ہے، ان کے چھوٹوں کی پرورش کرتا ہے بڑوں کی اعانت کرتا ہے۔ امیر المؤمنین ! امام عادل سینہ کے اندر دل کی طرح ہے، دل درست ہوتا ہے تو تمام اعضاء بھی درست ہوتے ہیں، دل بگڑتا ہے تو تمام اعضاء بھی کمزور اور از کار رفتہ وانکار رفتہ ہونے لگتے ہیں۔

امیر المؤمنین ! امام عادل خدا اور بندوں کے درمیان رابطہ ہوتا ہے، اللہ کا کلام سنتا ہے پھر ان کو سناتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتا ہے پھر ان کو بتاتا ہے اور پہنچاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بنتا ہے اور ان کو اسی کی دعوت دیتا ہے۔ امیر المؤمنین ! آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو اختیارات دیئے ہیں، ان میں اس خادم کی طرح نہ بن جایئے جس کو اس کے آقا نے امین بنایا ہو، مال وعیال کا محافظ بنایا ہو، پھر وہ مال کو تباہ کردے اور اہل وعیال کو بھگا دے، ان کو فقیر ومحتاج بنادے اور مال کو اڑادے۔

امیر المؤمنین ! اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود واحکام اتارے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ گندے اور برے کاموں پر تنبیہ فرمائے۔ جب حاکم خود اس کا مرتکب ہوگا تو تنبیہ کیونکر ہوسکے گی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے قصاص کا حکم دیا ہے، وہ شخص کیونکر قصاص لے گا جو خود ہی قتل کا مرتکب ہوتا ہو، امیر المؤمنین ! آپ موت اور موت کے بعد کی منزل کو یاد کیجئے، اور یہ خیال رکھئے کہ اس وقت آپ کے ہالی موالی موجود نہ ہوں گے، ساتھی ومددگار غائب ہوں گے آپ موت اور موت کے بعد کی زبردست گھبراہٹ کے لئے زادراہ تیار کیجئے۔

امیر المؤمنین ! یاد رکھئے کہ آپ کی اس منزل کے بعد ایک دوسری منزل بھی ہے وہاں آپ کا سونا طویل ہوگا اور دوست احباب ساتھ چھوڑ دیں گے، وہ آپ کو قبر کے گڑھے میں ڈال دیں گے جہاں آپ تن تنہا ہوں گے، لہذا قبر کے لئے وہ چیزیں تیار کیجئے جو وہاں اس دن آپ کا ساتھ دیں جس دن کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے: يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ (العبس: ۳۴۔۳۶) جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا، اپنی ماں اور اپنے باپ سے بھاگے گا، اپنی بیوی اور بیٹیوں سے بھاگے گا۔

امیر المؤمنین ! آپ یاد رکھیں کہ موت کے آنے سے پہلے اور امیدوں کے ختم ہوجانے

سے قبل آپ کو مہلت وموقع ملا ہوا ہے۔ امیر المؤمنین اللہ کے بندوں پر آپ جاہلیت کا قانون نہ چلایئے اور نہ ان کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ ہی کیجئے۔ کمزوروں پر متکبرین کو نہ مسلط کیجئے کہ یہ لوگ مسلمانوں میں کسی رشتہ وقرابت کی پروانہ کریں گے۔ جس کا انجام ہوگا کہ آپ کو اپنا اور ان ظالموں اور متکبروں سب کا بار گناہ اٹھانا پڑے گا، اپنا اور دوسروں کا بوجھ آپ کو لادنا ہوگا۔ امراء وحکام کا وہ عیش وتنعم جس میں آپ پر مصیبت آئے، آپ کو دھوکے میں نہ ڈالے، وہ آپ کی آخرت کی لذتوں کو ختم کر کے مزے اڑا رہے ہیں، آپ اپنے آج کے اختیارات وطاقت کو نہ دیکھئے۔ کل آخرت میں آپ کو کیا اختیارات حاصل ہوں گے۔ اس پر نظر رکھئے جب آپ موت کے پھندے میں آکر، فرشتوں کی ایک بڑی جماعت اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور رسولوں کی موجودگی میں اللہ رب العالمین کے سامنے کھڑے کر دیئے جائیں گے اللہ حی وقیوم کے دربار میں شدتِ خوف وپریشانی سے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی۔''

اس خط کو اس لئے پیش کیا گیا کہ یہ انصاف پسند حاکم کی روشن تصویر پیش کرتا ہے اور حدیث پاک میں اس کو سب سے پہلے کیوں ذکر کیا گیا، اس کی وجہ کو نمایاں کرتا ہے۔ تاریخ اسلامی اور خصوصاً خلفائے راشدین کی تاریخ عادل بادشاہوں کے عدل کی زندہ تابندہ مثالوں اور بے مثال نمونوں سے پر ہے۔ (معالم الثقافة الاسلامیة: ص ۷۷)

سات قسموں میں سے دوسری قسم جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں رکھے گا ایسے وقت میں جب کہ لوگ تنہا تنہا رب کائنات کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ وہ نوجوان ہوگا جس کی جوانی اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت میں پروان چڑھی اور گذری ہوگی، خصوصیت کے ساتھ نوجوان کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ عمر کا یہ وہ دور ہوتا ہے جس میں ہوائے نفس اور قوت شہوانیہ کا غلبہ ہوتا ہے، (ایسا غلبہ کہ جوانی کو حدیث پاک میں پاگل پنے کی ایک قسم سے تعبیر کیا گیا ہے) ایسی صورت میں عبادت کی پابندی اور شوق وجذبہ نہایت مشکل ودشوار کام ہے ایسے میں تقویٰ وطہارت نفس بڑا ہی اونچا مقام ہے ان نفسانی خواہشوں اور جوانی کے طوفانی جذبات کے باوجود اس جوان نے اپنی جوانی اور قوت ونشاط کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگایا (۲) تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اس شرف وفضیلت سے نوازا۔

جوانوں کی یہ پاکیزہ قسم جو زندگی و جواں مردی سے بھرپور ہے اور اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے جذبات شوق رکھتی اور اس پر جوش ولولہ کے ساتھ عمل کرتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت وعنایت سے ایسے کٹھن وقت میں رحمٰن کے سائے کا لطف اٹھائے گی، جس وقت لوگ حیران و پریشان تقدیر کے فیصلہ کے منتظر ہوں گے، نفسی نفسی کا عالم ہوگا اور اللہ کے سوا کوئی ان کا معین ومددگار نہ ہوگا، اس دن کی خوفناک ودل دہلانے والی حالت کا نقشہ اللہ کے رسول ﷺ اس طرح کھینچتے ہیں: جب قیامت کی گھڑی آئے گی تو سورج اتنا قریب آجائے گا کہ بس میل یا دو میل کا فاصلہ رہ جائے گا، سلیم بن عامر کہتے ہیں کہ معلوم نہیں آپ ﷺ نے کون سا میل مراد لیا ہے زمین مسافت بتانے والی میل یا سرمہ کی سلائی جس سے آنکھ میں سرمہ لگایا جاتا ہے (عربی میں سلائی کو میل کہتے ہیں) فرمایا اس قرب کی وجہ سے گرمی کا یہ حال ہوگا کہ لوگ اپنے اپنے اعمال کے اعتبار سے پسینہ میں ڈوبے ہوں گے۔ کسی کا پسینہ ایڑی تک ہوگا کسی کا گھٹنوں تک ہوگا، کسی کا کمر تک پہنچ جائے گا۔ کسی کے منہ تک پہنچ جائے گا اور اس کو لگام لگادے گا۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم نے حضور ﷺ کو لگام لگانے کی بات کہتے ہوئے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا۔'' (تحفۃ الاحوذی ج ۷ر ص ۱۰۵، ۱۰۷)

ایسی جان لیوا گھڑی میں عبادت گذار، متقی و پرہیزگار نوجوان اپنا بدلہ وانعام اس طرح لے گا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے عرش کا سایہ نصیب ہوگا وہ اس خوش بختی وسعادت کا مزہ لے گا، جو اس کے عمل کے بدلے کے طور پر پورا پورا تیار ومہیا کیا گیا ہوگا۔ یہ ترغیب وصلہ اس لئے بیان ہوا کہ نوجوان ابلتی اور جوش مارتی ہوئی زندگی سے بھرپور طاقت ہیں، ان کے رگ وریشہ میں جوش عمل کی بجلی سی دوڑ رہی ہوتی ہے، اور اپنے مقصد کو وہی حاصل کر پاتا ہے جو اپنے رب سے ڈرتا اور تقویٰ اختیار کرتا ہے، اس لئے آپ ﷺ جوانی کی عمر اس کی نزاکت اور اس کے دوررس اثرات و خطرات کو اچھی طرح سمجھتے تھے، لہٰذا اس کے علاج ومداویٰ کے لئے فکرمند رہتے تھے۔

(حضرت عبدالرحمٰن بن یزید سے مروی ہے فرمایا میں حضرت علقمہ اور اُسود کے ساتھ عبداللہ کے پاس حاضر ہوا، عبداللہ نے فرمایا، ہم کچھ نوجوان لوگ حضور ﷺ کے ساتھ تھے ہمیں کچھ ملتا ہی نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے ہم لوگوں سے فرمایا جو شخص استطاعت رکھتا ہو وہ شادی کرلے،

شادی نگاہوں کو نیچی اور زنا سے بہت محفوظ رکھنے والی ہے، اور جو شخص شادی نہ کرسکتا ہو اس کے لئے روزہ رکھنا ضروری ہے کہ روزہ ڈھال ہے۔ بخاری (حاشیہ السندی) ج ۲ / ص ۲۳۸

آپ ﷺ نے اس حکیمانہ انداز سے نوجوانوں کی ہیجانی کیفیت کا عملی اور محبت و عبادت کا شوق پیدا کرنے والے طریقہ سے علاج کیا، آپ نے سمجھ لیا کہ ابن عمر تہجد نہیں پڑھتے۔ آپ ﷺ کے الفاظ نے ان پر ایسا زبردست اثر ڈالا کہ وہ زہد و تقویٰ اور صلاح و عبادت میں مشہور ہو گئے، پوری رات نماز پڑھتے، حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ قریش کے جوانوں میں دنیا کے اندر اپنے نفس پر سب سے زیادہ قابو رکھنے والے عبداللہ بن عمر ہیں۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ ابن عمر فتویٰ دینے میں اپنی دینداری کو مجروح ہونے سے بچانے کے لئے بہت ہی غور و فکر اور احتیاط سے کام لیتے تھے۔ حضرت اسود حضرت عبداللہ سے روایت کرتے ہیں، کہ ہم لوگ نوجوان تھے آسودہ حال تھے، لیکن ہم لوگوں میں اپنے نفس پر قابو رکھنے میں ابن عمر سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔

حضور ﷺ کی تربیت نے ان کے عقل و دل پر نمایاں اور کھلا ہوا اثر ڈالا تھا، حضرت مالک اس شخص کے حوالہ سے کہتے ہیں جس نے ان سے بیان کیا تھا کہ ابن عمرؓ ہر ہر چیز میں حضور ﷺ کی اتباع کرتے تھے آپ ﷺ کے حالات اور معمولات غرض ایک ایک چیز پر غم کے ایسے حریص تھے اور اس کی فکر کرتے تھے کہ اس اہتمام کے سبب اندیشہ ہوتا کہ کہیں آپ کی عقل و دماغ پر اس کا اثر نہ پڑے، حضرت نافع سے پوچھا گیا کہ گھر کے اندر ابن عمرؓ کا کیا معمول ہوتا تھا؟ تو فرمایا کہ بھائی وہ جو کرتے تھے تمھارے بس کی بات نہیں، وہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرتے، وضو اور نماز کے درمیان تلاوت میں مصروف ہوتے اگر کبھی ان کی عشاء کی جماعت چھوٹ جاتی تو پھر رات کا باقی حصہ نوافل ہی میں گذار دیتے، نوجوانوں کی یہی قسم ہے جس پر حضور ﷺ کا ارشاد (ایسا نوجوان جو عبادتِ رب میں پروان چڑھا ہو) منطبق ہوتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ باطل کے مقابلہ میں جوش و جذبہ سے بھرپور نوجوان ایک خدائی طاقت ہیں، جو طاقت بھلائی اور خیر ہی کی طرف چلتی ہے، پوری ہمت و ثبات قدمی کے ساتھ وہ اپنا راستہ حق ہی کی طرف بناتی ہے، قرآن کریم نے اپنے رب پر طاقتور ایمان و عقیدہ رکھنے والے

ان نو جوانوں کی حیرت انگیز مثالیں بیان کی ہیں۔ سورہ کہف میں ایسے قوی الایمان نو جوانوں کا ذکر ہے جنھوں نے اپنے رب پر ایمان لانے کے بعد باطل کا پوری طاقت و ہوشیاری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ فرمایا:

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ نَبَأَهُم بِٱلۡحَقِّ إِنَّهُمۡ فِتۡيَةٌ ءَامَنُواْ بِرَبِّهِمۡ وَزِدۡنَٰهُمۡ هُدٗى وَرَبَطۡنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ إِذۡ قَامُواْ فَقَالُواْ رَبُّنَا رَبُّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ، لَن نَّدۡعُوَاْ مِن دُونِهِۦٓ إِلَٰهٗاۖ لَّقَدۡ قُلۡنَآ إِذٗا شَطَطًا (الکھف :۱۳،۱۴)

''ہم ان کے حالات تم سے صحیح صحیح بیان کرتے ہیں وہ کئی جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے، اور ہم نے ان کو اور زیادہ ہدایت دی تھی، اور ان کے دلوں کو مربوط (یعنی مضبوط) کر دیا جب وہ (اٹھ) کھڑے ہوئے تو کہنے لگے ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا مالک ہے ہم اس کے سوا کسی کو معبود (سمجھ کر) نہ پکاریں گے (اگر ایسا کیا) تو اس وقت ہم نے بعید از عقل بات کہی۔''

یہ نو جوان اٹھے اور باطل کے مقابلہ میں کھڑے ہو گئے، ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا، اور پوری ہمت و جرأت سے کہا: ہمارا رب تو وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے یعنی پوری کائنات پر اسی کی فرمانروائی ہے، ہم اس کے سوا کسی کو معبود سمجھ کر نہ پکاریں گے) اس لئے کہ وہ تنِ تنہا سب کائنات کا مالک ہے۔ اس میں اس کا کوئی بھی شریک اور ساجھے دار نہیں نہ وہ اس کا محتاج ہے۔ اس کھلی ہوئی حقیقت کے بعد بھی اگر ہم نے ایسا کیا تو اس وقت ہم نے بعید از عقل بات کہی۔ ہم حق سے تجاوز کریں گے، اور صحیح راہ سے ہٹ جائیں گے، اس موقع پر باطل کے مقابلہ میں ان نو جوانوں کا موقف بہت کھل کر سامنے آ جاتا ہے اور پوری خود اعتمادی کے ساتھ آتا ہے۔ جس میں ادنیٰ درجہ کا شک و تذبذب نہیں پایا جاتا، نہ ان کے لب ولہجہ میں کوئی کمزوری، ہچکچاہٹ پائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ طاقت و قوت میں بھی قوی اور جوان ہیں ایمان و یقین میں بھی۔ ان کی قوم شرک و بت پرستی کی جس گندگی میں مبتلا ہے اس پر ناپسندیدگی کے اظہار و انکار میں بھی سخت اور ارادہ کے پکے ہیں، نو جوانوں کی یہی قسم قیامت کے دن جب

کوئی سایہ نہ ہوگا اللہ تعالیٰ کے سائے میں ہوگی۔

تیسری قسم جو اللہ تعالیٰ کے سائے میں ہوگی، ایسے لوگوں کی ہے، جن کے دل مسجد میں لگے رہتے ہیں انھیں ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی فکر رہتی ہے اس سے بندہ اور خدا کے اس زبردست تعلق کا اشارہ ملتا ہے، جو عشق ومحبت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ بندہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے لئے مشتاق ومنتظر رہتا ہے مسجد سے نکلتا ہے تو مسجد کے باہر کا سارا وقت نماز وعبادت کے اشتیاق میں گذارتا ہے کہ اذان ہو اور وہ مسجد کی طرف لپکے۔ نہ اس لئے کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کو دنیا کے دوسرے جھمیلوں پر ترجیح دی اور اس کے دل پر محبت خداوندی کا غلبہ ہوا تو اس کا دل مسجد میں ہی لگا رہنے لگا۔ مسجد میں قرب خداوندی اور اطاعت کی لذت پا جانے کے بعد وہ اس سے دور رہنا پسند نہیں کرتا، دیگر بشری ضروریات اور تقاضوں سے مسجد سے باہر ہوتا ہے تو دل مسجد میں اس طرح لگا رہتا ہے جیسے عاشق مڑ مڑ کر اپنے محبوب کی طرف دیکھتا اور اس کے قرب کا مشتاق رہتا ہے۔ حافظؒ کہتے ہیں کہ معلق کے ظاہری لفظ سے یہ تشبیہ مقصود ہے جیسے مسجد میں لالٹین لٹکی ہو۔ اسی طرح اس کا دل برابر مسجد کی طرف لگا رہتا ہے خواہ اس کا جسم مسجد سے باہر ہی کیوں نہ ہو۔

(شرح الزرقانی علی الموطا امام مالک: ج ۴ رص ۴۳۷، ۴۳۸)

یہ وہ موثر ذرائع ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بندہ کے دل اور روح ونفس کو پاک صاف کرنے کے لئے بیان فرمائے ہیں تا کہ بندہ مسجد کی طرف کھنچے اور اس کا دل اس میں نماز پڑھنے کے لئے مشتاق وبیتاب رہے، ان کے دل ودماغ میں ہر وقت یہ بات گھومتی رہے کہ مسجد کے صحن میں فرشتے اس کے منتظر ہیں، خانہ خدا میں نور خداوندی پھیلا ہوا ہے اس کے اندر کے مشک وعنبر میں بسی ہوئی فضا مشام جاں کو معطر کر رہی ہے۔ اور اس بندہ مومن کے دل کو اللہ سے جوڑے ہوئے ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ نماز کے بعد جب تک تم میں کا کوئی شخص اپنی جگہ پر بیٹھا رہتا ہے فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے اللہ تو اس کی مغفرت فرما دے تاوقتیکہ وہ کسی اور کام میں مشغول نہ ہو جائے۔ قتیبہ نے بیان کیا کہ ہم سے بکر بن مضر نے عباس بن عقبہ کے حوالہ سے بیان کیا کہ یحیٰ بن میمون نے ان سے روایت کیا ہے

کہ ہم نے سہیل ساعدی رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا کہ ہم نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص مسجد میں بیٹھا نماز کا انتظار کررہا ہے اس کے انتظار کی یہ مدت نماز میں شمار ہوتی ہے

(شرح الزرقانی علی الموطا امام مالک: ج ۴ ص ۴۳۷، ۴۳۸)

حدیث میں نبوی ﷺ تربیت کا ایک فکر انگیز نمونہ سامنے آتا ہے کہ جب آپ ﷺ نے یہ چاہا کہ اللہ تعالیٰ سے بندہ کا تعلق مضبوط فرمائیں، تو اپنے اس منشا وارادہ کو عملی شکل دینے کے لئے ایک موثر وسیلہ بیان فرمایا کہ اس مسجد سے زیادہ سے زیادہ تعلق رہے، پانچوں نمازیں جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کرنے کی فکر دامنگیر رہے، جماعت سے جڑا رہے تاکہ مسلمانوں کے حالات معلوم کرتا رہے ان کے مسائل میں تعاون ومحبت کا رول ادا کرے اور ہر مسلمان اسلامی معاشرے کی تشکیل میں اس کی ایک مبارک اینٹ ثابت ہو، حدیث سے مسجد اور مسجد میں دل لگا رہنے کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے۔ اگر کسی عذر کی وجہ سے مسجد نہ جاسکا تو مسجد میں دل کا لگا رہنا مسجد نہ پہنچنے کے ثواب سے محروم نہ ہونے دے گا۔ اسی لئے قرآن کریم نے اسلام میں مسجد کی اہمیت کو بیان کیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ، رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ، لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَیَزِیْدَھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ

(النور: ۳۶۔۳۸)

''(وہ قندیل) ان گھروں میں (ہے) جن کے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے بلند کئے جائیں اور وہاں خدا کے نام کا ذکر کیا جائے (اور) ان میں صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہیں (یعنی ایسے) لوگ جن کو خدا کے ذکر اور نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے سے نہ سوداگری غافل کرتی ہے نہ خرید وفروخت، وہ اس دن سے جب دل (خوف اور گھبراہٹ کے سبب) الٹ جائیں گے اور آنکھیں اوپر کو چڑھ جائیں گی۔ ڈرتے

ہیں تا کہ خدا ان کو ان کے عملوں کا بہت اچھا بدلہ دے اور اپنے فضل سے زیادہ عطا کرے۔اور جس کو چاہتا ہے خدا بے شمار رزق دیتا ہے۔"

اذن کا لفظ تو بیان حقیقت کے لئے ہے۔مسجد تو ہے ہی وہ جگہ جس سے اونچی اور بلند کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔وہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی ہے، اس کا نام لیا جاتا ہے۔مسلمانوں کے روشن و پاک دلوں کی دھڑکن سے تسبیح وتقدیس کا زمرہ بلند ہوتا رہتا ہے۔ان مردان خدا کے دلوں سے جو خرید وفروخت کے وقت بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے، نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔کاروبار میں بھی وہ اسی لئے لگے ہیں کہ کمائیں اور کسی کے محتاج نہ رہیں۔وہ اپنی اس مشغولیت میں بھی اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے سے غافل نہیں ہوتے، نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرتے ہیں، زکوۃ کے ذریعہ بندوں کا، ان کو اس دن کا دھڑکا لگا رہتا ہے جس دن دل تھرتھرا اٹھیں گے آنکھیں پتھرا جائیں گی اس لئے کہ وہ دن نہایت ہولناک وخوفناک ہوگا اس دن کی مصیبتوں سے دل ہل جائیں گے۔یہ چونکہ اس دن سے ڈرتے ہیں اس لئے ان کا دل تجارت وکاروبار میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتا۔وہ اس خوف خداوندی کے ساتھ ساتھ اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اچھے عمل کا اچھا بدلہ دے اور اپنے فضل سے بڑھا کر دینے یہ قسم بھی ان میں شامل ہوگی جن کے دل مسجد میں لگے رہتے ہیں۔

چوتھی قسم جو اللہ تعالیٰ کے سائے میں ہوگی، وہ ایسے دو آدمی ہیں جن کی محبت خدا کے واسطے ہو وہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ایک دوسرے سے ملتے اور اسی کے لئے جدا ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے محبت، وہ بہترین ذریعہ ہے جو مادیت، انانیت وتکبر اور مفاد پرستی کا توڑ کرتی ہے اور سعادت وخوشحالی باہم بھائی چارہ اور میل محبت کے تعلقات کو مضبوط کرتی ہے تا کہ اسلامی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ ہو، جس کی اقتدا و پیروی کی جائے اور جب پیچیدہ ومشکل معاملات ومسائل پیش آئیں انسان اسی مثالی معاشرہ سے روشنی حاصل کرے، اسی لئے اسلام نے اس کے لئے متعدد ذرائع اور وسائل اختیار کئے ہیں۔

ابو مسلم خولانیؒ سے مروی ہے کہ مجھ سے معاذ بن جبلؓ نے بیان کیا ہم نے حضور ﷺ

کو فرماتے ہوئے سنا ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا میری عظمت و بڑائی کی بنا پر باہم محبت کرنے والوں کے لئے نور کے ایسے منبر ہوں گے کہ ان پر نبیوں اور شہیدوں کو بھی رشک آئے گا) جس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کو ایسا اونچا مرتبہ حاصل ہوگا کہ اگر انبیاء کرام اور شہداء اعظام اپنے بلند مرتبہ اور علوشان کے باوجود کسی پر رشک کریں تو اللہ واسطے محبت کرنے والوں کے مرتبہ پر رشک کرسکتے ہیں۔ (تحفتہ الاحوذی: ج ۷ رص ۲۷)

آپ ﷺ مسلمانوں میں بھائی چارگی کی فضاء پیدا کرنے اور برادرانہ تعلقات کو بڑھانے کے لئے موقع ومناسبت سے کام لیتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا، میری عظمت و بڑائی کے سبب باہم محبت کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟ آج میں ان کو اپنے سائے میں رکھوں گا جب کہ آج میرے سائے کے سوا اور کوئی سایہ ہے ہی نہیں۔ صحیح البخاری (حاشیہ السندیؒ ج ۷ رص ۵۷) محبت واخوت پیدا کرنے والے انھیں تربیتی وسائل میں سے بعض ایسے واقعات وقصوں کا تذکرہ ہے جو بیدار دل پر اثر انداز ہونے والے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص اپنے بھائی سے جو دوسرے گاؤں میں رہتا تھا ملنے کے لئے چلا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے راستہ میں ایک فرشتہ کو متعین فرمادیا، جب وہ شخص اس فرشتہ کے پاس پہنچا تو فرشتہ نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے، اس شخص نے بتایا کہ اس گاؤں میں میرا بھائی ہے اس سے ملنے جارہا ہوں، فرشتہ نے پوچھا کیوں جارہے ہو؟ کیا اس سے کسی لین دین اور فائدہ کا معاملہ ہے۔ اس شخص نے جواب دیا نہیں، اس سفر سے ہمارا کوئی دنیوی مفاد نفع نہیں مقصود ہے، میں تو اس سے صرف اس اللہ تعالیٰ کے واسطے محبت کرتا ہوں جو بڑی شان وعظمت والا ہے، اس شخص کے اس جواب پر فرشتہ نے کہا مجھے اللہ تعالیٰ نے تمھارے پاس بھیجا ہے اور کہلایا ہے کہ جب تو نے صرف اللہ واسطے اپنے بھائی سے محبت کی تو اللہ تعالیٰ نے تم سے محبت کی۔ (صحیح البخاری (حاشیہ السندیؒ ج ۷ رص ۵۷)

ان نفسیاتی، تربیتی اور اجتماعی وسائل کے ذریعہ حضور ﷺ اپنے اصحاب اور جماعت کو اس مقام ومرتبہ کا بنانا اور تیار کرنا چاہتے تھے کہ وہ جس دن اللہ کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا

اوراس کی ذات کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہے گی، اس دن وہ اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ میں ہوں، آپ ﷺ اس بات پر بہترین طریقہ سے آمادہ فرماتے تھے، اوران موثر ذرائع کو بیان فرماتے تھے جو اخوت کی جڑوں کو مضبوط کریں۔ چنانچہ انھیں (باتوں میں سے یہ کتنی مؤثر ومطابق فطرت بات ہے) سعید بن سلیمانؒ یزید بن نعامہ ضبی کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب آدمی آدمی سے دوستی کرے تو اس کا نام معلوم کرے اس کے باپ کا نام معلوم کرے کہ وہ کس خاندان اورقبیلہ سے تعلق رکھتا ہے؟ یہ سب پوچھ کر دوستی ومحبت کو پائیدار بناتا ہے۔

(تحفۃ الاحوذی: ج ۲ / ص ۷۲)

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص ایمان کا لطف ومزہ اس وقت تک نہیں پاسکتا جب تک وہ آدمی سے صرف اللہ کے لئے نہ محبت کرے، ایسے ہی وہ آگ میں ڈال دیئے جانے کو کفر پر ترجیح نہ دے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے نعمت ایمان سے نواز کر اس کو آگ سے نجات دے دی ہے۔ اسی طرح اللہ اور اللہ کے رسول اس کو تمام چیزوں سے محبوب نہ ہوں۔ صحیح البخاری (حاشیہ السند) ج ۷ / ص ۵۷

پانچویں قسم جو اللہ تعالیٰ کے سائے میں ہوگی وہ ان پاک دامن لوگوں کی ہوگی، جو عورتوں کے فتنہ سے اپنے دامن کو داغدار نہ ہونے دیں، شہوت پرستی، عورتوں کے رجھانے اور شیطان کے جال میں پھنسنے سے محفوظ رہے۔ ایسا آدمی جس کو منصب اور حسن وجمال رکھنے والی عورت نے بلایا ہو اور اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا ہو کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت نے فحش کاری کے لئے بلایا ہو، قرطبیؒ نے یہی معنیٰ مراد لئے ہیں اور وثوق کے ساتھ کسی معنی کو بیان کیا ہے۔ (فتح الباری: ج ۲ / ص ۱۴۴)

نبی اکرم ﷺ اپنی امت کے مزاج وطبیعت کو سمجھتے ہیں اور اپنی امت میں پیدا ہونے والے فتنوں کے اسباب کو جانتے ہیں، آپ دلوں میں پیدا ہونے والے خطرات اور شہوتِ نفسانی کی پوشیدہ صورتوں کو خوب سمجھتے اور جانتے ہیں کہ انھیں موقعوں پر انسان کے قدم ڈگمگاتے ہیں اور یہی چیزیں گناہ میں مبتلا ہونے اور آزمائش میں پڑنے کے لئے خطرناک ہیں، اسی لئے امت کو اس سے ہوشیار رہنے کی تعلیم دی ہے۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ بن عمرو بن فضیل حضور ﷺ سے

روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''ہم نے اپنے بعد مردوں کو نقصان پہنچانے والا عورتوں سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔ (تحفۃ الاحوذی: ج ۸/ص ۳۶۶)

آپ خود سمجھتے ہیں کہ نفس امارہ عورتوں کے ذریعہ میں پڑنے کی راہ جلد پالیتا ہے۔ لہذا آپ ﷺ نے اُن راستوں کے بند کرنے کی تدبیر اختیار فرمائی۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ نے روایت کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہم نے اپنے بعد عورتوں سے بڑھ کر مردوں کے لئے کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔''

ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ کا ایک عورت سے سامنا ہوا جو خوشبو لگا کر مسجد جارہی تھی، حضرت ابوہریرہؓ نے اس سے کہا، اے جبار کی باندی تم کہاں کا ارادہ رکھتی ہو؟ اس نے جواب دیا مسجد کا، حضرت ابوہریرہؓ نے پوچھا تم نے مسجد جانے کے لئے خوشبو لگائی ہے؟ اس نے کہا ہاں! حضرت ابوہریرہؓ نے اس سے کہا ہم نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے، جو عورت خوشبو لگا کر مسجد جائے گی اس کی کوئی نماز اس وقت تک قبول نہ ہوگی، جب تک نہا کر خوشبو دھو نہ ڈالے۔'' (سنن ابن ماجہ: ج ۲/ص ۳۶۶)

اس فتنہ سے بچنا اور دشوار ترین باتوں میں سے ہے جس نے انبیاء کرام، مصلحین امت اور مربیوں کو اس سے بچاؤ کی تدبیروں میں مشغول رکھا ہے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ اللہ کے نبی حضرت یوسف علیہ السلام مختلف آزمائشوں سے گذرے ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ نمایاں اور خطرناک آزمائش عزیز مصر کی بیوی زلیخا کا فتنہ تھا جو منصب اور حسن و جمال کی مالک تھی، قرآن کریم نے اس خطرناک فتنہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَیْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ أَنَّهٗ رَبِّیْٓ أَحْسَنَ مَثْوَایَ إِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظَّالِمُوْنَ۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ أَنْ رَّاٰی بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذَالِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ إِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلِصِیْنَ (یوسف: ۲۳، ۲۴)

''تو جس عورت کے گھر میں رہتے تھے اس نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا اور

دروازے بند کر کے کہنے لگی (یوسف) جلدی آؤ، انھوں نے کہا کہ خدا پناہ میں رکھے وہ (یعنی تمھارے میاں) تو میرے آقا ہیں انھوں نے مجھے اچھی طرح سے رکھا ہے (میں ایسا ظلم نہیں کر سکتا) بے شک ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے اور اس عورت نے ان کا قصد کیا اور انھوں نے اس کا قصد کیا اور اگر پروردگار کی نشانی نہ دیکھتے (تو جو ہوتا ہوتا) یوں اس لئے (کیا گیا) کہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو روک دیں۔ بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے۔''

آج عیش وتنعم کا ماحول و معاشرہ مرد و عورت کے باہم اختلاط وفتنہ سامانیوں کا معاشرہ ہے، جو مسلمان کی زندگی کے لئے نہایت خطرناک معاشرہ ہے۔ اس طرح کے معاشرے اور ماحول میں بالعموم یہ فتنہ پھیلتا ہے، جس کو موجودہ ماحول میں سمجھنا کچھ دشوار نہیں۔ حضرت یوسفؑ اس ماحول میں ایک غلام کی حیثیت سے تھے اور اس ماحول اور عمر کے اس دور میں پرورش پائی تھی جو فتنے کا دور ہوتا ہے۔

یہ بڑی کٹھن اور طویل آزمائش تھی، جس سے حضرت یوسفؑ کو گذرنا پڑا لیکن انھوں نے اس آزمائش کی گھڑی میں پوری مردانگی سے اس کا مقابلہ کیا اور اس سے کامیابی کے ساتھ نکل آئے۔ ماحول کا اثر اور اس کی دلفریبیاں، اس کے گندے ذرائع، ان کی عمر اور عورت کی عمر جس کے ساتھ وہ ایک شاندار محل میں رہتے تھے یہ کوئی معمولی امتحان نہ تھا۔ (تو جس عورت کے گھر میں وہ رہتے تھے اس نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا اور دروازے بند کر کے کہنے لگی (یوسف) جلدی آؤ)

زلیخا کا بہلاوہ کھلا ہوا تھا، یہ بے حیائی اور گندگی اور یہ عورت ابتدائی مرحلے کی نہ تھی بلکہ آخری مرحلے کی تھی، جہاں شہوات نفسانی پر قابو پانا بڑے دل گردے کا کام ہے، لیکن پاکیزہ صفت نوجوان کا جواب، حضرت یوسف علیہ السلام کا جواب جو نہایت عظیم وقوی تھے وہ تھا جس کو قرآن کریم نے اس طرح بیان کیا ہے۔ ''انھوں نے کہا خدا پناہ میں رکھے وہ (یعنی تمھارے میاں) تو میرے آقا ہیں انھوں نے مجھے اچھی طرح سے رکھا ہے میں ایسا ظلم نہیں کر سکتا بیشک ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے۔

یہ جواب اور یہ مثالی عمل ہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ میں رہنے اور اس کی

رحمت سے بہرہ ور ہونے کا سبب ہوگا۔ حضرت یوسفؑ کا قصہ تو بہت پرانا ہے لیکن یہ مثال ہر اس معاشرے میں ہر وقت پائی جاسکتی ہے، جو معاشرہ صالح ہو اور اس کی تربیت مکمل ہو، اور نوجوانوں کی نگہبانی کا پورا خیال رکھا جاتا ہو۔

چھٹی قسم جو اللہ تعالیٰ کے سائے میں اس دن آرام سے رہے گی جس دن کوئی اور سایہ نہ ہوگا، ایسے لوگوں کی ہوگی جنھوں نے چھپا کر صدقہ کیا ہو، کہ ریا ونمود کا شائبہ بھی نہ پایا جائے۔ ''رجل تصدق بصدقة فأخفاها'' ایسا شخص جس نے کچھ صدقہ کیا اور اس کو چھپایا۔ حدیث پاک میں نکرہ کا لفظ لایا گیا ہے کہ خواہ وہ صدقہ تھوڑا ہو یا زیادہ وہ فضیلت دونوں کی یکساں ہے، مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور امت مسلمہ کی مدد کیلئے ہاتھ بڑھانے کی ہمت افزائی کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ (شرح الزرقانی علی الموطا امام مالک: ج ۴/ص ۴۳۹) اسلام نے انفاق کی نزاکت واہمیت کے پیش نظر اس پر ہر اعتبار سے بہت زور دیا ہے کہ خوبیوں سے بھرپور اسلامی معاشرہ تیار کرنے میں اس کو بڑا دخل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (البقرة:۲۶۱)

''جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان (کے مال) کی مثال اس دانے کی سی ہے، جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بالی میں سو سو دانے ہوں اور خدا جس (کے مال) کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے وہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اسی لئے وہ صدقہ کا قانون فرض وضروری حکم کے طور پر نہیں شروع فرماتا بلکہ ہمت افزائی اور شوق دلانے کی صورت میں شروع فرماتا ہے، وہ انسان کے اندر موجود احساسات واثر قبول کرنے کی صلاحیت کو یہ کہہ کر ابھارتا ہے کہ (اللہ تعالیٰ سات قسم کے لوگوں کو اپنے سائے میں رکھے گا) کہ لوگوں کے اندر اس آرام دہ سایہ کے حصول کا شوق پیدا ہو۔ چنانچہ اس پر آمادہ کرنے والے وسائل کے اختیار کرنے پر ابھارتا ہے۔

لہذا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور صدقہ کو چھپانا اس سایہ میں پہنچانے کا ذریعہ قرار پاتا

ہے۔ یہ انداز بیان ترقی پذیر کارگاہِ حیات میں انسان کے ضمیر کو جود وسخا اور داد ودہش کی طرف متوجہ کرتا ہے، اس طرح سے وہ گویا دیتا ہی نہیں بلکہ لیتا ہے، دے کر اپنا مال کم نہیں کرتا بلکہ بڑھاتا ہے۔ اس راہ میں دینے اور بڑھنے کے وہ احساسات جن میں اس نے جوش وحرکت پیدا کی ہے برابر بڑھتا جاتا ہے۔ یہ وہ انفاق ہے جو انسانی احساسات کو برابر بلند کرتا جاتا ہے۔ اس میں شک اور کمی نہیں پیدا ہونے دیتا، وہ انفاق جو خلوت وشرافتِ نفس کو داغدار نہیں ہونے دیتا ہے اور نہ ہمدردانہ جذبات پر بٹہ لگاتا ہے۔ وہ انفاق جو دل کی صفائی اور جذبات شوق کے ساتھ ہوتا ہے وہ وہی انفاق ہوتا ہے جو چھپا کر کیا جائے، جس میں شہرت وریا کاری کا خیال ہی نہ آنے پائے، نہ ہی احسان جتانے کا جذبہ پیدا ہونے پائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتۡبِعُوۡنَ مَآ اَنۡفَقُوۡا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًی لَّهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ۔ (البقرہ:۲۶۲)

''جولوگ اپنا مال خدا کے راستے میں صرف کرتے ہیں پھر اس کے بعد نہ اس خرچ کا (کسی پر) احسان رکھتے ہیں اور نہ (کسی کو) تکلیف دیتے ہیں ان کا صلہ ان کے پروردگار کے پاس تیار ہے اور (قیامت کے روز) نہ ان کو کچھ خوف ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے۔''

انفاق سے اسلام کا منشاء صرف ادائے قرض نہیں ہے نہ محض ضرورت کا پورا کرنا ہی مقصود ہے۔ اسلام کا یہ منشاء قطعاً نہیں بلکہ اسلام کا منشاء خرچ کرنے والے کے دل کا تزکیہ وصفائی ہے، انسانی ہمدردی کے احساسات میں جوش وجولانی پیدا کرنا مقصود ہے کہ وہ محض اللہ کی رضا کی خاطر اپنے غریب بھائی سے ملے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے، اس سے اس کے برادرانہ تعلقات قائم ہوں۔ اس کے دل میں غریب بھائی کی عزت واحترام کے جذبات انگڑائی لیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو یاد کرے، اور اس نے اس کے حکموں پر چلنے کا جو عہد کیا ہے کہ اس نعمت میں بقدر ضرورت کھائے گا، فضول خرچی سے کام نہ لے گا، نہ شہرت ونا موری میں خرچ کرے گا، بلکہ اللہ کی راہ میں خرچ کریگا، نہ دینے سے انکار کرے گا نہ دے کر احسان جتائے گا

بلکہ ہر طرح پوشیدہ رکھے گا کہ اس نے یہ سب کچھ اپنے بھائی کو خوش کرنے اور اس کی مدد کے جذبہ سے کیا ہے، اللہ واسطے اپنے بھائی سے تعلق مضبوط کرنے کے لئے کیا ہے۔ پوری امت مسلمہ سے دوستی استوار کرنے کیلئے کیا ہے تا کہ امت مسلمہ باہم ایک دوسرے کی کفالت کرنے اور مدد کرنے والی قوم کی حیثیت سے پردۂ عالم پر وجود میں آئے، اسلام نے قرآن کریم نے اس اجتماعی تعاون، ایک دوسرے کی فکر و ہمدردی پر متعدد آیات میں ابھارا اور آمادہ کیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن نَّفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُم مِّن نَّذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ وَمَا لِلظَّٰلِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (البقرۃ: ۲۷۰، ۲۷۱)

''اور تم (خدا کی راہ میں) جس طرح کا خرچ کرو یا کوئی نذر مانو خدا اس کو جانتا ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اگر تم خیرات ظاہر کرو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ دو اور دو بھی اہل حاجت کو تو وہ خوب تر ہے اور (اس طرح کا دینا) تمھارے گناہوں کو بھی دور کر دے گا اور خدا کو تمھارے سب کاموں کی خبر ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدقہ چھپانا ظاہر کر دینے سے بہتر ہے اس لئے کہ چھپانے کی صورت میں ریا اور دکھاوا نہیں پایا جائے گا۔ ہاں اگر ظاہر کر کے دینا اس مقصد سے ہو کہ دیکھ کر دوسروں کو بھی شوق و ترغیب دلائی جائے تو اس اعتبار سے صدقہ کا ظاہر کر کے دینا بہتر ہوگا۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ کسطرح صدقہ دینا بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا: ''کسی فقیر کے پاس جاؤ یا جو دانہ دانہ کو ترس رہا ہے اس کی خبر لو۔

ایک حدیث میں ہے کہ چھپا کر صدقہ کرنا اللہ کے غصہ کو بجھاتا ہے۔

ہم سے موسیٰ بن عمیر نے عامر شعبی کے حوالہ سے آپ ﷺ کے قول کے بارے میں کہ (اگر صدقہ کو ظاہر کرو تو یہ بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر فقیر کو دو یہ تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے) راوی کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ آدھا مال لے کر آئے اور آپ ﷺ کے حوالہ کر دیا آپ ﷺ نے پوچھا عمرؓ گھر میں کیا چھوڑ آئے ہو تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ان کے لئے آدھا چھوڑ آیا ہوں لیکن حضرت ابوبکرؓ اپنا سارا مال اٹھا لائے، اس طرح چھپا کر دیا کہ جیسے خود اپنی ذات سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتے ہوں۔ حضور نے پوچھا ابوبکر! گھر میں بچوں کے لئے کیا چھوڑا؟ جواب دیا گھر میں اللہ اور اللہ کے رسول کا وعدہ چھوڑ آیا ہوں۔ حضرت ابوبکرؓ جواب سن کر حضرت عمرؓ رو پڑے اور عرض کیا ابوبکر! جب بھی ہم نے خیر میں آپ سے بڑھنا چاہا آپ ہی ہم سے آگے نکلے۔

(تفسیر ابن کثیر: ج ۱ ص ۴۸۲)

اسلاف کرام کی زندگیاں انفاق کے عجیب وغریب طریقوں اور ان کی دادودہش کی پوشیدہ طور پر خرچ کرنے کی انوکھی اداؤں سے بھری ہوئی ہیں۔ بہت سے مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْناً وَيَتِيْماً وَأَسِيْراً

(الدھر:۸)

''اور باوجودیکہ خود طعام کی خواہش (اور حاجت) ہے فقیروں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔''

کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اگرچہ اپنے عموم معنی میں تمام مومنین صادقین کی صفت بیان کرتی ہے، اس لئے کہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے، سبب خاص کا نہیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ بھی کہا اور بیان کیا جائے یہ تو طے شدہ اور یقینی بات ہے کہ حضرت علیؓ عربوں میں سب سے زیادہ سخی تھے اور ان کے بعد ان کے بیٹوں، پوتوں میں بھی یہ صفت نمایاں رہی۔ چنانچہ مذکور ہے کہ علیؓ زین العابدین رات کی تاریکی میں بذات خود کھانا لے کر نکلتے کہ ان فاقہ زدہ گھروں میں تقسیم کریں جن کی فاقہ کشی کا کسی کو علم نہیں ہوتا تھا، جب ان کا انتقال ہوا تو ان غریب گھرانوں کا پتہ چلا جن کی یہ کفالت کرتے تھے۔

(الامام الصادق (ابوزہرہ، ص:۸۰)

اہل خیر کا یہ خاندان اس طرح کی صفات اور خوبیوں میں صدقہ وعبادت، اخلاقِ کریمہ اور فضائل عالیہ میں مشہور تھا، اور چھپا کر صدقہ کرنا تو ان کا شعار خاص تھا، ابن عینیہ ابوحمزہ

الشمالی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی بن حسین رات کے وقت اپنی پیٹھ پر روٹی اٹھاتے اور اندھیرے میں حاجتمندوں کو پہنچاتے اور فرماتے رات میں چھپا کر صدقہ کرنا اللہ تعالیٰ کے غصہ کو ٹھنڈا کرتا ہے۔

یونس بکر محمد بن یسارؒ سے بیان کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں کچھ لوگ اس طرح کھا پی کر زندگی گذارتے تھے کہ ان کو یہ خبر نہ ہوتی تھی کہ ان کا کھانا کہاں سے آتا لیکن حضرت علی بن حسینؓ کا انتقال ہوا تو رات کے اندھیرے میں ان کو جو کچھ ملتا تھا وہ ملنا بند ہو گیا۔

جریر بن عبدالحمیدؒ عمرو بن ثابتؓ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ جب علی بن حسینؓ کا انتقال ہوا تو ان کی پیٹھ پر داغ نظر آئے جو رات کے وقت بیواؤں کے گھر اپنی پیٹھ پر سامانِ خورد و نوش لاد کر لیجانے کے سبب سے پڑے تھے۔

شیبتہ بن نعامہؒ کہتے ہیں کہ جب علیؓ کا انتقال ہوا تو پتہ چلا کہ وہ ایک سو گھروں کی کفالت کرتے تھے، یہ سن کر ہم نے کہا، اسی لئے ان کو بخیل کہا جاتا تھا کہ وہ تو چھپا کر خرچ کرتے تھے اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ روپیہ پیسہ جمع کرتے جا رہے ہیں، بعض لوگوں نے کہا کہ خفیہ صدقہ کے حصول سے ہم اس وقت محروم ہو گئے جب علی کا انتقال ہو گیا۔

(سیر اعلام النبلاء: ج ۴ رص ۳۸۶)

ساتویں قسم جو قیامت کے ہولناک دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ میں ہوگی اور رب کریم کے لطف و عنایت کا مزہ لے گی، وہ ایسے لوگوں کی ہوگی جنھوں نے تنہائی میں (جہاں اللہ کے سوا کوئی اور دیکھنے والا نہیں) اللہ کو یاد کیا اور (اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کو خیال میں لا کر) رو پڑا آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، آنکھوں سے آنسوؤں کا بہنا ذکر کرنے والے کی دلی کیفیت کے اعتبار سے ہوگا، جتنا خدا کی شان جلالی کے خوف و خشیت کا دل میں اثر پایا جائے گا اسی کے بقدر آنسوؤں کی جھڑی لگے اور اس کے لطف و کرم کی صفات کو یاد کرے گا، تو شوق محبت میں سرمست ہو کر عاشق زار کی طرح روئے گا۔ (فتح الباری: ج ۲ رص ۱۴۷)

اللہ تعالیٰ کے خوف و خشیت سے رونا بارگاہ خداوندی میں پسندیدہ ترین لمحات اور خوش ترین صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے کلام پاک میں بہت معنی خیز اور اثر انگیز اسلوب میں بیان

فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِہٖۤ اِذَا یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ یَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ سُجَّدًا وَّیَقُوۡلُوۡنَ سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنۡ کَانَ وَعۡدُ رَبِّنَا لَمَفۡعُوۡلًا وَیَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ یَبۡکُوۡنَ وَیَزِیۡدُہُمۡ خُشُوۡعًا

(بنی اسرائیل: ۱۰۷۔۱۰۹)

''جن لوگوں کو اس سے پہلے علم (کتاب) دیا گیا ہے جب وہ ان کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار پاک ہے۔ بیشک ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہو کر رہا۔ اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں (اور) روتے جاتے ہیں اور اس سے ان کو اور زیادہ عاجزی پیدا ہوتی ہے۔''

یہ ایسا منظر ہے جو دل کے پردوں کو چھوتا اور احساسات قلب کو بیدار کرتا ہے۔ یہ اُن لوگوں کا حال ہوتا ہے، جنھیں پہلے سے علم دیا گیا ہے (یعنی اہل کتاب) وہ قرآن کریم سنتے ہیں تو ان پر خشیت طاری ہو جاتی ہے اور بے قابو ہو کر سجدہ میں پڑ جاتے ہیں اور اس بے اختیاری کے ساتھ سجدہ میں جاتے ہیں کہ ٹھڈیاں تک زمین سے لگ جاتی ہیں اور اللہ کی عظمت و بڑائی اسکے وعدہ کی سچائی کے احساس سے زبان گنگ ہو جاتی ہے، بول اٹھتے ہیں (ہمارا رب پاک ہے اس کا وعدہ پورا ہو کے رہے گا) ان پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ ان کے سینوں میں خوف وخشیت اور شوق ومحبت کا جو طوفان بپا ہوتا ہے الفاظ اس کو بیان نہیں کر سکتے، ان جذبات کی ترجمانی آنکھوں سے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے ہی کرتے ہیں کہ دل پر کیا کیفیت طاری ہے جس کے بیان سے الفاظ قاصر ہیں، ٹھڈیوں کے بل سجدہ میں پڑ جاتے ہیں اور ان کا خوف بڑھ جاتا ہے) ان کے دل میں گریہ وبکا کی جو کیفیت طاری ہوئی یہی اللہ رب العزت کو پسند ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا: ''ایسا شخص آگ میں نہیں داخل ہوگا، جو اللہ کے خوف سے رو پڑا ہو، اس کا آگ میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا تھن سے نکلے ہوئے دودھ کا دوبارہ تھن میں جانا۔ اللہ کی راہ میں چلنے سے جسم پر پڑنے والا غبار اور جہنم کی آگ دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ (تحفتہ الاحوذی: ج ۶ ر ص ۶۰۰)

آپ ﷺ کی تلاوت کلام پاک سے متاثر ہو کر صحابہ کرامؓ کے رونے کا حال معلوم تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ہم سے فرمایا ''مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ، ہم نے عرض کیا اللہ کے رسول ﷺ ہم آپ کو پڑھ کر سنائیں قرآن تو آپ ہی پر نازل ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں تاہم میں قرآن پاک دوسرے سے سننا پسند کرتا ہوں، چنانچہ ہم نے سورہ نساء پڑھنا شروع کی، جب میں اس آیت پر پہنچا۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَآءِ شَهِيْداً۔

''بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔''

تو آپ ﷺ نے فرمایا اب بس کرو۔ دیکھا کہ آپ کی آنکھیں اشکبار ہیں۔ حضرت فضالہ انصاریؓ اپنے والد کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ میرے والد صاحب ان حضرات میں سے تھے جن کو صحبت رسول ﷺ کا شرف حاصل تھا، حضور ﷺ ان کے پاس بنوظفر میں تشریف لائے آپ نے ایک شخص کو فكيف اذا جئنا من كل امة بشهيد و جئنا بك على هولاء شهيدا پڑھنے کا حکم دیا۔ یہ سن کر آنحضرتؐ رونے لگے۔

آپ ﷺ اپنے صحابہؓ کو کبھی تلاوت کلام پاک فرما کر اور کبھی حدیث پاک کے ذریعہ عملی مثال پیش کر کے رونے کی تربیت دیتے تھے، حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ہم نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''عينان لاتمسهما النار، عين بكت من خشية الله، وعين باتت تحرس فی سبيل الله'' دو آنکھیں ایسی ہیں کہ ان کو آگ چھو تک نہ سکے گی، ایک وہ آنکھ جو خدا کے خوف سے روئی ہو، دوسری وہ آنکھ جس نے اللہ کی راہ میں پہرہ دیتے ہوئے (جاگ کر) رات گذاری ہو۔ (تفسیر ابن کثیر: ج ۱ ص ۷۵۴)

گویا آپ ﷺ اپنی امت کے بہترین لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرتے تھے کہ وہ ان خداترس اور حساس لوگوں میں سے بنیں جن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور ان کے دلوں پر یاد خداوندی سے خوف وخشیت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

حضرت ابوامامہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

لیس شیء احب الی اللّٰہ من قطر تین واثرین قطرة دموع من خشیة اللّٰہ وقطرة دم تحرق فی سبیل اللّٰہ، والاثران فاثر فی سبیل اللّٰہ واثر فی فریضة من فرائض اللّٰہ''

''اللہ تعالیٰ کو دو قطروں اور دو نشانیوں سے بڑھ کر کوئی چیز پسند نہیں، آنسوؤں کا وہ قطرہ جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے بہہ پڑا ہو اور خون کا وہ قطرہ جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہایا گیا ہو اور وہ دو نشان جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں ان میں سے ایک تو وہ جو اللہ تعالیٰ کے فرائض میں سے کسی فرض کی ادائیگی سے پڑا ہو۔''

آپ ﷺ کے اس طریقہ تربیت نے صحابہ کرامؓ پر بڑا اثر ڈالا، وہ حضرات نہایت ادب وخشوع کے ساتھ تلاوت فرماتے تھے اس طرح کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوتی تھی اور خوف خدا سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، ان حضرات میں حضرت ابوبکرؓ کا حال تو عجیب وغریب تھا یہ سب پر فائق تھے، بنوجمح میں ان کے گھر کے سامنے دروازے پر نماز پڑھنے کی ایک جگہ (مسجد) متعین تھی وہاں وہ نماز پڑھا کرتے تھے، آپ بڑے رقیق القلب، نرم دل تھے، قرآن کریم پڑھتے تو اس طرح روتے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، ان کی تلاوت کی اس کشش اور گریہ وبکا کو دیکھ کر محلّہ کے بچے غلام اور عورتیں سب بھیڑ لگا لیتے۔

(تفسیر ابن کثیر: ج ۱ رص ۵۴۷)

آپ ﷺ صحابہ کرامؓ میں خشوع وخضوع پیدا فرمانے، رونے کا عادی بنانے اور جذبات میں نرمی ورقت پیدا کرنے کے لئے مختلف انداز اپناتے اور ان کے شعور واحساس میں جوش وجذبہ پیدا فرماتے تاکہ وہ رحمٰن کے سائے میں رہنے کے حقدار بن سکیں۔ اور حدیث (رجل ذکر اللّٰہ خالیاً ففضت عیناہ) کے مصداق بن جائیں۔ یہ تربیت کا اچھوتا اور مبارک انداز ہے جس پر غور کرنا چاہیے، سوچنا اور مراقبہ کرنا چاہیے۔

حضرت نافع ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے حجر اسود کو بوسہ دیا، اس

کو چھوا، پھر اپنے مبارک ہونٹوں کو اس پر رکھ دیا اور دیر تک روتے رہے، رخ پھیرا تو دیکھا کہ حضرت عمرؓ بھی رو رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عمرؓ! یہ وہ جگہ ہے جہاں آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ (ابن ہشام: ج ا رص ۳۷۳)

آپ ؐ بنوظفر میں موجود ایک چٹان پر بیٹھ گئے آپ ﷺ کے ساتھ ابن مسعودؓ معاذ بن جبلؓ اور دیگر صحابہ کرام بھی تھے۔ آپ ﷺ نے ایک قرآن خواں کو قرآن پڑھنے کا حکم فرمایا۔ انھوں نے پڑھنا شروع کیا، جب وہ اس آیت پر پہنچے "فكيف اذا جيئنا من كل امة بشهيد وجئنا بك هٰؤلاء شهيدا" (بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تمکو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے) تو حضور ﷺ رو پڑے (اور اتنا روئے کہ) آپ کی ریش مبارک دونوں بازوؤں سے لگ گئی۔

اس عملی مثال سے گویا آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کو خوف خدا سے رونے کی تعلیم دے رہے تھے، تلاوت کلام پاک سے متاثر ہونے کا سبق پڑھا رہے تھے تاکہ وہ (رجل ذكر الله خالياً ففاضت عيناه) کے زمرہ میں شامل ہو جائیں اور ان مبارک لوگوں میں شامل ہو جائیں جن کی کلام پاک میں اس طرح تعریف کی گئی ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّداً وَّبُكِيّاً (مریم: ۵۸)

"یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے پیغمبروں میں سے (یعنی) اولاد آدمؑ میں سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا اور ابراہیمؑ اور یعقوبؑ کی اولاد میں سے، اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت دی اور برگزیدہ بنایا اور ان سب کو پسند فرمایا، جب جب ان پر رحمٰن کی آیات تلاوت کی جاتی تھیں تو یہ سب خوب روتے اور سجدے میں گر پڑتے تھے۔"

حدیث کا فقہی پہلو

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ خواہ فرض کی قسم سے ہو یا مستحب کی قسم سے، اس کا

چھپانا بہتر ہے۔لیکن امام نوویؒ نے علماء سے نقل کیا ہے کہ فرض صدقہ کو ظاہر کر کے دینا چھپانے کے مقابلہ میں بہتر ہے (غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسروں کو ادائی فرض کی ترغیب ہو)

(شرح الزرقانی علی الموطا امام مالک: ج ۴ / ص ۴۳۹)

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) یہ حدیث قیامت کے دن سورج کی جلا دینے والی گرمی وتپش اور اس خوفناک دن کے حساب وکتاب اور عذاب کا نقشہ کھینچ کر اس سے بچانے والی باتوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ بندہ اس سے بچنے کی فکر اس دنیا ہی میں کر لے تا کہ اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں رہے اور سورج کی گرمی وتپش سے چھٹکارہ پا سکے۔

(۲) یہ حدیث بندہ مومن کے اندر شوقِ عمل پیدا کرتی ہے تا کہ وہ ان سات قسموں میں سے کسی قسم میں شامل ہونے کی فکر کرے اپنے اندر اچھی صفات پیدا کرے، اپنے کو اخلاق کریمہ سے مزین کرے، نفسانی خواہشوں، وساوس شیطانی اور نفس امارہ کے شر سے بچ سکے۔

(۳) حدیث یہ بھی بتاتی ہے کہ سختی وشدت پسندی کا انداز، دعوت وتربیت، نیکیوں کا شوق نہیں پیدا کرتا، یہ انداز بندہ مومن کو خیرات کے میدان میں آگے بڑھنے پر آمادہ نہیں کرتا۔ بلکہ شوق دلانا، ہمت بڑھانا، ترغیب دے کر نیکی پر ابھارنا، یہ اچھی صفات پیدا کرنے اور نوجوانوں کی تربیت کا بہترین طریقہ ہے اور جذبات خیر پیدا کرنے، نیک لوگوں سے ملنے اور جڑنے کے احساسات کو بڑھانے کا مفید وکامیاب انداز ہے۔ خصوصاً نوعمروں کو کہ وہ سات قسموں میں سے ایک قسم ''شاب نشأفی عبادة ربه'' میں بننے کے شائق ہوں اور اپنی جوانی کو سنواریں۔

(۴) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تربیت کا مثالی طریقہ بندہ مومن کے اندر پوشیدہ شوقِ کمال وجذبہ بلندی کو دلکش اسلوب میں بیدار کیا جائے اور اس کو ابھارا جائے اس طرح کہ ان میں اعتماد ومحبت کی کیفیت پیدا ہو، یہ سات قسموں میں سے کسی قسم میں شامل ہونے کا جذبہ پیدا کرنے کا کامیاب ترین اور مبارک ترین طریقہ ہے۔

حدیث-۳۳

فہم دین کی فضیلت

عن أن شہاب قال حمید بن عبدالرّحمٰن سمعت معاویة خطیباً یقول سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول من یرد اللّٰہ به خیراً یفقهه فی الدّین، وإنما أنا قاسم واللّٰہ یعطی ولن تزال هذه الامة قائمة علی أمر اللّٰہ لا یضرهم من خالفهم حتی یأتی أمراللّٰہ (صحیح البخاری (حاشیہ السندی) ج ا رص ۲۴)

''ابن شہاب نے بیان کیا کہ حمید بن عبدالرحمٰن نے کہا کہ ہم نے حضرت معاویہؓ کو خطبے میں کہتے ہوئے سنا وہ فرمار ہے تھے کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے، اس کو دین کی سمجھ عطا کرتا ہے میں تو تقسیم کرنے والا ہوں، دیتا تو اللہ ہے۔ یہ امت اللہ کے حکم پر برقرار رہے گی۔ ان کی مخالفت کرنے والا ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تا آنکہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہ آجائے۔''

مفہوم

اسلام نے علم اور اسلام کی صحیح سمجھ پیدا کرنے پر بڑا زور دیا ہے جس کا اسلامی علوم وفنون کو مالا مال کرنے اور اسلامی کتب خانہ کو کتابوں سے بھر دینے پر بڑا اثر پڑا۔ اسی کے اثر نے مسلمانوں کو علم کی راہوں کی طرف بڑھایا اور حصول کے میدانوں میں اتارا، ان کو علماء کے حلقہائے درس وتعلیم میں پہنچایا، مسجدوں میں بیٹھ کر پڑھانے والے معلمین کبار کی مجلسوں کی طرف ان کو متوجہ کیا کہ ان کے علمی سرچشموں سے سیراب ہوں، علمی حقائق سے واقفیت پیدا کریں، پھر اپنے فکر وتجربہ کا نچوڑ کتابی شکل میں لائیں تو علم کا مرجع ومصدر بنیں اور علمی دنیا کے لئے قابل فخر کارنامہ بنے رہیں۔

قرآن کریم ایسی آیات کریمہ سے بھرا ہوا ہے جو علم وفہم سلیم پیدا کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ حتیٰ کہ قرآن کریم کی جو سب سے پہلی آیت نازل ہوئی اس کی ابتداء ہی پڑھنے

سے کی گئی۔فرمایا:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (العلق:۱۔۵)

''(اے محمد) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے (عالم کو) پیدا کیا جس نے انسان کوخون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھواور تمھارا پروردگار بڑا کریم ہے۔جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، اور انسان کووہ باتیں سکھائیں جن کا اس کوعلم نہ تھا۔''

یہ آیتیں تعلیم کی حقیقت، اوراس کی اہمیت وضرورت کوکھول کھول کر بیان کرتی ہیں اور لکھنے کو اول درجے پر رکھتی ہیں، اس لئے کہ اہل وسائل تعلیم سے انسانی زندگی میں قلم ہی سب سے مؤثر واہم رول ادا کرتا ہے۔قرآن کریم نے جس وقت اس کی دعوت دی تھی اور قلم کی اہمیت کو بیان کیا تھا۔اس وقت تو انسانی ذہن میں قلم کی اس افادیت کا خیال وتصور بھی نہیں ہوسکتا تھا، جس کو اس وقت ہم انسانی زندگی میں دیکھ اور برت رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ جو ہر نقص وعیب اور ہر کمزوری ولاعلمی سے پاک ومنزہ ہے، وہ علم کی قیمت کوخوب جانتا تھالہذا انسان کو اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو آخری پیغام ہدایت بھیجا، اس میں سب سے پہلے علم کی طرف متوجہ فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ تعلیم کا اصل سرچشمہ اللہ کی ذات اوراس کا نام ہے، اسی لئے فرمایا، اپنے رب کا نام لے کر پڑھو۔علم میں رب کا نام شامل کرنا ہی تفقہ ہے ورنہ......سب جہالت وتباہی کا پیش خیمہ ہوگا، جواس وقت کھلی آنکھوں نظر آ رہا ہے۔

علماء نے تمام لغات میں فقہ کی تفسیر کسی چیز سے واقفیت اوراس کی حقیقت کے فہم سے کی ہے، راغب اصفہانیؒ کا کہنا ہے کہ ظاہری علم سے اس کی حقیقت وگہرائی میں پہنچنا یہ فقہ ہے۔وہ کہتے ہیں فقہ نام ہے کسی چیز کی اندرونی تہہ تک پہنچنا، لہذا جوشخص صرف ظاہری علم سے واقف ہے وہ فقیہ نہیں کہلائے گا۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لٰکِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اُولٰٓئِکَ

سَنُؤْتِيهِمْ أَجْراً عَظِيماً (النساء:۱۶۲)

''مگر جو لوگ ان میں سے علم میں پکے ہیں اور جو مومن ہیں وہ اس (کتاب) پر جو تم پر نازل ہوئی اور جو (کتابیں) تم سے پہلے نازل ہوئیں (سب پر) ایمان رکھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور اور روزِ آخرت کو مانتے ہیں ان کو ہم عنقریب اجر عظیم دیں گے۔''

علم کے اندر رسوخ اور پختگی و گہرائی، دین کا صحیح فہم پیدا کرتی ہے، خیر کے ان تمام نقوش اور راستوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے، جن کو اس حدیث میں بیان کیا گیا، جس کی ہم تشریح کر رہے ہیں۔(من یرد اللہ به خیراً یفقهه فی الدین) حضرت ابودرداؓ اور ابوامامہؓ ان دونوں حضرات نے فرمایا: کہ حضورﷺ سے سوال کیا گیا کہ علم میں ماہر و پختہ کون شخص کہلائے گا؟ آپ نے (جواب میں) فرمایا: ''جن کے ہاتھ نیکیاں کریں، زبان سچائی پر کھلے اور دل اس پر جمارہے اور پیٹ حرام غذا سے پاک رہے وہ شخص صحیح عالم یعنی علم میں پختہ کہلائے گا'' حضرت انسؓ کی ایک روایت میں ''عف بطنه وفرجه'' ہے یعنی پیٹ کو حرام سے پاک رکھا اور شرم گاہ کو حرام کاری سے بچایا) (تفسیر طبری: ج۳ص۱۸۵)

قرآن کریم میں فقہ کا لفظ بیس جگہ وارد ہوا ہے جس میں سے انیس مقامات ایسے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ فقہ سے مراد فہم کی وہ باریک بینی اور علم میں گہرائی ہے جس کی بنیاد پر علم کا صحیح فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ (تفسیر طبری: ج س ص ۱۸۵)

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص علمی رسوخ و پختگی کا مالک ہوگا، وہی دین کا حقیقی فہم حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا اور محکم و متشابہ آیات کے دور رس معانی تک پہنچ سکے گا۔ چنانچہ فرمایا:

يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا (ال عمران:۷)

''وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں۔''

اسی لئے دین اسلام میں عالم و جاہل برابر نہیں ہوسکتے فرمایا:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ (الزمر:۹)

''کہو بھلا جو علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں (اور) نصیحت تو وہی پکڑتے ہیں جو عقلمند ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے اہل علم کو بلند مرتبہ عطا فرمایا ہے اور انکو بے علم پر مقدم رکھا فرمایا:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُو الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ
(المجادلۃ:۱۱)

''جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا ان کے درجے بلند کرے گا۔''

اس بلندی ورفع درجات کی اصل وجہ یہ ہے کہ علم کے بغیر حقیقی دین نہیں حاصل ہوسکتا، فرمایا:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ (فاطر:۲۸)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔''

اس لئے کہ علماء ہی دین کی روح کو سمجھتے ہیں اور قرآن کریم میں غور وخوض کرتے ہیں، لہٰذا ان کو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے اور اس کی قدرت کی کاریگری کو پہچانتے ہیں جو اس کی عظمت و بڑائی کو بتاتی ہیں اور انسان ان سے فائدہ اٹھاتا ہے ان کی باریکیوں کو دیکھتا اور عش عش کرتا ہے۔ یہی چیز ان کے اندر اللہ تعالیٰ کا حقیقی خوف وتقویٰ پیدا کرتی ہے۔ اس لئے کہ علم کے بغیر محض کائنات کے حسن و جمال کا احساس یہ بات نہیں پیدا کرسکتا، خوف کی کیفیت کو تو معرفت حقیقی ہی پیدا کرسکتی ہے جو ان کے اندر (رضیت باللّٰہ رباً وبالاسلام دیناً وبمحمد رسولاً) اللہ تعالیٰ کو اپنا مالک حقیقی اور اسلام کو دین وزندگی کا لائحہ عمل اور حضور ﷺ کو اللہ کا سچا رسول ماننے پر جان ودل سے راضی بناتی ہے ان علماء کا علم ان کو حقیقت تک پہنچنے، متاثر ہونے اور پھر عمل پیرا کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اسی کا ثمرہ ہوتا ہے کہ اقامت صلوۃ یعنی نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرنے، دعوت دین اور علم کی اشاعت اور پھر مال والوں کو راہ خدا میں کھلے چھپے ہر طرح سے خرچ کرنے کی مشقت میں ڈالتی ہے جس کا اشارہ قرآن کریم میں ملتا ہے اور بعض صفات کی طرف حدیث: من یرد اللّٰہ بہ خیراً یفقھه فی الدین) رہنمائی کرتی ہے۔ یہ دین کا فہم بڑا ذمہ دارانہ شعبہ ہے۔ اس لئے کہ فقہ فی الدین کی بڑی ذمہ داری ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: ''فقیہ تو وہ شخص ہے جو دنیا سے بے رغبت ہو اور آخرت کا شوق اور اس کی طلب رکھتا ہو، اپنے دین کی ایک ایک چیز پر نظر رکھتا ہو اس سے واقف ہو، عبادات کا پابند ہو، فقیہ کی ذمہ داری ہے کہ نیکیوں کا حکم دے، برائیوں سے روکے، اور قوم کو اللہ کی پکڑ اور مواخذہ سے ڈراتا رہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً لَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْآ اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (التوبۃ:۱۲۲)

''اور یہ تو نہیں ہوسکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تا کہ دین (کا علم سیکھتے اور اس میں) سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈرسناتے تا کہ وہ حذر کرتے۔''

فقہ کی تشریح میں جو کچھ کہا گیا اس میں صحیح قول اس شخص کا ہے جس نے یہ کہا کہ نکلنے والی جماعت نے اہل دین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت کا اور اللہ کے رسول ﷺ کے صحابہؓ سے عداوت رکھنے والوں کے خلاف اس مدد کا جو علم حاصل کیا ہے اس کو اچھی طرح سمجھے اور اس کی تہہ تک پہنچے اور اسلام کی حقیقت اور سارے دینوں پر اس کے غلبہ کے راز کو سمجھے، اور جس نے دین کو نہیں سمجھا ان کو دیکھے اور معلوم کرے تا کہ پوری واقفیت کے ساتھ اپنی قوم کو ڈرائے اور آگاہ کرے کہ انھوں نے دین کو نہ مانا ان پر اسی طرح عذاب آئے گا جیسا کہ انھوں نے ان لوگوں کا مشاہدہ کیا ہے جو مشترک تھے، دین کو نہیں سمجھا مخالفت کی اور اہل اسلام ان پر غالب آ گئے کہ ہوسکتا ہے اس ڈرانے سے وہ لوگ جنھوں نے خود اس کو نہیں دیکھا، ڈرانے اور بتانے پر ایمان لائیں کہ کہیں ایمان نہ لانے سے ایسے ہی ان پر بھی خدا کا عذاب نہ آ جائے جیسے ان پر آیا جن کی داستان ان کو سنائی گئی۔

یہ حضرت حسن بصریؒ کی رائے ہے اس سے قبل تشریح کی جا چکی ہے نَفَر کا لفظ جب تنہا بغیر صلہ کے بولا جاتا ہے تو عربوں کے نزدیک اکثر اس کے معنی ''جہاد'' کے لئے جاتے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ کا قول حقیقت اور دین کے مزاج سے زیادہ قریب ہے اس لئے کہ یہ دین سرتاپا جہد و جہاد ہی ہے، اس حقیقت کو سمجھے گا جو چلے پھرے، لہٰذا وہ لوگ جو میدان کارزار میں نکلتے ہیں وہ دین کی روح کو سمجھنے کے زیادہ اہل ہیں، اس لئے کہ اس صورت میں دین اسلام

کے اسرار و معانی ان پر زیادہ عیاں ہوتے اور کھلتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ عملی زندگی اور چلت پھرت میں آیات کی عملی تطبیق زیادہ سامنے آتی ہے جو فہم وادراک اور معانی کی صلاحیت کو بڑھاتی جاتی ہے۔ جو لوگ جہاد میں یا سفر میں نہیں جا سکتے وہ مجاہدین اور سفر کرنے والوں سے مل کر فہم دین حاصل کریں، اس لئے کہ نکلنے والوں نے جو دیکھا اور مشاہدہ کیا ہے وہ ان کو حاصل نہیں، لہذا ان سے مل کر ان کے مشاہدہ اور تجربہ کا فائدہ اٹھائیں، اور خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ یہ نکلنا اور جہاد کرنا حضور ﷺ کے ساتھ ہوا ہو، یوں عام طور پر بھی سفر و حرکت سے فائدہ پہونچتا ہے کہ بہت سی چیزیں حالات و ماحول کے مشاہدہ سے سمجھ میں آتی ہیں اور قوت فہم کو بڑھاتی ہیں۔

(تفسیر الطبری: ج ۱۱/ص ۷۰)

تفقہ کے مفہوم میں نفاق اور منافقین کا سمجھنا ان کی سرگرمیوں کو سمجھنا اور اس کے دور رس اور خطرناک نتائج کو سمجھنا بھی شامل ہے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر منافقین نے مختلف قسم کی تدبیریں کیں اور مسلمانوں میں انتشار و بے چینی پیدا کرنا چاہا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی سازشوں کا پردہ حضور ﷺ کی دعا اور ہمہ وقت بیدار اور چوکس رہنے کی برکت سے فاش کر دیا، منافقین کی انھیں سازشوں میں سے ایک یہ ہے جس کو محمود بن لبید نے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہماری قوم کے کچھ لوگوں نے ایک منافق کے بارے میں جس کا نفاق بہت کھلا ہوا تھا، وہ حضور ﷺ کے ساتھ برابر لگا تا رہتا تھا، آپ جہاں کہیں بھی تشریف لے جاتے وہ ساتھ ہوتا، غزوہ تبوک کے موقع پر جب حجر نامی مقام پر صحابہ کرامؓ پیاسے ہوئے اور آپ ﷺ سے پانی نہ ہونے کی شکایت کی تو آپ نے دعا فرمائی، اسی وقت اللہ تعالیٰ نے بادل کا ایک ٹکڑا بھیجا اور اتنا پانی برسا کہ صحابہ کرامؓ سیراب ہو گئے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ معجزہ اور قبولیت دعا کے بعد ہم لوگوں نے اس سے کہا اب تو سچے مسلمان بن جاؤ۔ کیا اب اس سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ اس منافق کو اب بھی نہ توفیق ملی اس نے کہا اس میں معجزہ کی کیا بات ہے، ایک بادل گزر رہا تھا برس پڑا۔

اس طرح صحابہ کرامؓ یہ سمجھنے لگے کہ نفاق کیا ہے اور منافقین کیا چاہتے ہیں (اس کے بعد آپ ﷺ آگے بڑھے، راستے میں ایک جگہ آپ کی اونٹنی گم ہو گئی اس پر زید بن لصیت نامی منافق نے کہا، کیا محمد یہ نہیں کہتے کہ وہ نبی ہیں اور تم کو آسمان کی باتیں بتاتے ہیں، جبکہ انھیں یہ بھی نہیں معلوم ہو سکتا کہ ان کی اونٹنی کہاں ہے، آپ ﷺ کو اس منافق کی بات سے باخبر کیا گیا، تو

آپ ﷺ نے فرمایا: خدا شاہد ہے کہ میں وہی جانتا ہوں جو اللہ تعالیٰ مجھے بتاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے مجھے بتادیا کہ اونٹنی اس وادی میں فلاں گھاٹی میں ہے۔ ایک درخت کے جھاڑ سے اس کی نکیل الجھ گئی ہے، اس نے اس کو روک رکھا ہے، تم جاکر اس کو لے آؤ۔ صحابہ کرامؓ گئے اور اونٹنی لے کر آئے، ایک صحابیؓ اٹھے وہ عمار بن حزمؓ تھے وہ زید بن لصیت منافق کے پاس گئے اس کی گردن پر مارتے ہوئے کہا کہ اے خدا کے دشمن تو ہمارے قافلہ سے نکل جا ہمارے ساتھ نہ رہ۔ فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لِيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ کا یہ بھی ایک مطلب ہے، اسی غزوہ میں آپ ﷺ نے مسجد ضرار کو گرانے کا حکم دیا تھا، اس مسجد کے سلسلہ میں یہ قرآنی آیت نازل ہوئی تھی۔ والذين اتخذوا مسجدا ضرارا وكفراً وتفريقاً بين المومنين وارصادا لمن حارب الله ورسوله (سیرہ ابن ہشام: ج ۳ ص ۵۲۲، ۵۲۳) اور (ان میں ایسے بھی ہیں) جنھوں نے اس غرض سے مسجد بنائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کریں اور مومنوں میں تفرقہ ڈالیں اور جو لوگ خدا اور اس کے رسول ﷺ سے پہلے جنگ کر چکے ہیں ان کے لئے گھات کی جگہ بنائیں۔

آپ ﷺ کا ارشاد: کہ (من يرد الله به خيرا يفقهه فى الدين) تین احکام پر مشتمل ہے جن میں ایک دین میں فہم حاصل کرنے کی فضیلت ہے دوسرے یہ کہ دینے والا اصلاً اللہ رب العزت ہے۔ تیسرے یہ کہ امت کی ایک تعداد حق پر ہمیشہ ہر زمانہ میں قائم رہے گی۔ ابن حجرؒ نے الفتح میں لکھا ہے کہ دین کے اندر فہم حاصل کرنے کے سلسلہ میں حصول فہم کا خیر ہونا محض کوشش سے ممکن نہیں بلکہ اسی کے لئے ممکن ہے جس پر اللہ تعالیٰ فہم کا دروازہ کھول دے۔ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ فہم کا دروازہ کھولیں گے، ایسے لوگ برابر پائے جاتے رہیں گے۔ حتی کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجائے۔ (جس کی احادیث میں پیشن گوئی کی گئی ہے) امام بخاری نے جزم کے ساتھ کہا ہے کہ ان لوگوں سے مراد علماء حدیث ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا اگر ان سے علماء حدیث نہیں مراد تو میں نہیں جانتا کہ اور کون ہوسکتا ہے۔ (۲) خیر کا لفظ نکرہ لایا گیا ہے تاکہ اس میں عموم ہو اور عظمت بھی پائی جاتی ہے۔ موقع بھی اس کا متقاضی ہے، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص دین میں سمجھ نہ پیدا کرے گا یعنی بنیادی مسائل و جزئیات کے علم سے محروم رہے گا وہ بڑی خیر سے محروم رہے گا۔ (تحفۃ الاحوذی: ۷ ص ۴۰۴)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کو خطبہ میں فرماتے ہوئے سنا، انھوں نے فرمایا: میں نے حضورﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا فیصلہ فرماتا ہے اس کو دین کا فہم عطا کرتا ہے۔ حضورﷺ نے ذہین اور کم سن صحابہ کرامؓ کی خداداد فقہی صلاحیتوں کو نکھارنے اور بڑھانے کی طرف خصوصی توجہ فرمائی، حضرت معاذؓ کے ساتھ یہ کوشش برابر جاری رہی۔ حضرت معاذؓ ہی سے روایت ہے مجھ کو حضورﷺ نے یمن بھیجا جب ہم چلے تو کچھ دور جانے کے بعد مجھے واپس بلوایا اور پوچھا ''تمھیں کیوں واپس بلایا اس کا سبب سمجھے، دیکھو بغیر اچھی طرح سمجھے ہوئے کوئی بھی اقدام نہ کرنا کہ ایسا خیانت ہے جیسا کہ قرآن کریم میں وارد ہے: ومن یغلل یأت بماغل یوم القیامة

(سیر اعلام النبلاء: ج ۱ص ۴۴۴۔۴۵۱)

اسی وجہ سے آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کو علم بڑھانے اور اس کے چشمہ سے سیراب ہونے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ایک دوسری مثال حضرت ابوموسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ حضورﷺ نے جب ان کو اور حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا تو ان دونوں حضرات سے فرمایا: (آسانی برتنا، سختی نہ کرنا، لوگوں کو اپنا مطیع بنانا متنفر نہ کرنا آپ کا یہ جملہ بتاتا ہے کہ آپ فقہی معاملات میں آسانی کو پسند فرماتے تھے، دین کے اندر غلو سے کام لینے کو منع فرماتے تھے، ذہین وخداداد صلاحیتوں سے بہرہ ور لوگوں کا قابلیتوں کو پروان چڑھانے کی طرف خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ چنانچہ اس طرح فقہاء کی ایک ٹیم وجود میں آ گئی۔ محمد بن سالم بن ابی حشمہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں آپﷺ کی حیات مبارکہ میں جو لوگ فتویٰ دیتے تھے ان میں سے تین تو مہاجرین تھے، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور تین انصاری تھے، ابی بن کعبؓ معاذؓ اور زیدؓ۔

حضرت انسؓ سے مرفوعاً مروی ہے ''ہماری امت میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے اور امت پر مہربان ابوبکرؓ ہیں اور میری امت میں دین کے معاملہ میں سب سے سخت عمرؓ ہیں اور امت میں سب سے باحیا عثمانؓ ہیں، اور حلال وحرام کو سب سے زیادہ جاننے والے معاذؓ ہیں اور ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اس امت کے امین ابوعبیدہؓ ہیں۔''

حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے، حضورﷺ نے فرمایا: معاذ بن جبلؓ لوگوں میں حلال وحرام کو سب سے زیادہ جانتے ہیں، اسی لئے جب حضورﷺ نے مکہ کو فتح فرمایا تو وہاں عتاب بن اسیدؓ کو چھوڑا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھایا کریں اور معاذ بن جبلؓ کو چھوڑا کہ وہ ان کو قرآن

کریم پڑھائیں اور مسئلہ مسائل بتائیں۔ (سیر اعلام النبلاء: ج ۱ ص ۴۴۴۔۴۵۱)

آپ ﷺ تمام صحابہؓ کو انصاف کے ساتھ، ان کے حسب حال وحی اور علم تقسیم فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعضوں کو توفیق عطا فرماتا ہے کہ انھیں دین کا فہم اور علم میں پختگی حاصل ہو، وہ اس کے رموز واسرار کو سمجھیں اور اس رتبے کو پہنچ جائیں کہ مرجع بن جائیں، ان سے فقہ معلوم کی جائے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ کو جو علم وہدایت دے کر بھیجا ہے اس کی مثال تیز بارش کی سی ہے جو زمین کے اس حصے میں ہوئی جس کا کچھ حصہ اچھا تھا، اس نے پانی کو جذب کر لیا اور بہت سا سبزہ اور گھاس اگایا، کچھ حصہ سخت تھا، اس نے پانی کو روک لیا اس پانی سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو فائدہ پہنچایا انھوں نے پیا بھی اور کھیتوں کی سینچائی بھی کی، کاشت کی۔ بارش زمین کے ایک اور حصے کو پہنچی جو چٹیل اور بے صلاحیت تھی نہ پانی ہی روک سکی، نہ سبزہ اگایا۔ یہ مثال ہے اس شخص کی کہ جس نے دین کا فہم حاصل کیا اور اس کو اس سے فائدہ پہونچا جو کچھ دے کر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بھیجا ہے اس نے خود بھی سیکھا اور ایک ایسا شخص ہے کہ جس نے ہماری باتوں پر دھیان ہی نہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت لے کر میں آیا ہوں اس کو تسلیم ہی نہیں کیا۔

مذکور بالا حدیث آپ ﷺ کے ارشاد کہ ''میں صرف تقسیم کرنے والا ہوں دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے'' کی تشریح کرتی ہے۔

اس حدیث کے بارے میں ابن حجرؒ کہتے ہیں (کہ آپ نے سامعین کی تشبیہ زمین کے مختلف حصوں سے دی، جہاں بارش ہوتی ہے اور برسات کا پانی پہنچتا ہے۔ ان سامعین میں سے کوئی عالم باعمل ہوتا ہے۔ اس کی مثال اچھی زمین کی سی ہے کہ اس نے پانی جذب کیا خود کو فائدہ پہنچایا اور سبز کھیتی اگا کر دوسروں کو بھی فائدہ پہنچایا۔ ان میں سے کوئی ایسا ہے جو علم تو خوب رکھتا ہے اس میں ڈوبا رہتا مگر اس پر عمل نہیں کیا یا اس علم سے فائدہ نہیں اٹھایا لیکن دوسروں کے حصول علم کا ذریعہ بنا، اس کی مثال اس زمین کی سی ہے جس میں پانی ٹھہر جاتا ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ آپ ﷺ کے ذیل کے ارشاد میں اسی کی طرف اشارہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش وخرم رکھے جس نے ہماری بات سنی اور ویسی کی ویسی ہی بیان کر دی (کوئی کمی بیشی نہیں کی) کچھ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ علم سنتے ہیں نہ اس کو یاد کرتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرتے ہیں، نہ ہی دوسروں کو بتاتے ہیں یہ اس زمین کی مثال ہے جو چکنی ہے، نہ پانی کو روکتی

ہے کہ لوگ فائدہ اٹھائیں، نہ جذب کرتی ہے کہ سبزہ اگے۔ (فتح الباری: ج ا رص ۱۷۷)

(میرا کام تقسیم کرنا ہے دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے) آیت قرآنی بارش کے پانی کی طرح نازل ہوتی تھیں۔ بعض دلوں اور عقلوں میں اس بارش کو قبول کرنے اور اس سے سیراب ہونے کی زیادہ صلاحیت ہوتی تھی، آپ ﷺ ان لوگوں کو بھانپ لیتے تھے اور ان کی قابل اعتماد صلاحیت کو سمجھ جاتے تھے، لہذا ایسے لوگوں کی طرف آپ کی خصوصی توجہ ہوتی تھی۔ انھیں حضرات میں سے زید بن ثابتؓ تھے۔ خارجہ نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ آپ ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد مجھ کو آپ کی خدمت میں لایا گیا اور لانے والوں نے کہا۔ اللہ کے رسول! یہ بنونجار کا ایک غلام ہے، آپ پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس کو اس میں سے تیرہ سورتیں یاد ہیں۔ میں نے حضور ﷺ کو پڑھ کر سنایا تو آپ نے بہت پسند فرمایا۔ اور فرمایا: زید! تم یہودیوں کی کتاب سیکھ لو، اس لئے کہ مجھے اپنی کتاب (یعنی قرآن کریم) کے بارے میں ان کی طرف سے اطمینان نہیں کہ اس میں وہ کچھ خلط ملط نہ کر دیں)۔

حضرت زیدؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے فرمانے کے بعد میں نے صرف نصف ماہ میں ان کی کتاب سیکھ لی حتی کہ اس میں مہارت پیدا کر لی، آپ ﷺ جب ان لوگوں کو خط لکھواتے تو خط میں ہی لکھا کرتا تھا۔

آپ ﷺ حضرت زیدؓ کی ذہانت و قابلیت اعتماد صلاحیت کو سمجھ جاتے ہیں اس کے نتیجہ میں ان کی طرف آپ کی توجہ بھی بڑھ جاتی ہے، چنانچہ آپ ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں (زید! کیا تم سریانی زبان اچھی طرح جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا اللہ کے رسول سریانی زبان تو نہیں جانتا۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے سترہ دن میں سریانی زبان سیکھ لی، حضرت زیدؓ کی طرف آپ کی ایسی عنایت تھی کہ جب وحی نازل ہوتی تو فرماتے زید کو بلاؤ اور ان سے کہو کہ قلم دوات لے کر آئیں، راوی کہتے ہیں پھر فرمایا لکھو، لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ (النساء: ۹۵)

حضرت زیدؓ عہد رسالت میں قرآن پاک کو جمع کرنے والے صحابہ میں سب سے نمایاں تھے، فرماتے ہیں کہ میں قرآن پاک کے سلسلہ میں تلاش و فکر میں رہتا تھا اس کو میں پرزوں پر نوٹ کئے ہوئے اور کھجور کی چھال پر لکھے ہوئے اور لوگوں کے سینوں سے یعنی سنکر جمع کرتا تھا۔ حضرت زیدؓ فقیہہ تھے، فرائض کے عالم تھے، حضرت انسؓ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ فرائض کو میری امت میں سب سے زیادہ زید بن ثابت جانتے ہیں۔

(سیر اعلام النبلاء: ج ۲ رص ۴۲۷، ۴۳۰)

علم اصول کے ماہرین کے نزدیک فقہ کہتے ہیں، شریعت کے فروعی احکام جاننے کو جو تفصیلی دلائل سے حاصل کئے گئے ہوں اور فقہاء کے نزدیک فقیہہ وہ ہے جس نے فروع کو یاد کرلیا ہو، اور شریعت کے فروعی احکام جانتا ہو جس کے ذریعہ بندوں کے فعل کو بیان کیا جائے اور واجب، مستحب، مباح اور حرام وغیرہ ہونے کی کیفیت کو بتایا جائے۔ فقہ کے یہ مطالب ومفہوم واقفیت ومشق کے بعد اور کبار صحابہؓ سے ربط وتعلق اور فقہی مسائل کے بارے میں ان صحابہ کی طرف رجوع کرنے سے جو فقہ میں مشہور تھے اور طلبائے علم ان حضرات کے گرد جمع ہوتے اور فقہ حاصل کرتے۔

فقہی مکاتب فکر کی بنیاد

اس طرح سے پھر فقہی مکتب کے اثرات ظاہر ہونے لگے، اور ممتاز صحابہ کرام کا ایک خاص فقہی انداز اور فرق نظر آنے لگا۔

معمر کہتے ہیں، ابن عباسؓ کا علم فقہ اکثر تین حضرات سے حاصل شدہ تھا، عمر، علی، ابی، حضرت ابن عباس نے بہت سے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا، لیکن ان پر ایک خاص دقیق علمی رنگ چڑھ گیا تھا خصوصاً فقہی مسائل میں اور اس رنگ پر ان تین حضرات کا اثر تھا جن کا اوپر ذکر ہوا، مسائل اور احکام میں پہلے تو وہ قرآن کی آیت پر غور کرتے اور ان سے مسائل مستنبط کرتے، اگر آیات سے کسی نتیجہ پر نہ پہنچ پاتے تو پھر احادیث رسول ﷺ پر غور فرماتے اس سے مسائل مستنبط کرتے، یہ فقہ اور شرعی احکام ثابت کرنے کا گویا دوسرا سرچشمہ تھا، جب ان دونوں چیزوں سے مسائل نہ مل پاتے تو پیش آمدہ مسئلہ سے ملتے جلتے مسائل پر جو مثالیں اور نظریں ملتیں ان کو دیکھتے اور ان کی روشنی میں مسئلہ حل کرتے لیکن اس میں شریعت نے جن مصالح کا خیال رکھا ہے ان پر پوری طرح غور کرنے کے بعد کرتے، اس کی وضاحت شراب پینے والے کے بارے میں حضرت علی کے اس قول سے ہوتی ہے کہ شرابی جب شراب پئے تو نشہ چڑھے گا تو اُول فول بکے گا، اور جب ہوش نہ ہوگا تو بہتان لگائے گا، جھوٹ بولے گا اور جھوٹ اور بہتان لگانے والوں کی سزا اسیؔ دُرّے ہیں، لہذا اسی روشنی میں شرابی کو بھی اسی کوڑے لگیں گے، اور وجہ دونوں صورتوں میں جھوٹ اور بہتان ہے۔ (اصول الفقہ: ڈاکٹر بدران: ص ۲۸) ایسی دقیق بات جو حدیث کے لفظ

(من یرد اللّٰہ به خیراً یفقهه فی الدّین) سے سمجھ میں آتی ہے۔

اسی بنیاد پر صحابہ کرام کی فقہ ترقی کرتی رہی اور بعض صحابہؓ سے مستفید ہوتے رہے یہاں تک کہ فقہی مکتبہ فکر وجود میں آ گیا۔

شعبی کہتے ہیں علم چھ حضرات سے حاصل کیا جائے گا عمر، عبداللہ، زید رضی اللہ عنہم۔ ان کا علم ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ اور حضرت علیؓ، ابیؓ اور ابوموسیٰؓ کا علم ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا، یہ حضرات ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

حدیث کے الفاظ سے بہت واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فقرے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ جو لوگ دین کے اندر اس طرح سمجھ پیدا کریں گے جس طرح صحابہ کرامؓ نے کیا اور سمجھا تھا اور مختلف فقہی مکتبہ خیال کی صورت میں ظاہر ہوئے تھے تو ایسے لوگ اور ایسی جماعت برابر صحیح راستہ پر رہے گی، تا آنکہ قیامت آ جائے، جو ان کو چھوڑ دے گا وہ انھیں کوئی نقصان نہ پہونچا سکے گا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آ جائے اس حال میں کہ وہ اسی طرح ہوں۔

اسی انداز کی ایک حدیث ایسے لوگوں کے بارے میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے: یقاتلون علی الحق ظاهرین الی یوم القیامة حق کے لئے جہاد کریں گے (قتال کا جہاد) اور قیامت تک ان کو غلبہ حاصل ہوتا رہے گا) حضرت معاویہؓ کی بھی ایک حدیث ان کے متعلق ہے جس میں انھوں نے فرمایا کہ وہ اہل علم ہیں۔ امام ترمذی نے اس باب میں حدیث کی تخریج کی ہے اور کہا میں نے محمد اسماعیل بخاری کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے علی بن مدینی کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ وہ علماء حدیث ہیں۔

یزید بن اصم کی ایک روایت میں ہے:

ولا تزال عصابة من المسلمین ظاهرین علی من ناوأهم الی یوم القیامة) مسلمانوں کی ایک جماعت ان لوگوں پر برابر غالب ہوتی رہے گی جو ان سے دشمنی کریں گے۔ ابوامامہؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ وہ لوگ بیت المقدس میں ہوں گے۔ اور طبرانی کی کتاب اوسط میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے (یقاتلون علی ابواب دمشق وماحولها وعلی ابواب بیت المقدس وماحوله ولا یضرهم خذلهم ظاهرین الی یوم القیامة) وہ دمشق کے اطراف اور دروازوں

پر جنگ کریں گے، بیت المقدس کے دروازوں اور اس کے اردگرد جنگ کریں گے ان کو بے سہارا چھوڑنے والے نقصان نہیں پہونچا سکیں گے ایسے لوگ قیامت تک غالب رہیں گے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں! یہ ممکن ہے کہ یہ جماعت (تفقه في الدين والی) مسلمانوں کی مختلف قسموں میں بٹی ہوئی ہو، ان میں کچھ جری و بہادر لوگ ہوں جو جہاد کریں، کچھ مسئلہ مسائل یعنی فقہ کے ماہر ہوں، کچھ محدث ہوں، کچھ زاہد و دنیا سے بے رغبتی رکھنے والے اور دعوت کا کام کرنے والے ہوں کچھ دوسرے حضرات دیگر خیر کے کام کرنے والے ہوں ، یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ سب ایک علاقہ میں ایک جگہ ہوں بلکہ مختلف ملکوں اور حصوں میں ہوں، (فتح الباری: ج ۱۳ ص ۲۹۴) یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس طرح کے سبھی لوگ ایک ہی شہر میں موجود ہوں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی شہر میں کچھ قسم کے لوگ ہوں دوسرے میں کچھ دوسری قسم کے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کوئی قسم ایسی بھی ہو جس سے پوری دنیا خالی ہو، اور اس طرح ایک ایک کر کے سب قسمیں ختم ہوتی جائیں اور صرف ایک ہی قسم کسی ایک شہر میں باقی رہ جائے اور جب سبھی قسمیں ختم ہو جائیں تو اللہ کا حکم (یعنی قیامت آ جائے) (فتح الباری: ج ۱۳ ص ۲۹۴)

ان روایتوں اور ان کے تسلسل سے بندہ مومن کا ایمان ترقی کرتا ہے، بڑھتا ہے اور وہ دین اسلام کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت و مدد کا امیدوار ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں دین کی نشر و اشاعت کے لئے سرگرم عمل ہوتا ہے اور دین کی طرف سے دفاع کے بارے میں قربانی، فدائیت اور اس کی راہ میں تکلیف و آزمائش میں اس کو مزہ آتا ہے۔ علما کرام نے اس موضوع پر بھرپور روشنی ڈالی ہے، تاکہ اس امت کے نقوش کو نمایاں کریں جو اللہ کے دین پر قائم اور کامیاب رہے گی تا آنکہ قیامت آ جائے، ذیل میں امت کے بعض خصائص کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(۱) یہ امت دین حق پر ہے، جس کا مطلب ہے کہ یہ دین صحیح اور سچا دین ہے، صحیح علم اور کھلے ہوئے دلائل وثبوت پر مبنی ہے جو اللہ کی کتاب اور سنت رسول ﷺ سے پیش کئے گئے ہیں۔

(۲) یہ امت اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم ہے، دعوت الی اللہ کا پرچم تھامے اور بلند کئے ہوئے ہے، لوگوں میں سنت کے نشر واشاعت کا فکر و اہتمام کرتی ہے اور برسوں کے شکوک وشبہات کو اس سے دور کرتی رہتی ہے اور کفار و مرتدین کو حکمت و دانائی کے جدید

وسائل کی روشنی میں مسکت جواب دیتی ہے۔ اچھائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے تمام ممکن وسائل کام میں لاتی ہے۔

(۳) یہ امت اللہ کی راہ میں فریضۂ جہاد و جنگ کو بھی ادا کرتی ہے۔ ذیل کی حدیث اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

الخیل معقود فی نواصیها الخیر الی یوم القیامة الاجر والمغنم۔

''قیامت تک کے لئے خیر گھوڑے کی پیشانی سے جڑی ہوئی ہے۔ ثواب کا ثواب مالِ غنیمت مزید۔''

حدیث کا اصل مقصد و مفہوم تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ لیکن حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاد بالکل نہ ختم ہوگا بلکہ امت کی کوئی نہ کوئی جماعت اللہ کی راہ میں اللہ کے دشمنوں سے برابر جہاد میں مشغول رہے گی، اور اس کو نصرت خداوندی بھی حاصل ہوتی رہے گی، اگر کہیں جہاد کے معاملے میں کوتاہی برتی گئی تو اس کا اس حدیث سے کوئی تعارض نہیں۔

(۴) امت کے اندر ایک ایسی جماعت موجود رہے گی جو دین کے اندر پیدا ہونے والی رسوم و رواج اور بدعات و خرافات کو مٹا کر اس کی تجدید کرتی رہے گی اور دین اپنی اصلی شکل میں موجود رہے گا۔ یہ جماعت علم و فقہ کی دولت سے بہرہ ور ہوگی جو مرور زمانہ کے ساتھ جدوجہد و ترقی یافتہ وسائل کی روشنی میں دین کے احیاء اور تجدید کی اہلیت رکھتی ہوگی۔ امت کے اندر جب جب بگاڑ و فساد بڑھے گا ایک جماعت کی ذمہ داری بڑھتی رہے گی۔ تجدید کچھ چیزوں کے متروک ہو جانے اور مٹ جانے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ اس کو اسلام کی غربت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (ابوداؤد: ۴/ص ۲۰۸) ایک قرآنی آیت اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (المائدۃ:۵۴)

''اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے لوگ پیدا

کردے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں۔"

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر سو سال کے خاتمہ پر اس امت کے لئے ایسے شخص کو پیدا فرماتا رہے گا جو امت کے لئے دین کو تازہ کرتا رہے گا۔ (ابوداؤد ج ۴، ص ۲۰۸)

احادیث میں اس جماعت کے حق پر ہونے کی وجہ سے غلبہ وکامیابی کا وعدہ آیا ہے۔ اور غلبہ کے متعدد معانی ہیں۔

(۱) واضح اور کھلے ہونے کے معنی جس میں کوئی ابہام وخفا نہ باقی ہو۔

(۲) دین اور حق پر جمے رہنا، اور دلائل وبراہین کے ذریعہ بات چیت سے عقل ودل پر غالب آنا بھی اس میں شامل ہے۔

(۳) حافظ ابن حجرؒ نے غلبہ حاصل ہونے ہی کے معنی لئے ہیں۔ ائمہ کرام نے اور بہت سے معنی بیان کئے ہیں۔ غالب آنے والی جماعت کے بارے میں کہ وہ کون سی جماعت ہے؟ اور بہت سے اقوال ہیں ان جماعتوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

(کتاب صفۃ الغرباء)

حدیث کا فقہی پہلو

دین میں سمجھ حاصل کرنا اور دینی علوم کا حاصل کرنا فرض عین ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس نے دین کا فہم نہ حاصل کیا اور دین کی بنیادی باتیں نہ معلوم کیں وہ خیر سے محروم رہا۔

(کتاب صفۃ الغرباء)

امام غزالیؒ نے فقہ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا۔ فقہ کہتے ہیں علم فہم کو جس سے اصل مسئلہ سمجھا جائے، کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی خیر وشر کو سمجھتا ہے یعنی اس کو جانتا اور اس کا فہم رکھتا ہے اور فقہا کے نزدیک فقہ شرعی احکام جاننے کا نام ہے۔

جرجانیؒ کی کتاب تعریفات میں آیا ہے:

لغت میں لفظ فقہ سے متکلم کے مقصد کلام کو سمجھنا مراد ہوتا ہے، ان تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ لغت میں فقہ کسی چیز کے جاننے اور سمجھنے اور اس کی گہرائی تک پہنچنے کا نام ہے۔

(فتح الباری، ج ۱ ص ۱۶۵)

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) خیر کو دین کا فہم رکھنے والوں اور علم میں رسوخ رکھنے والوں کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیات کو جاننے اور فہم وبصیرت رکھنے والے ہیں، اس لئے کہ علماء ہی اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور وفکر اور سنت میں مہارت و گہرائی پیدا کرنے کی کاوش کے درمیان اللہ تعالیٰ کی عظمت و بڑائی کو محسوس کرتے ہیں، جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ان کے اندر حقیقی خوف خدا پایا جاتا ہے اور وہ صحیح معنوں میں تقویٰ اختیار کرتے ہیں، جیسا کہ خود قرآن پاک کا ارشاد ہے: انما يخشى الله من عباده العلماء خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔

(۲) حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کا فہم محنت وکوشش سے نہیں حاصل ہوتا بلکہ جس کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے فہم رسا عطا کرتا ہے اس کو یہ نعمت حاصل ہوتی ہے اور جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ فہم کا یہ باب کھولے گا ان کی جنس و جماعت برابر موجود رہے گی حتیٰ کہ قیامت آجائے۔

آپ ﷺ اپنے ارشاد سے طلب علم کا جذبہ پیدا فرمانا چاہتے ہیں کہ لوگ علماء کی طرف رجوع کریں اور ان کے چشمہ فیض سے سیراب ہوں اور توشہ علم حاصل کریں اور فقیہہ بننے کی توفیق حاصل ہو۔

(۳) حدیث سے فقیہہ وعالم کا مرتبہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طالب علم حصول علم کا ادب سیکھتا ہے تاکہ عالم کی خوشنودی حاصل کرسکے اور اس کی دعا لے جیسا کہ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لئے دعا فرمائی تھی اور فرمایا تھا (اللهم فقهه فی الدین وعلمه التاويل)

(۴) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ امت قیامت تک موجود رہے گی اس کی مخالفت کرنے والے اس کو نقصان نہ پہونچا سکیں گے۔

اس جماعت کو عقیدہ کی پختگی، ہدایت ودین پر عمل، جان ومال کے ذریعہ جہاد میں استقامت، برائی سے روکنے اور بھلائی کی دعوت دینے کا جذبہ، اور دنیا کے سامنے اسلام کی حقانیت پر حجت تمام کرنے کا امتیاز حاصل رہے گا۔

حدیث - ۳۴

علم و دانائی پر رشک یا حسد کے جواز کی صورت

عن عبداللہ بن مسعود قال، قال النبی ﷺ لاحسد الا فی اثنتین رجل اٰتاہ اللّٰہ مالا فسلطہ علی ھلکتہ فی الحق ورجل آتاہ اللّٰہ الحکمۃ فھو یقضی بھا ویعلمھا۔

(صحیح بخاری، ج ۱ کتاب العلم، مسند احمد، ج ۲، ص ۹)

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: حسد صرف دو چیزوں میں درست ہے، ایسے شخص پر حسد کرنا جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو، پھر راہ حق میں اس مال کو خوب خرچ کرنے کی توفیق دی ہو اور اس شخص پر حسد درست ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے دانشمندی کی دولت سے نوازا ہو۔ وہ اس کے ذریعہ فیصلہ کرتا ہو اور اس کو دوسرے لوگوں کو بھی سکھاتا ہو۔''

مفہوم

اسلام اجتماعیت، باہم ہمدردی و بہی خواہی اور شرف و بلندی کا دین ہے، حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: میں اخلاق کریمہ کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں آپ کی ذاتی زندگی اس کی زندہ جاوید اور نہایت صاف ستھری مثال پیش کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ (اور تمہارے اخلاق بہت عالی) ہیں۔

آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اس تعریف کے ساتھ جہاں اپنے نبی ﷺ کے شرف کو بیان فرماتا ہے، وہیں وہ بندۂ مومن کو اخلاق کریمہ کی تعلیم دیتا ہے اور غلط قسم کے اخلاق وصفات مثلاً حسد، غصہ، بدلہ، انتقام کی نہ صرف مخالفت کرتا ہے بلکہ اس سے روکتا اور منع کرتا ہے۔ اس کے برعکس درگزر، بھائی چارہ ایسی عادات وصفات ہیں، جو اسلام کی اہم اور نمایاں اخلاقیات میں شمار

ہوتی ہیں۔ یہ وہ اخلاقیات ہیں، جو ماحول کی پیداوار نہیں بلکہ یہ سارے اخلاق آسمانی ہیں، جو قرآن کریم سے اور حامل قرآن کی زندگی سے حاصل ہوتے ہیں، پھر یہ کہ وہ صرف فضائل نہیں ہیں بلکہ سچائی، انصاف، امانت داری، رحمت، پورا ایک مکمل نظام حیات ہے، جس میں انتظامی ضوابط کے ساتھ ساتھ تربیتی وتہذیبی پہلو شامل ہوتا ہے، جس پر پوری زندگی اور اس کے تمام رجحانات ومیلانات کا فکر قائم ہوتا ہے اور اس سب کا منشاء وحاصل رضائے رب ہوتا ہے، اور مذکورہ حدیث ''لا حسد الا فی اثنتین'' اس مبارک سلسلہ کی اکائیوں میں سے ایک اکائی ہے جو خدا کے حکموں پر چلنے والے اور گناہوں سے بچنے والے بندۂ مومن کے اندر عمدہ اقدار اور اچھی عادات پیدا کرتی ہے۔

لا حسد الا فی اثنتین میں حسد سے مراد وہ حسد ہے جو جائز ہے، یہاں حسد رشک (غبطہ) کے معنی میں ہے جو حسد کے معنی میں نہیں، تو یہاں حسد کے لفظ کو اسلئے لایا گیا کہ شدت شوق وحرص ظاہر ہو۔ امام بخاریؒ نے اس کو ''غبطہ'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور اس کو فضائل قرآن میں ''باب اغتباط صاحب القرآن'' میں ذکر کیا ہے۔ (عمدۃ القاری، ج ا ص ۵۶)

حدیث کا مقصد ولب ولباب حصول علم اور راہ خدا میں مال کو صدقہ کرنے کی ترغیب اور شوق دلانا ہے۔

اگر ہم اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

وَلَا تَتَمَنَّوُا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْماً (النساء:۳۲)

''اور جس چیز میں خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اس کی ہوس مت کرو۔ مردوں کو ان کاموں کا ثواب ہے جو انھوں نے کئے۔ اور عورتوں کو ان کاموں کا ثواب ہے جو انھوں نے کئے اور خدا سے اس کا فضل وکرم مانگتے رہو، کچھ شک نہیں کہ خدا ہم سب سے واقف ہے۔''

غور کریں تو معلوم ہوگا کہ آیت میں تمناؤں سے روکا گیا ہے تو حسد کیوں کر درست

ہوگا بہت سے اسلاف نے حدیث کا یہ مطلب لیا ہے کہ یہاں حسد سے مراد رشک ہے اس پر حسد کا اطلاق مجاز کے طور پر کیا گیا ہے، وہ یہ کہ آدمی یہ تمنا کرے کہ اس کے پاس بھی وہ نعمت آ جائے، جو دوسرے کے پاس ہے اور اس کے پاس سے ختم ہونے کی آرزو نہ ہو، اس بات کے شوق یا حرص کو منافست کہتے ہیں، جو پسندیدہ ہے اور قرآن کریم اس کی دعوت دیتا ہے: وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ تو (نعمتوں کے) شائقین کو چاہئے کہ اسی سے رغبت کریں)

حدیث مذکور اسی آیت کریمہ کی تشریح کرتی ہے اور بندۂ مومن کو ایسے اچھے رخ کی طرف موڑتی ہے جس سے تعمیر ہو نہ کہ تخریب، اس طرح وہ خیر کے بارے میں مقابلہ اور ایک دوسرے سے بڑھنے کا شوق پیدا کرتی ہے۔ اس لئے کہ جو لوگ دنیا کی چیزوں میں مقابلہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے بڑھنا چاہتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی بڑی وشاندار بلند اور اونچی ہوں۔ لیکن بہرحال وہ گھٹیا اور معمولی ہی ہوتی ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں دنیا کی قدر و قیمت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں آخرت زیادہ وزنی و قیمتی ہے۔ اس لئے وہ ہے اس قابل کہ اس کے لئے ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کی جائے، نفس امارہ کے اندر موجود حسد، کینہ، ناپسندیدہ خواہشوں جیسی بیماریوں کا یہی علاج ہے اور ان چیزوں سے ہٹا کر نفس کو آخرت کی طرف موڑ دینا تمام منافست اور بڑھنے کا شوق رکھنے والوں کی روحوں کو بلند کر دیتا ہے جبکہ دنیا کے بارے میں مقابلہ و بڑھنے کی خواہش روح کو پست کر دیتی ہے، آخرت کے عیش وآرام کے لئے کوشش وجدوجہد زمینی زندگی کو درست وآباد کرتی ہے اور پوری نوع انسانی کو پاکیزہ وصاف ستھری بناتی ہے، آخرت کے عیش وآرام کے باہمی مقابلہ اور ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ روئے زمین کو برباد نہیں چھوڑے گا جیسا کہ بعض کوتاہ نظر لوگوں کا تصور ہے، اسلام دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندۂ مومن کو حسد کے خطرات ونقصانات سے باخبر ومتنبہ فرماتا ہے، حسد ان امراض میں سے ہے، جن میں لوگ کثرت سے مبتلا ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کی پناہ کا طلبگار رہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنے فضل ورحمت سے اپنے رسول ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کو اس خطرناک مرض اور پھیلے ہوئے شر سے اپنی پناہ مانگنے کی تلقین کرتا ہے اور اس کا قطعی فیصلہ ہے کہ بندے جب بھی اس ہدایت کے مطابق اس سورۃ کے

ذریعہ اس کی پناہ چاہیں گے وہ انکو پناہ دے گا اور ان کو فتنوں اور شرور سے بچائے گا، اسی لئے آپ ﷺ پابندی سے یہ سورۃ پڑھا کرتے تھے کہ آپ کا یہ عمل آپ کی امت کے لئے نمونہ ہو اور بہت سی آزمائشوں اور دشمنیوں سے نجات کا سبب بنے جس کا سبب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہرہ ور شخص پر حسد ہوتا ہے کہ جس میں اس شخص کے پاس سے ان نعمتوں کے ختم ہو جانے کی تمنا کی جاتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور ﷺ جب بیمار ہوتے تو معوذات کو پڑھ کر اپنے او پر دم فرما لیتے تھے، جب مرض بڑھ جاتا تو میں آپ پر پڑھتی اور آپ کے دست مبارک کو حصول برکت کے لئے چھوتی، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سب سے پہلے اس آیت کے ذریعہ حسد سے پناہ چاہی اور اسوۂ رسول ﷺ کو اپنایا، حضرت عائشہ ہی سے روایت ہے کہ حضور ﷺ ہر رات جب اپنے بستر پر لیٹتے تو دونوں ہتھیلیوں کو ملا لیتے پھر ان پر دم کرتے اور ان پر قل ھواللّٰہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھتے پھر جسم مبارک پر جہاں تک ہاتھ پہنچتا ہاتھ پھیرتے۔ چہرہ اور سر مبارک سے شروع فرماتے اور جسم کے پورے اگلے حصے پر ہاتھ پھیرتے اور ایسا تین مرتبہ فرماتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ مرض حسد کے علاج کا کتنا اہتمام فرماتے تھے۔ لہٰذا حسد کی خطرناکی اور برائی کو بلیغ اور ادبی الفاظ میں بیان فرمایا اور اس کا بدل بھی بتایا، چنانچہ رشک کو جائز فرمایا اور مقابلہ اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا پسندیدہ راستہ کھولا، تاکہ حسد کا سد باب ہو۔ اس لئے کہ حسد تباہ کر دینے والی بیماریوں میں سے ہے۔ یہود حسد ہی میں برباد ہوئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَآ اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ إِبْرَاهِيْمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنَاهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا

(النساء:۵۴)

''یا خدا نے لوگوں کو اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کا حسد کرتے ہیں۔ تو ہم نے خاندان ابراہیمؑ کو کتاب اور دانائی عطا فرمائی تھی اور سلطنت عظیم بھی بخشی تھی۔''

کیا حسد کرتے ہیں (یہود) خاص کر حضورﷺ پر، حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ اور ان دونوں حضرات کے علاوہ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ یہود نے آپﷺ کی نبوت پر حسد کیا اور صحابہ کرامؓ کے ایمان پر حسد کیا۔

حسد ناپسندیدہ ہے اور حسد کرنے والا ہر وقت حسد کی آگ میں جلتا رہتا ہے، حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے، جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے، یہ حضرت انسؓ کی روایت ہے، جس کو آپﷺ کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ حاسد سے بڑھ کر کسی ظالم کو ہم نے مظلوم کے مشابہ نہیں پایا، وہ برابر حسد کی آگ میں جلتا رہتا ہے اور غم اس کے پیچھے لگا رہتا ہے، ایسا روتا ہے کہ آنسو ختم ہی نہیں ہوتے۔

کہا جاتا ہے کہ حسد وہ پہلا گناہ ہے، جو آسمان میں کیا گیا اور زمین پر بھی سب سے پہلے یہی گناہ کیا گیا۔ آسمان میں حضرت آدمؑ پر ابلیس کا حسد اور زمین پر قابیل کا ہابیل پر حسد۔

حسد کے اس مرض کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے پوری ایک سورۃ نازل فرمائی جس کا نام سورہ فلق رکھا، اس سورۃ کی تشریح میں قرطبیؒ نے روایت نقل کی ہے کہ آپﷺ نے فرمایا ''مومن رشک کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے'' اور صحیحین کی روایت ہے: حسد دو باتوں کے علاوہ کسی اور بات میں درست نہیں یہاں حسد سے مراد رشک ہے۔ علماء کا قول ہے، حاسد اسی وقت نقصان پہونچاتا ہے جب اس کا حسد محسود کو نقصان پہنچانے پر آمادہ کرے اور وہ اس کی برائیوں کے پیچھے لگے، غلطیاں تلاش کرتا رہے، آپﷺ نے فرمایا جب تمہارے اندر حسد پیدا ہو تو اس کے تقاضے پر عمل نہ کرو۔

سورہ فلق میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولﷺ کو حکم فرمایا ہے کہ تمام برائیوں سے پناہ چاہیں، چنانچہ فرمایا، ان تمام چیزوں کے شر سے جو پیدا کی ہیں اور اس کا خاتمہ حسد پر فرمایا ہے تاکہ حسد جس کا نقصان عظیم اور اس کی برائیاں بہت ہیں ان سے ہوشیار رہے، حاسد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا دشمن ہے اور اللہ، اس کے دین اور احسان پر اعتراض کرنے والا ہے۔

حسد کرنے والے اپنی نیکیوں کو خود کھا جاتے ہیں ایسے ہی جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے اور وہ آخرت کی کوئی فکر نہیں کرتے، ان کے دلوں پر گناہ کا پردہ پڑ جاتا ہے اور حسد ان پر حاوی

ہو جاتا ہے وہ گناہ میں مبتلا ہوتے چلے جاتے ہیں یہ لوگ ختم ہو جانے والے گھٹیا مال و متاع پر حسد کرتے ہیں، جس کے سبب دنیا و آخرت دونوں کھو بیٹھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے حسد کا علاج خیر میں مقابلہ و مسابقت کے ذریعہ فرمایا ہے۔ ابو حازم حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے سوال کیا، آج تم میں سے کون روزے سے ہے؟ حضرت ابو بکرؓ نے کہا میں، پھر آپ ﷺ نے سوال کیا، آج تم میں سے کون کسی جنازہ کے ساتھ گیا ہے؟ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا میں، آپ ﷺ نے فرمایا جس بندہ میں بھی یہ چیزیں جمع ہو گئیں وہ جنت میں داخل ہو گیا (شرح مسلم النووی ج ۸)۔ یہ تربیتی انداز دین اسلام کے مزاج کو بتاتا ہے اور اس کے طریقہ کو واضح کرتا ہے، گہرے برادرانہ بنیاد پر زندگی کے نظام کو قائم کرتا ہے، دین حسد کو حرام کرتا ہے اور بہت سے طریقوں سے اس کا علاج کرتا ہے، مثلاً تقویٰ، محبت، رشک وغیرہ، یہ حقیقت ہے کہ آخرت کے لئے ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش بہت سی بیماریوں کا مداویٰ کرتی ہے اور اس بارے میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرنے والوں کی روحوں کو بلند کر دیتی ہے جبکہ دنیا میں بڑھنے کی کوشش کرنے والوں کو حسد گرا دیتا ہے اور پستی میں پہنچا دیتا ہے۔ آخرت کے آرام کے لئے کوشش دلوں کو پاک کر دیتی ہے اور زمین کے نظام کو درست کر دیتی ہے، اس کو آباد کرتی ہے اور سب کے لئے ستھری اور پاکیزہ بنا دیتی ہے اور دنیا کے لئے کوشش زمین اور ماحول کو گندا کر دیتی ہے، قومیں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوتی ہیں اور ان میں حسد سرایت کر جاتا ہے۔ ان کے اندر غصہ اور لڑائی جھگڑے کا طوفان بپا ہوتا ہے حسد (رشک) تو بس دو ہی چیزوں میں مفید و درست ہے۔ ایسے آدمی پر جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور پھر راہ خدا میں خرچ کرنے کی خوب توفیق دی ہو، اس طرح اللہ کے رسول ﷺ اپنی امت کی تربیت حسد کو رشک میں تبدیل کر دینے کی فرماتے ہیں اور اس میں مقابلہ کا شوق پیدا فرماتے ہیں اس موثر تربیتی بنیاد کے ذریعہ آپ ﷺ کی تربیت بہت سے موقعوں پر برگ و بار لائی اور پروان چڑھی، اس کی سب سے اچھی مثال غزوۂ تبوک میں سامنے آئی۔

ابو داؤد اور ترمذی میں حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ (حضور ﷺ نے ہم کو حکم دیا کہ ہم صدقہ کریں۔ آپ ﷺ نے جس وقت یہ ارشاد فرمایا اس وقت مجھے کچھ مال حاصل ہو گیا تھا میں نے

کہا کہ آج میں صدقہ کرنے میں ابوبکرؓ سے بڑھ سکتا ہوں، آج ابوبکرؓ سے بڑھ جانے کا موقع ہے، چنانچہ میں اپنا آدھا مال لے کر حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپﷺ نے مجھ سے سوال کیا، تم نے اپنے گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا، میں نے عرض کیا اتنا ہی ان لوگوں کے لئے چھوڑ آیا ہوں، ابوبکر کے پاس جو کچھ تھا سب لے کر حاضر ہوئے ان سے بھی حضورﷺ نے سوال کیا اپنے گھر والوں کے لئے کیا رکھا، انھوں نے جواب دیا، ان کے لئے اللہ اور اللہ کے رسولﷺ کو چھوڑ آیا ہوں، ابوبکرؓ کا جواب سن کر میں نے کہا، ابوبکر سے میں کسی چیز میں کبھی نہیں بڑھ سکتا۔ (تاریخ الخلفاء للسیوطی، ۴۰)

یہ حدیث ایسی ہے کہ تربیتی نقطہ نظر سے اس پر غور کیا جائے، اس لئے کہ یہ حسد کو رشک میں تبدیل کرنے اور اس میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی زندہ جاوید مثال ہے۔

حدیث کا فقہی پہلو

حسد کی دو قسمیں ہیں۔ ناپسندیدہ و پسندیدہ۔ ناپسندیدہ تو یہ ہے کہ حاسد یہ تمنا کرے کہ اس کے ایک بھائی کو اللہ کی جو نعمت حاصل ہے وہ اس کے پاس سے ختم ہو جائے، خواہ اپنے پاس آنے کی تمنا ہو یا نہ ہو، حسد کی یہی وہ قسم ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مذمت فرمائی ہے اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتَاھُمُ اللّٰہ من فضلہ اور پسندیدہ حسد وہ ہے جو صحیح حدیث میں اللہ کے رسولﷺ کا ارشاد بیان ہوا ہے، (لا حسد الا فی اثنتین) جس کی حقیقت یہ ہے کہ تم یہ تمنا کرو کہ تمھیں بھی وہ نعمت حاصل ہو جائے جو تمہارے بھائی کو حاصل ہے اور تمہارے بھائی کے پاس بھی رہے اس کے پاس سے ختم نہ ہو۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ گناہ کے بارے میں حسد ہو تو ناپسندیدہ ہے اور ممنوع ہے، اسی کے لئے ''ولا تنافسوا'' (گناہ میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش نہ کریں) فرمایا اگر انعامات کے سلسلہ میں ہو تو جائز ہے۔

(فتح الباری، ج ا، ص ۱۶۷)

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورﷺ کو لوگوں کی تربیت اور معاشرہ میں عمدہ اقدار پیدا کرنے کی کتنی فکر تھی۔

(۲) حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حسد و کینہ اور غصہ سے بچنا چاہئے، اس لئے کہ یہ چیزیں شیطان کو بہکانے اور گمراہ کرنے کا موقع دیتی ہیں، آبادی کے بجائے بربادی لاتی ہیں۔

(۳) اچھے کام میں باہم بڑھنے کی کوشش اچھا کام ہے اس کا شمار حسد میں نہیں بلکہ دین نے اس پر ابھارا ہے۔

(۴) مسلمان کا اپنے بھائی پر رشک کرنا حسد میں نہیں شمار ہوگا۔

(۵) علم اور حصول علم میں حسد اور اس میدان میں مقابلہ اس حسد میں نہیں شمار ہوگا یہ ناپسندیدہ نہیں بلکہ یہ پسندیدہ عمل ہے اور معاشرہ اور اقتصادی ترقی پر اس کے اچھے اثرات ظاہر ہوں گے۔ ایسے ہی جس مال کا مالک کا حق ادا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا میں خرچ کرتا ہے اس پر رشک حسد میں نہیں شمار ہوگا۔

حدیث - ۳۵

اعمالِ صالحہ کی دعوت

عن ابی هريرة، ان رسول اللهﷺ قال، من دعا الى هُدًى كان له من الاجر مثل اجور من تبعه، لا ينقص ذلك من اجورهم شيئا ومن دعا الى ضلالة، كان عليه من الاثم مثل آثام من تبعه، لا ينقص ذلك من آثامهم شيئاً۔

(شرح صحیح مسلم (للنوی) ج۱۶،ص۲۶۷۔عون المعبود فی شرح ابی داؤد، ج۱۲،ص۲۳۶، تحفۃ الاحوذی، ج۷،ص۳۶۴۔)

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا:''جس شخص نے بھلے کام کی دعوت دی تو اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس کی دعوت پر عمل کرنے والوں کو اور ان عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی۔اور جس شخص نے گمراہی (غلط کام) کی طرف بلایا تو اس کو اتنا ہی گناہ ہوگا جتنا اس گناہ کرنے والوں کو ہوگا اور ان کے گناہوں میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔''

مفہوم

''جس نے کسی بھلی راہ کی دعوت دی'' ہدایت دین اسلام میں اچھائی اور نیکی کے کام کو کہا جاتا ہے۔طیبی کا کہنا ہے کہ ایسی ہدایت جو منزل تک پہنچانے والی ہو یا محض راستہ دکھانے والی ہو، یہاں ہدایت سے مراد وہ ہدایت ہے جس سے اعمال صالحہ کی طرف رہنمائی حاصل ہوتی ہو۔ حدیث میں ہدایت کا لفظ نکرہ لانا جنس ہدایت کے لئے عام ہے جس کا سب سے اونچا مرتبہ ہدایت کی دعوت ہے اور کم سے کم درجہ مسلمانوں کے راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا ہے۔

(تحفۃ الاحوذی، ج۷، ص۴۳۷)

بگڑے ہوئے ماحول میں فریضہ دعوت کو ادا کرنا بہت دشوار کام ہے۔لیکن ہے بہت عظیم الشان اور خالق کائنات کو راضی کرنے والا کام۔لہٰذا ایسے سخت حالات میں جو شخص نیک راہ

کی دعوت دے گا اس کو اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوگا اور ایسا اجر ملے گا جس کا حصول کسی اور عمل کے ذریعہ ممکن نہیں۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (حٰم السجدہ:۳۳)

''اور اس شخص سے بات کا اچھا کون ہوسکتا ہے جو خدا کی طرف بلائے اور عمل نیک کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں۔''

آیت سے معلوم ہوا کہ روئے زمین پر بولا جانے والا سب سے بہتر لفظ دعوت الی الخیر ہے جو آسمان کی طرف جانے والے اچھے کلمات میں سب سے آگے آگے ہوتا ہے۔ لیکن یہ دعوت نیک عمل کے ساتھ ہو، جو اس مبارک کلمہ کی عملی تصویر ہو اور اپنے کو اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان کر دیا ہو، جس میں اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے اور شہرت و ناموری کا شائبہ بھی نہ ہو، جب ایسا ہوگا جبھی دعوت اللہ کے لئے خالص ہوسکتی ہے اور داعی کا مقصد کلمہ خیر کا لوگوں تک حسن نیت کے ساتھ پہنچانا ممکن ہوسکتا ہے جو صدقہ جاریہ ہوگا اور اس کے اجر و ثواب کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔

آپ ﷺ عربوں کی سیرت سازی کے لئے ربانی طرز تربیت اختیار فرماتے، اس طرح کہ تھوڑے تھوڑے وقفے اور مختلف مناسبتوں سے ایسی باتوں پر زور دیتے، جن سے اعمال صالحہ کی کشش، شریفانہ زندگی اختیار کرنے اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کو اپنانے کا جذبہ ان کے اندر پیدا ہو۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور آپ سے سواری مانگی آپ کے پاس سواری تھی نہیں، لہٰذا آپ نے اس شخص کو دوسرے کے پاس بھیجا۔ انھوں نے اس شخص کو سواری دیدی۔ جب اس نے آنحضرت ﷺ کو اطلاع کی تو آپ نے فرمایا: ان الدال على الخير كفاعله (اچھے کام کا مشورہ دینے والا اجر کا اتنا ہی مستحق ہے جتنا اس کے مشورہ و رہنمائی سے اچھا کام کرنے والا) اس لئے کہ بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا بھلائی میں اس کا معاون بنا۔ اگر وہ بھلا کام جس کا اس نے مشوہ دیا ہے انجام پا گیا تو اس کو بھی اس کا ثواب ملے گا اور نہیں انجام پایا تو اس کے مشورہ و رہنمائی کا ثواب تو ملے گا ہی۔

(تحفۃ الاحوذی، ج ۷، ص ۴۳۳)

اسلام اس حکیمانہ تربیتی انداز سے عربوں کو جاہلی رسم، رواج، مادیت پسند ذہنیت اور

جاہلانہ معاشرتی تعلقات سے نکال کر نیکی اور بھلائی کی بلندی پر پہنچا رہا تھا۔

حضرت ابو مسعود بدری سے مروی ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کے پاس سواری مانگنے آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہماری سواری چلنے سے قاصر ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: فلاں کے پاس جاؤ، وہ شخص ان صاحب کے پاس گیا اور انھوں نے اس کو سواری دے دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کسی اچھے کام کا مشورہ دیا تو اس کو وہی ثواب ملے گا، جو اس کے کرنے والے کو ملے گا۔ (تحفتہ الاحوذی، ج ۷، ص ۴۳۴)

ان احادیث کا پڑھنے والا ان حدود وآفاق کی بلندیوں کو دیکھے گا، جن پر اللہ تعالیٰ بندۂ مومن کو اپنے قیمتی اور نہایت درست طرز تربیت سے پہنچاتا اور ان میں شرف و بلندی، جود وسخا اور عفو ودرگزر کی خو پیدا فرما کر باہمی بھائی چارہ، رحم ومحبت اور تعاون کا شوق وجذبہ پیدا کرتا ہے یہ ایسی اقدار ہیں جو خیر کی تمام شکلوں اور دعوت کے تمام طریقوں پر حاوی ہیں۔ مثلاً مدارس قائم کرنا، اسپتال بنوانا، دعوتی کام کے لئے جدید ترقی یافتہ ذرائع اور وسائل کا استعمال کرنا۔ جن میں کیسٹ، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ جیسی چیزیں شامل ہیں۔ جو بہت آسانی کے ساتھ آیات واحادیث کو کمپیوٹرائز کر دیتی ہیں اس لئے کہ ہدایت کی دعوت زبانی وعملی اور شرعی وسائل اور نئے آلات کی مدد سے دی جاتی ہے تو جو شخص ان ذرائع سے دعوت کا کام کرے گا اس کو اس پر عمل کرنے والوں کا بھی اجر ملے گا اور ان عمل کرنے والوں میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔

اور جو شخص کسی گمراہی کی دعوت دے گا تو اس کو گناہ بھی اتنا ہی ہوگا جتنا اس گناہ کرنے والوں کو جنھوں نے گناہ کی دعوت دینے والے کے اتباع میں گناہ کیا ہے اور ان گناہ کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ حدیث کے اس حصہ کی تفسیر ووضاحت قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہو جاتی ہے:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِىٓ اِسْرَآئِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ اَحْيَاهاَ فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً۔ (المائدہ:۳۲)

"اس (قتل) کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل کیا کہ جو شخص کسی کو (ناحق) قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی

کرنے کی سزا دی جائے۔ اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا اور جو اس کی زندگی کا موجب ہوا۔ تو گویا تمام لوگوں کی زندگی کا موجب ہوا۔''

سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل کو حلال سمجھا، گویا اس نے تمام لوگوں کے قتل کو جائز کر دیا۔ جس نے کسی مسلمان کے قتل کو نا درست قرار دیا گویا اس نے تمام لوگوں کے قتل کو ناجائز قرار دیا۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''فکأنما قتل الناس جمیعاً'' اس کی سزا وہ ہوگی جو پوری انسانیت کو قتل کرنے کی ہو سکتی ہے اور جو کسی کی زندگی کا سبب بنا تو اس کا اجرایسا ہوگا جیسے وہ تمام انسانوں کی زندگی کا سبب بنا ہو۔ (تحفۃ الاحوذی، ج ۷ ص ۴۳۶)

حضرت عبداللہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''جو شخص بھی ظلماً قتل کیا جائے گا اس کے قتل ہونے کا گناہ حضرت آدم کے بیٹے (قابیل) کو ہوگا۔ اس لئے کہ وہی قتل کی ابتداء کرنے والا ہے۔ عبدالرزاق نے کہا کہ اس نے قتل شروع کیا۔ (تفسیر ابن کثیر، م ا۔ المائدہ ص ۷۵)

یہ حدیث خیر و نیکی سب صورتوں کی جامع ہے اور شر اور برائی کی تمام شکلوں سے ڈراتی اور ہوشیار کرتی ہے۔

(۱) یہ حدیث ذیل کی سورۂ نور کی آیت کے کچھ معنی کو واضح کرتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ۔ (النور،۱۹)

''اور جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی (یعنی تہمت بدکاری کی خبر) پھیلے، ان کو دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہوگا اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

یہ تربیت انسانی کے انداز کا ایک پہلو اور احتیاط اور بچاؤ کے فرامین میں سے ایک فرمان ہے۔ جس کا مدار انسانی نفسیات سے واقفیت اور اس کے احساسات و رجحانات کو سمجھنے پر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ واللہ یعلم وانتم لا تعلمون اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ فحش رسالے اور عریاں تصویریں اور فتنہ سامان اعضاء کا نمایاں کرنا، شر میں شامل ہے۔ اس

صورت حال کی خطرناکی کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ یہ چیزیں اخلاقی اقدار اور تربیتی تعلیمات کو دل کے اندر کس طرح پاش پاش کر دیتی ہیں، خصوصاً نوخیزوں پر تو اس کے کتنے غیر معمولی اثرات پڑتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کی شناعت اس درجہ بیان کی گئی کہ ایک کے سبب جتنے افراد بھی اس مہلک فتنہ میں مبتلا ہوں گے، سب کا وبال اس شخص پر ہوگا جس نے اس گناہ میں پہل کی یا اس کے اسباب مہیا کئے۔

اور جس شخص نے بھی کسی نئے انداز کی بے راہ روی کی دعوت دی یا اول اول اس کو کیا تو اس پر ان تمام لوگوں کا گناہ ہوگا جو اس کو دیکھ کر یا اس کی تحریک پر اس میں مبتلا ہوتے جائیں گے۔ اس لئے کہ یہ مرض اس کے عمل سے پیدا ہوا ہے جو شیطان کے کاموں میں سے ہے اور بندہ کسی گناہ کا سبب بننے یا اس کے عمل سے پیدا ہونے والے برے نتائج پر سزا کا مستحق ہوگا جیسے نشہ میں مبتلا شخص کو بحالت نشہ سزا دی جائے گی، اگر نشہ کا سبب ممنوع ہے تو نشہ میں مبتلا شخص معذور سمجھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ حرام اسباب کے اختیار کرنے اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے غلط اثرات پر ایسے ہی سزا دیتا ہے جیسا کہ وہ ان نیک کاموں پر جن کے کرنے کا حکم ہے، ثواب دیتا ہے اور نوازتا ہے۔

حدیث مذکور ہمہ گیر تربیت کے توجہ ناموں میں سے ایک توجہ نامہ ہے، اس امت مسلمہ کو نیک کاموں اور میدان عمل کی طرف بڑھاتی اور میدانِ عمل کے آفاق کو وسیع کرتی ہے، دل میں وسعت اور شرف و نیکی کی طرف چلنے اور نیکی اور بھلائی کی طرف بڑھنے اور بگاڑ پیدا کرنے والے افکار و نظریات اور ان برے اعمال کے مقابلہ پر آمادہ کرتی ہے، جو امت کو برے نتائج سے دوچار کرتے ہیں۔ آیت ذیل انھیں چیزوں کی طرف اشارہ کرتی ہے:

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (المائدہ:۲)

''اور (دیکھو) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو، اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کرو۔''

اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو بھلے اور نیک کاموں میں مدد کرنے اور برائیوں کو چھوڑنے کا حکم فرما رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ناحق باتوں اور گناہوں اور محارم کو پامال کرنے میں مدد

کرنے سے روک رہا ہے۔ابن عبدالبر نے ''اثم'' اور ''عدوان'' کی تشریح میں فرمایا ہے کہ جس پر عمل کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس کو چھوڑنا ''اثم'' (گناہ) ہے۔اور اللہ نے جو شرعی پابندیاں عائد فرمائی ہیں ان کو توڑنا ''عدوان'' (احکام سے تجاوز) ہے، اپنے یا غیر کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو فرض عائد کیا ہے اس سے تجاوز کرنا یہ سب عدوان میں داخل ہے۔

حضرت عبداللہؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا اس بھلائی کو کرنے والے ہی کے مثل ہے۔اس کو بھی وہی اجر ملے گا جو عمل کرنے والے کو۔ (تفسیر ابن کثیر، ج ۲،ص ۹ - ۱۰)

حدیث کا فقہی پہلو

علامہ بیضاویؒ نے کہا کہ بندوں کے افعال چاہے وہ بذاتِ خود ثواب وسزا کے موجب ومقتضی نہ ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ ثواب وسزا کو اسی طرح جوڑتا اور متعین کرتا ہے جس طرح اسباب کے ذریعہ پیش آنے والی چیزیں سبب پیدا کرنے والی چیزوں سے جڑی ہوتی ہیں۔

امام شافعیؒ نے فرمایا بدعتیں دو ہیں، ایک پسندیدہ بدعت، دوسری ناپسندیدہ جو سنت کے مطابق ہو وہ پسندیدہ ہے اور جو سنت کے خلاف ہو وہ ناپسندیدہ ہے، حدیث انہی فقہی معانی کو بتاتی ہے۔ (کتاب السنن والمبتدعات)

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) یہ حدیث بندۂ مومن کو اسلام کی نشر واشاعت اور اسلامی اقدار کو عام کرنے کے لئے، جدید ترقی یافتہ وسائل کو ایجاد کرنے اور بروئے کار لانے کی طرف متوجہ کرتی ہے خواہ وہ سننے سے تعلق رکھتے ہوں یا پڑھنے اور دیکھنے سے، ان ساری چیزوں کا صدقہ جاریہ کی نیت اور ثواب کی امیدیں کرنا سب سے پسندیدہ ہے۔

(۲) حدیث ان سنتوں کو زندہ کرنے کی بھی دعوت دیتی ہے جو اب اسلامی معاشرہ سے معدوم ہوتی جارہی ہیں مثلاً مہمان کی عزت کرنا، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، دسترخوان پر مہمانوں کیساتھ اکرام کا معاملہ کرنا، اسی طرح عقیقہ کرنا اور نئے آنیوالے مہمان کا اکرام کرنا۔

حدیث - ۳۶

بارگاہ الٰہی میں پسندیدہ عمل

عن هشام قال أخبرني أبی عن عائشة أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل عليها وعندها امراة، قال : من هذه؟ قالت فلانة، تذكر من صلاتها۔ قال ”مه عليكم بما تطيقون، فوالله لايملّ الله حتى تملّو۔“ كان أحب الدين إليه مادام صاحبه۔ (فتح الباری: ج ا رص ۱۲۴)

”ہشام نے کہا مجھ کو میرے والد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے، اس وقت ان کے پاس ایک خاتون موجود تھیں، آپ نے پوچھا یہ کون ہیں؟ عائشہؓ نے جواب دیا فلاں خاتون ہیں۔ ان کی نمازوں کا بڑا چرچا ہے۔ (یہ سن کر) آپ نے فرمایا: (بس کرو) تم پر اتنا ہی کرنا ضروری ہے جتنے کی تم میں طاقت ہو، خدا کی قسم اللہ تعالیٰ (دینے سے) نہیں اکتائے گا یہاں تک کہ تم لوگ اکتا جاؤ) آپ کے نزدیک دینداری کا وہ عمل زیادہ پسندیدہ ہے جس پر اس کا عمل کرنے والا پابندی کرے۔“

مفہوم

اسلام دین فطرت ہے نفس انسانی اپنی فطرت کے مطابق اس کو برضا ورغبت قبول کرتا ہے، یہ سہولت وآسانی کو ملحوظ رکھنے والا دین ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اول روز سے خوب جانتا ہے وہ ان کی اندرونی کیفیتوں اور پیچ وخم۔ سے خوب واقف ہے۔ لہذا بہت نرمی سے اس کو موڑتا ہے وہ ان کی داخلی وخارجی سب چیزوں کو جانتا ہے۔ اس لئے ان کو استقامت والی راہ بتاتا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ انسان کی صلاحیتوں کو جانتا ہے، اس لئے اس کی صلاحیت سے زیادہ بوجھ اس پر نہیں ڈالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی ضرورتوں اور شوق ورغبت سے خوب واقف ہے، اس لئے اس کو اس کا پورا پورا حق دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی تعمیری اور عملی طاقت کو جانتا ہے۔ لہذا اس کو

عمل اور تعمیری کام کے لئے آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ اپنے اختیار سے کرے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا: (یہ دین آسان ہے جو شخص بھی اس میں شدت (غلو) اپنائے گا دین پر غالب آ جائے گا (یعنی یہ اپنے غلو کو نباہ نہ پائے گا تھک ہار جائے گا) تم دین پر ٹھیک ٹھیک عمل کرو اور غلو سے بچو! اگر پورا پورا عمل نہیں کر سکتے تو اس کی کوشش میں لگے رہو کہ اس کے قریب قریب عمل ہو سکے، اور پابندی کئے جانے والے عمل کے ثواب کی خوش خبری سنو! آسانی کو اپناؤ، صبح وشام اور رات کے حصوں سے مدد حاصل کرو (یعنی ان وقتوں میں خدا کو یاد کرو) (سنن نسائی ج ۱۳۲/۸ اشرح السیوطی) مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اعتدال ومیانہ روی کی راہ نہ چھوڑے۔ ابن متین نے کہا کہ اس حدیث میں ایک خاص نبوی شان ہے۔ آپ کو معلوم تھا کہ غلو پسند زیادہ دنوں تک اس کو نباہ نہیں پائے گا اور عمل چھوڑ دے گا۔ اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کمال عمل سے منع فرما رہے ہیں، بلکہ یہ پسندیدہ معمول میں سے ہے۔ اس میں ممانعت اس غلو کی ہے جو اکتاہٹ پیدا کر دے، نوافل میں بہت زیادہ مبالغہ فرض کے ترک میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور فرض کو اس کے وقت پر ادا کرنے میں تاخیر کا سبب بن جاتا ہے جیسے کوئی پوری رات نوافل میں مشغول رہے پھر رات کے آخری حصہ میں نیند کا غلبہ ہو نیند آ جائے اور فجر کی نماز قضا ہو جائے۔

(سنن نسائی: ج ۱۲۲/۸ (شرح السیوطی)

سلف صالحین نے دین کو اسی مفہوم میں آسان سمجھا ہے اور کتب احادیث اور سیرت سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے جیسا کہ اس حدیث سے بھی ثابت ہو رہا ہے جس کی تشریح میں یہ سطریں لکھی جارہی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس آسان اور مطابق فطرت دین کو باقی وجاری رکھنے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ عہد رسولؐ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں جن سے اس دین کی آسانی وسہولت کا پتہ چلتا ہے اور جو قیامت تک کے لئے عملی نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اوپر جس حدیث کا ذکر ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتون بڑی دیندار خاتون تھیں ان کا نام خولا تھا، وہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ ہی کے قبیلہ سے تھیں، بیان کیا گیا کہ وہ رات بھر سوتی نہیں تھیں، وہ حضرت ائشہ کے پاس برابر آتی رہتی تھیں۔ ایک دن حضرت عائشہؓ کے گھر سے جانے کے لئے اٹھیں تو حضورﷺ نے پوچھا یہ کون ہیں؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ یہ فلاں عورت ہیں، یہ تمام اہل مدینہ میں سب سے زیادہ عبادت گذار ہیں، پھر تفصیل بیان کی، یہ دینِ اسلام کی سہولت وآسانی کو بیان کرنے کا بہترین موقع تھا، آپ نے

کر سکتے ہو اور جس پر پابندی ہو سکتی ہو، کہ اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے نہیں تھکے گا اور تم عمل سے تھک جاؤ گے، پسندیدہ دین داری وہی ہے جس پر اس کا عمل کرنے والا پابندی کر سکے۔

قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا کہ اللہ سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ ثواب کی نیت سے کام کیا جائے۔ زیادہ ثواب اسی عمل پر ہے، جس پر پابندی کی جائے، امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ تھوڑے پر پابندی سے اطاعت، ذکر و مراقبہ خلوص اور توجہ الی اللہ کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اس کے برخلاف مشقت میں ڈالنے والا زیادہ عمل اکتاہٹ پیدا کر دیتا ہے اور وہ بات نہیں حاصل ہو پاتی جو تھوڑے اور اطمینان و توجہ کے ساتھ ہونے والے عمل میں پائی جاتی ہے کہ یہ تھوڑا عمل بڑھ کر اس زیادہ عمل کے مقابلہ میں جس پر پابندی نہ ہو سکے اللہ تعالیٰ کو کئی گنا زیادہ راضی اور خوش کرنے والا بن جاتا ہے۔ ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ ''پابندی سے ہونے والا عمل اللہ کو زیادہ پسند ہے'' کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ عمل شروع کر کے چھوڑ دینے والا ایسا ہے جیسے وصال کے بعد بیوی کو چھوڑ دینے والا گناہ سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کسی آیت قرآنی کو یاد کرنے کے بعد بھلا دینے کی بڑی وعید آئی ہے، حالانکہ نہ یاد کر سکنے پر وعید نہیں ہے، دوسرے معنی یہ ہیں کہ نیک کام پر مداومت کرنا، پابندی سے خدمت کرنے والے کی طرح ہے، وہ شخص جو پابندی کے ساتھ ایک خاص وقت میں دروازے پر موجود رہے وہ اس شخص کی طرح نہیں ہو سکتا جو پورے دن دروازے پر رہے اور پھر غائب ہو جائے۔ (فتح الباری، ج ۱۲ص ۱۰۲، ۱۰۳)

دین کی آسانی کو واضح کرنے کے لئے اس سے بھی زیادہ واضح واقعہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص کا ہے جو عابد و عالم صحابی رسول تھے۔ وہ شوق عبادت، تلاوت قرآن اور کثرتِ نوافل میں مشہور تھے، آپ ﷺ نے ان کو جس طرح اعتدال اپنانے کی ہدایت فرمائی وہ تربیت کا وہ طرز ہے جو دین کی آسانی اور سہولت کو واضح کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے فرمایا: ہم نے قرآن کو جمع کیا اور ایک ہی رات میں پورے قرآن کی تلاوت بھی کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا ایک ماہ میں قرآن ختم کیا کرو۔ ہم نے عرض کیا اللہ کے رسول ہم کو اپنی قوت و جوانی سے فائدہ اٹھانے دیجئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اچھا بیس دن میں ختم کیا کرو۔ ہم نے عرض کیا مجھے اجازت دیجئے کہ فائدہ اٹھاؤں۔ آپ نے فرمایا اچھا سات دن میں ختم کیا کرو۔ پھر میں نے کہا مجھے فائدہ اٹھانے دیجئے۔ تو آپ نے انکار فرما دیا۔

اچھا سات دن میں ختم کیا کرو۔ پھر میں نے کہا مجھے فائدہ اٹھانے دیجئے۔ تو آپ نے انکار فرما دیا۔

یہ ایک تعمیری سوال وجواب اور ذوق عمل پیدا کرنے والا تربیتی نمونہ ہے، ایک نوجوان مسلمان کثرت عبادت وتلاوت کا شائق ہے آپ ﷺ اس کے جوش میں اعتدال پیدا فرماتے ہیں اور شوق فرواں کو کم فرماتے ہیں اس کو اعتدال وتوازن کی تعلیم دیتے ہیں۔ علامہ ذہبی اس واقعہ کی وضاحت کرتے ہیں کہ کئی مرتبہ آپ کے منع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تین دن سے کم میں قرآن کریم کا ختم کرنا مکروہ ہے اس لیے کہ اس صورت میں معنی پر غور وخوض نہ ہو سکے گا۔ اور اگر سات دن میں ختم کرے گا۔ اور اس کی پابندی کرے گا تو بہتر عمل ہوگا۔ معلوم ہوا کہ دین آسان ہے۔

یہی عبادت گذار صحابی جب بوڑھے ہوگئے تو فرماتے تھے کہ کاش ہم نے حضور ﷺ کی رخصت کو مان لیا ہوتا اسی طرح آپ ﷺ ان کے روزوں کو فرماتے رہے حتی کہ فرمایا اچھا ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن ناغہ کرو۔ یہ ہمارے بھائی داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے۔ یہ ہے حدیث کا مفہوم اور حضور ﷺ کے ارشاد احب الاعمال ادومها وان قل کے معنی۔ (سیر اعلام النبلاء: ج ۳ / ص ۸۳)

حدیث کا فقہی پہلو

عبادت کے اندر غلورات کے نوافل ودیگر شرعی اعمال سب کو مشتمل ہے۔

علیکم کا لفظ مرد وعورت دونوں کے لئے ہے (فوائد) سے معلوم ہوا کہ قسم کھلائے بغیر قسم کھائی جا سکتی ہے اور جب کسی دینی کام کی اہمیت بتانی ہو تو مستحب ہے، اسی طرح اگر کسی ممنوع کام سے نفرت دلانی ہو تو بھی قسم مستحب ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کے آسان اور معتدل ہونے کو سمجھنے کا بہترین پیمانہ اپنے معمول پر پابندی ہے۔

(۲) حدیث بتاتی ہے کہ دین کے اندر غلو سے کام لینا اور اس کو عملی تطبیق دینے میں شدت برتنا اگرچہ بعض افراد کے لئے جائز ہے لیکن دوسروں کے اندر دین سے بیزاری کا سبب بنتا ہے، کمزوروں اور نومسلموں کو دین سے برگشتہ کرتا ہے۔

حدیث۔ ۳۷

سب سے افضل عمل

عن ابن مسعود رضی اللّٰہ عنہ ان رجلا سأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم أی الاعمال افضل؟ قال، الصلوۃ لوقتھا وبر الوالدین ثم الجھاد فی سبیل اللّٰہ.

(صحیح بخاری، کتاب التوحید۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان)

''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ سب سے افضل اعمال کون سے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، وقت پر نماز پڑھنا، والدین کے ساتھ حسن سلوک، اس کے بعد راہ خدا میں جہاد سب سے افضل عمل ہے۔''

مفہوم۔

یہ حدیث عہد رسالت میں مدینہ منورہ کے اس ارتقا پذیر معاشرے کی ایک جھلک پیش کرتی ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل اعمال کون سے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا، نماز کا وقت پر ادا کرنا، والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان دونوں کے بعد اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا زیادہ افضل ہے۔

نماز کا وقت پر ادا کرنا بندہ مومن کے دل میں ایمان کے جاگزیں ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پابندیٔ نماز سے ہی بندۂ مومن کے اخلاق اور دین داری کا پتا چلتا ہے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے پابند شخص کو ان سات قسم کے خوش نصیبوں میں شمار فرمایا ہے، جو قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوں گے جس دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے نماز کا اس کے وقت پر ادا کرنے کا صاف اور واضح حکم معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ نماز کا اس کے وقت پر ادا کرنا مومن کو پورے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر نہر ہو وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو تو تم کیا کہو گے؟ کیا پانچ مرتبہ غسل کرنے

سے اس کے جسم پر کچھ میل باقی رہ جائے گا؟ لوگوں نے کہا: نہیں! اس پر ذرا بھی میل باقی نہیں رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہی مثال پانچوں نمازوں کی ہے۔ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ نماز اللہ سے تعلق وربط کا زبردست وسیلہ ہے جو بندہ مومن کو اچھی اخلاقی قدروں، مثالی کردار اور خیر کے طریقوں پر آمادہ کرتی ہے، برائی اور فحش کاموں سے روکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَ لَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۔ (العنکبوت:۴۵)

''کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے اور خدا کا ذکر بڑا (اچھا کام) ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو جانتا ہے۔''

حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ سے ان الصلوۃ تنھیٰ عن الفحشاء کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کی نماز اس کو بے حیائی کی باتوں سے نہ روکے اس کی نماز ہی نہیں۔ ضحاک بن مسعودؓ سے اور انھوں نے حضور ﷺ سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کی نماز اس کو بے حیائی کی باتوں سے نہ روکے اس کی نماز ہی نہیں۔ ضحاک بن مسعودؓ سے اور انھوں نے حضور ﷺ سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا: جس شخص نے نماز کے تقاضے کو نہ پورا کیا اس کی نماز ہی نہیں، نماز کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بے حیائی اور ناپسندیدہ باتوں سے روکے ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر کی تشریح میں ابوالعلیؒ کہتے ہیں کہ نماز کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں، اخلاص، خشیت اور اللہ کا ذکر۔ اخلاص نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے اور بحالت نماز اللہ کی یاد میں مصروفیت بہت بڑی بات ہے۔

ان آیات واحادیث سے ہماری سمجھ میں یہ آیا کہ نماز کے بے حیائی اور بری باتوں سے روکنے کا راز اس میں پنہاں ہے کہ اس کو اول وقت میں ادا کیا جائے، اور اذان سنتے ہی بندہ مومن مسجد کی طرف چل پڑے، حضرات صحابہؓ وتابعینؒ ان معانی کی حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے اور اس بات کے لیے کوشاں ہوتے تھے کہ ان کی تکبیر اولیٰ بھی نہ چھوٹنے پائے، اسی کے ساتھ نماز زندگی کے بنیادی تصور کو پیش کر دیتی ہے، اسلام انسان کو عقل وفکر اور روحانیت کا پیکر قرار دیتا ہے۔ نماز اس کا ایک مظہر ہے جو انسان کے خالق کی طرف نظم وتربیت کے ساتھ متوجہ کرتی ہے۔

نماز کے رکوع وسجود تو جسمانی حرکت کو عملی شکل دیتے ہیں اور قرأت کو توجہ الی اللہ کا ذریعہ بنا تا ہے تاکہ روحانی نشاط وسرور حاصل ہو۔ جب نماز ان آداب کے ساتھ ادا کی جائے گی تو وہ بے حیائی اور بری باتوں سے روکے گی۔ نماز بندہ مومن کے ارکان ایمان کو عملی شکل دینے کی پابند ہے، ان ارکان میں زکوٰۃ بھی شامل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّکَاةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج:۴۱)

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا کے اختیار میں ہے۔''

نماز کا اس طرح قائم کرنا یعنی اس کے وقت پر ادا کرنے کی پابندی مومن کو راہ خدا میں خرچ کرنے کا عادی بناتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (الانفال:۳)

''مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (نیک کاموں میں) خرچ کرتے ہیں۔''

یہ متقیوں کی صفات ہیں، خرچ کرنا زکوٰۃ کا بدل نہیں بنتا بلکہ یہ حسن سلوک ونیکی کے جذبہ والا انفاق ہے، جو یہ بتاتا ہے کہ نماز مومن کو ہر قسم کی نیکیوں کو عملی جامہ پہنانے اور اس کو زندگی میں جاری کرنے کا عادی بناتی ہے۔

سوال تھا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ فوری اور متصلاً جو جواب ملا وہ یہ کہ نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا۔ سائل نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ تب آپ ﷺ نے فرمایا، والدین کے ساتھ حسن سلوک سائل نے دوبارہ سوال میں ''ثُمَّ اَیٌّ'' کہا تھا۔ ثم عربی زبان میں وقفہ کے لیے آتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ جب مومن نماز کو پابندی وقت کے ساتھ ادا کرنے کا شائق وعادی ہو جائے اور اس کے اندر نماز کی اصل روح پیدا ہو جائے گی، تو نیک اعمال کی ترتیب میں پہلے والدین کے حقوق کو ترجیح دے گا، نماز کے بعد ہی والدین کے ساتھ اچھے سلوک کا نمبر آئے گا۔ قرآن کریم نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کو اللہ تعالیٰ کی عبادت

وتوحید کے بعد فوراً بیان کیا ہے۔ فرمایا:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًاؕ

(بنی اسرائیل:۲۳)

''اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو''

قرآن کریم میں ایک سے زائد مرتبہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا ذکر آیا ہے اور اس کے اسباب بھی ذکر کئے گئے ہیں۔ فرمایا:

حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِىۡ عَامَيۡنِ اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِـوَالِدَيۡكَؕ اِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ (لقمان:۱۴)

''اس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہہ کر پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے پھر اس کو دودھ پلاتی ہے اور دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے۔ (اپنے نیز) اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکید ہے کہ میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی (کہ تم کو) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔''

والدین کے ساتھ حسن سلوک وہ سب سے بڑا امتیاز ہے جس میں ہمارا دین اسلام دوسرے ادیان و مذاہب سے بڑھا ہوا ہے، والدین کے ساتھ حسن سلوک کا سلسلہ ان کی موت کے بعد تک جاری رہتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ سورہ ابراہیم آیت نمبر ۴۱ میں ارشاد فرماتا ہے:

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِىۡ وَلِـوَالِدَىَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَوۡمَ يَقُوۡمُ الۡحِسَابُ

''اے ہمارے پروردگار (حساب وکتاب) کے دن مجھ کو اور میرے ماں باپ کی اور مومنوں کی مغفرت کیجیو۔''

حضرت اسید مالک بن ربیعہ ساعدیؓ سے مروی ہے کہ اسی اثناء میں کہ ہم حضور ﷺ کے پاس تھے کہ بنوسلمہ کا ایک شخص آیا اور عرض کیا، اللہ کے رسول ﷺ کیا میرے والدین کے لیے نیکی کی کوئی ایسی صورت ہے جس کو میں ان کے انتقال کے بعد کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں ان کے لیے دعا و استغفار، ان کے عہد کو پورا کرنا اور ان کے رشتوں کو قائم رکھنا اور، ان کے

دوستوں کا اکرام کرنا۔ (مختصر سنن ابی داؤد (تہذیب ابن القیم، ج ۸ ص ۳۸)

ان دونوں عملوں کے بعد یعنی وقت پر ہر نماز کی ادائی اور والدین کے ساتھ حسن سلوک۔ تیسرے نمبر پر جہاد کا درجہ آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت بڑی قیمت ہے۔ یہ خدائی تربیت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال لٹائے اور خرچ کرے، چنانچہ ایک آیت میں اس کا شوق اس طرح دلایا گیا ہے: لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ (النساء:۹۵) جو مسلمان (گھروں میں) بیٹھ رہتے ہیں اور لڑنے سے جی چراتے ہیں اور کوئی عذر نہیں رکھتے اور جو خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑتے ہیں وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

قرآن کریم نے جہاد و مجاہدین کے بارے میں بہت زور دے کر بیان کیا ہے، فرمایا:

> يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ. (الصف:۱۰-۱۳)
>
> ''مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے (وہ یہ کہ) خدا پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو اور اگر تم سمجھو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغہائے جنت میں جن میں نہریں بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات ہیں جو بہشت ہائے جاودانی میں (تیار ہیں) داخل کرے گا۔ یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو (یعنی تمہیں) خدا کی طرف سے مدد (نصیب ہوگی) اور فتح (عن) قریب ہوگی۔ اور مومنوں کو (اس کی) خوش خبری سنا دو۔''

قرآن و حدیث میں جہاد کا بار بار ذکر آیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، حاصل زندگی اسلام ہے۔ اس کا ستون نماز ہے اور اس کی بلندی کا نشان جہاد ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ

جنت میں سو درجے ہیں۔ایک درجہ سے دوسرے درجہ تک فاصلہ اتنا ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان کا فاصلہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کیا ہے۔آپ نے فرمایا: جس شخص کے پاؤں راہ خدا میں گرد آلود ہوئے اس کو اللہ تعالیٰ نے آگ پر حرام کر دیا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا، ایک رات دن سرحد کی حفاظت، ایک ماہ کے روزے اور شب خیزی سے بہتر ہے، اگر وہ انتقال کر گیا تو اس کے عمل کا سلسلہ اس پر جاری رہے گا۔(ثواب ملتا رہے گا) اس کا رزق جاری رہے گا، وہ فتنوں سے مامون رہے گا۔" (السیاسۃ الشرعیۃ، ص۲۰۲)

حدیث کا فقہی پہلو

کون سا عمل افضل ہے؟ اس حدیث مذکور اور دیگر احادیث کی روشنی میں علماء نے مختلف جوابات دیئے ہیں کہ فلاں عمل افضل ہے، جواب کا اختلاف سوال کرنے والوں کے اختلاف کی وجہ سے ہے، ہر ایک کا جواب اس کی خواہش و ضرورت کے اعتبار سے دیا گیا ہے یا وقت کے فرق کی وجہ سے۔اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جہاد سب سے افضل عمل تھا، اس لیے کہ اسلام کے قائم و طاقت ور ہونے کا یہی ذریعہ تھا، بہت سے نصوص سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ نماز صدقہ سے بہتر ہے، اس کے باوجود پریشان حال کی حاجت روائی کے وقت صدقہ افضل ہوگا یا یہ کہ مطلق فضیلت باعتبار وقت تقاضا کے مراد ہو یا بہ ذات خود اچھا عمل ہونا مراد ہو۔نماز کے وقت پر ادا کرنے سے مراد نماز کا اول وقت ہے جیسا کہ حاکم و دارقطنی اور بیہقی نے تخریج کی ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

حدیث سے کام کی اہمیت و ترتیب سمجھنے کا اشارہ ملتا ہے۔ چنانچہ سب سے مقدم نماز، اس کے بعد والدین کے حقوق کا درجہ آتا ہے، پھر جہاد (فقہ الاولیات) کا مطلب ہے ہر چیز کو اس کے درجہ پر رکھنا، جس کو مقدم ہونا چاہئے اس کو موخر نہیں کیا جائے گا۔ بڑے کام کو چھوٹا اور چھوٹے کو بڑا نہیں سمجھا جائے گا۔ یہ مفاہیم و معانی موقع و محل اور ماحول کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے فرمان (اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ) کی روشنی میں مختلف ہوں گے۔

حدیث- ۳۸

وقت اور صحت کی قدر و قیمت

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم نعمتان مغبون فیھما کثیرمن الناس:الصحۃ والفراغ۔ (صحیح بخاری۔کتاب الرقاق۔جامع الترمذی)

''حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا: دونعمتیں ایسی ہیں جن کے سلسلہ میں بہت سے لوگ غیر معمولی نقصان میں ہیں۔تندرستی اور فرصت''۔

آپ ﷺ ہمارے سامنے ایسی بہت سی چیزوں کی وضاحت فرماتے ہیں، جن کی اصل اور حقیقت کو سمجھنے میں بہت سے لوگ غفلت برتتے ہیں،انھیں چیزوں میں وقت کی قیمت پہچاننا اور صحت و عافیت سے فائدہ اٹھانا بھی شامل ہے، جب کہ ایک سچے مسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنی عمر کے ایک ایک منٹ اور سکنڈ کو نہایت قیمتی سمجھے اور اس کا اپنے وقت کو گنوانا اور بیکار جانے کی پروانہ کرنا اور مہمل چیزوں میں اپنا وقت لگانا خودکشی کے مرادف تصور کرے۔

انسان تیزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف چل رہا ہے،فلک کا ہر چکر ایک نئی صبح کو وجود بخشتا ہے، جو آخرت کی راہ کا ایک مرحلہ ہوتی ہے۔کیا یہ عقل مندی کی بات نہیں کہ آدمی اس حقیقت کو سمجھے اور ہمہ وقت اس کا دھیان رکھے اور معلوم کرتا رہے کہ اس کے پیچھے کیا ہے اور آگے کیا ہے، یہ بڑے دھوکہ کی بات ہے کہ انسان اپنے کو ٹھہرا ہوا سمجھے اور زمانہ چل رہا ہے......،اسلام ایسا دین ہے جو وقت کی قیمت لگاتا ہے اور زمانہ کی خطرناکی کا اندازہ لگاتا رہتا ہے اور مومن کو ہوشیار کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنی عمر اور وقت کا جائزہ لیتا رہے اس لئے کہ وقت اور عمر بالکل اسی طرح امانت ہیں جس طرح مال۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضورﷺ نے فرمایا ''کسی بندہ کے قدم اس وقت تک نہیں ہٹ سکتے جب تک کہ اس کی عمر کے بارے میں نہ پوچھ لیا جائے کہ اس کو کہاں لگایا،اس کے علم کے بارے میں نہ پوچھ لیا جائے کہ اس کے ساتھ کیا کیا اس کے مال کے

بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کس چیز میں خرچ کیا، اور اس کے جسم کے بارے میں کہ اس کو کس کام میں لگایا اور تھکایا۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۷/ص ۱۰۰)

یہ حدیث اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ قبر میں مومن کا حساب ہوگا، اور سب سے پہلا سوال عمر کے بارے میں ہوگا کہ کس کام میں لگایا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ عمر بھر اپنا وقت کہاں لگایا، اس سے فائدہ اٹھایا یا بیکار گنوایا۔

انسان کے لئے یہ کتنا مشکل مرحلہ ہوگا کہ اپنے اعمال کو یاد کرے، حساب دیکھے کہ کس طرح اس کو فضول گنوایا ہے اور ایسی چیزوں میں ضائع کیا، جس کا کچھ حاصل نہیں، اسی لئے اسلام بندۂ مومن کو وقت کی قیمت پہچاننے کی تربیت دیتا ہے اور مسلمان کو سکھاتا ہے کہ اپنا روزمرہ کا کام چستی ونشاط کے ساتھ خوش خوش پورے عزم کے ساتھ شروع کرے، شروع ہی سے وقت سے فائدہ اٹھانے کی حرص اس بات کا شوق پیدا کرتی ہے کہ اس کے وقت کا کوئی حصہ بے کار نہ جانے پائے۔

اسلامی نظام زندگی میں مومن دن کی ابتداء فجر کی نماز سے کرتا ہے، سورج طلوع ہونے سے قبل بیدار ہو جانے کو اسلام ضروری قرار دیتا ہے اور اس جاگنے کو ناپسند کرتا ہے جو فجر کی نماز کو بعد کے وقت کے لئے ٹال دے، حدیث میں ہے "اللهم بارك لامتى فى بكورها" (اے اللہ تو ہماری امت کے صبح تڑکے کے وقت میں برکت دے) اسلام کا نظام وقت سے فائدہ اٹھانے کی دعوت دیتا ہے، لہٰذا اول وقت کام کو انجام دینے کی دعوت دیتا ہے اور فرائض اور ذمہ داریوں کو سمجھنے کی طرف متوجہ کرتا ہے تاکہ مؤمن کو یہ احساس رہے کہ ذمہ داریاں وقت سے زیادہ ہیں، اور یہ معلوم رہے کہ زمانہ ان سب ذمہ داریوں پر حاوی ہے، جو بندوں پر عائد کر دی گئی ہیں اور اچھے برے جتنے مسائل بھی اللہ تعالیٰ بندوں پر بھیجتا ہے زمانہ ان سب پر حاوی ہے، اللہ کا ارشاد ہے:

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ إِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِى الْاَبْصَارِ (النور:۴۴)

"اور خدا ہی رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے۔ اہل بصارت کے لئے اس میں بڑی عبرت ہے۔"

مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ لوگ مالی نقصان کو تو سمجھتے ہیں اور اس کی حفاظت کی فکر کرتے ہیں اور اس کے نقصان سے بچتے ہیں، لیکن وقت جیسی قیمتی چیز کو بے دریغ ضائع کرتے ہیں اور اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔ حالانکہ مال اور وقت دونوں ایک دوسرے سے جڑے

ہوئے ہیں اور حدیث میں دونوں کا ایک ساتھ ذکر ہے۔

تاریخ کا مطالعہ، اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور وفکر کرنا، امتوں کی داستانیں پڑھنا کہ ان کا عروج وزوال کس طرح ہوتا ہے، ہمیں سبق سکھاتا ہے اور وقت کی قیمت پہچاننے کی دعوت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا، اَوْاٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَإِنَّهَا لَاتَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ. (الحج:۴۶)

''کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر نہیں کی تا کہ ان کے دل (ایسے) ہوتے کہ ان سے سمجھ سکتے اور کان (ایسے) ہوتے کہ ان سے سن سکتے بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہوتے ہیں۔''

رہی صحت کی نعمت تو یہ ایسی زبردست نعمت ہے کہ کوئی اور نعمت اس کے برابر نہیں ہوسکتی، بہت پرانی مثل ہے (صحت تندرستوں کے سر پر ایک تاج ہے، جس کو صرف بیمار ہی دیکھتا ہے) یہ طے ہے کہ مومن سے ہر نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا لہٰذا صحت کے بارے میں بھی سوال ہوگا کہ اس کو کس چیز میں اور کہاں لگایا؟ حدیث بندۂ مومن کے اندر نعمت صحت کی قدر دانی کے جذبہ کو ابھارتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائے اور بہترین فائدہ تقویٰ ہے، موت گھات میں ہے کسی شخص کو معلوم نہیں کہ کب اور کہاں اس کی موت آجائے گی، لہٰذا اس کو چاہئے کہ اپنی صحت وجوانی کو اپنے فرائض وذمہ داریوں کی ادائیگی میں جس میں عبادت وعمل، جہاد اور مسلمانوں کے مسائل حل کرنے سے دلچسپی، ان کی مشکلات وپریشانیوں کو حل کرنے کی فکر سبھی کچھ شامل ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے روبرو شرمندہ نہ ہو اور اپنی کوتاہی پر افسوس نہ کرے، اللہ کا ارشاد ہے:

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يَّاحَسْرَتَا عَلٰى مَا فَرَّطْتُ فِى جَنْبِ اللّٰهِ وَإِنْ كُنْتُ لَمِنَ السَّاخِرِيْنَ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰه هَدَا نِىْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِىْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ. (الزمر:۵۶-۵۸)

''کہ (ہائے ہائے) اس تقصیر پر افسوس ہے جو میں نے خدا کے حق میں کی اور میں تو ہنسی

ہی کرتا رہا یا یہ کہنے لگے کہ اگر خدا مجھ کو ہدایت دیتا تو میں بھی پرہیز گاروں میں ہوتا، یا جب عذاب دیکھ لے تو کہنے لگے کہ اگر مجھے پھر ایک دفعہ دنیا میں جانا ہو تو میں نیکو کاروں میں ہو جاؤں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے سچ فرمایا کہ دو نعمتوں کے بارے میں بہت سے لوگ بڑی غفلت کا شکار ہیں تندرستی اور فرصت۔

حدیث کا فقہی پہلو

بندۂ مومن کے لئے ضروری ہے کہ وقت سے فائدہ اٹھائے اور صحت کی قیمت کو پہچانے کہ حضرت ابن عمرؓ کے اس قول کا مصداق بن جائے، ''اپنی صحت سے وہ حاصل کرو جو مرض میں نہ حاصل کر سکو گے، زندگی سے وہ کما لو جو موت کے بعد ممکن نہیں''۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بندۂ مومن وقت کی قدر دانی کے سلسلے میں دیگر انسانوں سے بہت زیادہ ذکی الحس ہو، کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی عمر کے بارے میں سوال کرے گا کہ اس کو کہاں صرف کیا اور جوانی کے بارے میں پوچھے گا کہ اس کو کہاں کھپایا، اس لئے وہ اپنے وقت کو بہت بچا بچا اور سنبھال کر کام میں لگاتا ہے کہ بے کار نہ ضائع ہو، وقت تو اس کا اصل سرمایہ ہے تو اس کو گنوا کر خالی ہاتھ کیسے ہو سکتا ہے۔

(۲) بندۂ مومن کو یہ احساس رہنا چاہئے کہ گویا ہر روز ڈوبتا نکلتا سورج اس کو پکار پکار کر کہتا ہے کہ میں پھر وجود میں آ گیا اور تمہارے عمل پر گواہ ہوں، مجھ سے فائدہ اٹھا لو، میرے وجود کو غنیمت جانو اور نیکیاں کر لو!

(۳) مومن کو یہ فکر دامن گیر رہنی چاہئے کہ اس کا اگلا دن پچھلے دن سے بہتر ہو، اس بات کا خواہش مند رہے کہ اپنے پیچھے نفع بخش عمل یا فائدہ پہنچانے والا منصوبہ چھوڑے، یا صدقہ جاریہ یا نیک اولاد چھوڑے، وہ ان اعمال خیر میں جو کچھ بھی چھوڑ کر جائے گا اس کا نفع جتنا عام ہوگا اللہ کے یہاں اس کا ثواب بھی اتنا زیادہ ہوگا۔

حدیث۔ ۳۹

مال میں مٹھاس اور کشش ہے

حدثنا عطاء بن يسار أنه سمع أبا سعيد الخدرى رضى الله عنه يحدث ”أن النبى صلى الله عليه وسلم جلس ذات يوم على المنبر وجلسنا حوله فقال: إن مما أخاف عليكم من بعدى، ما يفتح عليكم من زهرة الدنيا وزينتها، فقال رجل: يا رسول الله أو يأتى الخير بالشر؟ فسكت النبى صلى الله عليه وسلم فقيل له: ما شأنك تكلم النبى صلى الله عليه وسلم ولا يكلمك؟ فرأينا أنه ينزل عليه، قال: فمسح عنه الرحضاء فقال أين السائل ـ وكأنه حمده ـ فقال: لا يأتى الخير بالشر، وإن مما ينبت الربيع يقتل أو يلم إلا آكلة الخضراء، أكلت حتى اذا امتدت خاصرتاها استقبلت عين الشمس فثلطت وبالت ورتعت ـ وإن هذا المال خضرة حلوة فنعم صاحب المسلم ما أعطى منه المسكين واليتيم وابن السبيل ـ أو كما قال النبى صلى الله عليه وسلم ـ وإنه من يأخذه بغير حقه كالذى يأكل ولا يشبع، ويكون شهيداً عليه يوم القيامة“

(فتح الباری ج۳رص ۲۸۳۔ شرح صحیح مسلم للنووی ج ۷رص ۱۹۸۔ شرح سنن نسائی ج ۵رص ۹۴)

”حضرت عطاء بن یسار سے مروی ہے انھوں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ ”ایک دن حضور ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے، ہم لوگ آپؐ کے اردگرد بیٹھ گئے، آپؐ نے فرمایا: میں اپنے بعد تم لوگوں کے متعلق جس بات سے

ڈرتا ہوں (وہ) دنیا کی شان وشوکت اور زیب وزینت ہے، (یہ سن کر) ایک شخص نے عرض کیا: اللہ کے رسول کیا اچھائی کے نتیجہ میں برائی آتی ہے؟ (یہ سن کر) آپؐ خاموش رہے، لوگوں نے سائل سے پوچھا: کیا بات ہے کہ تم حضور ﷺ سے بات کرتے ہو اور آپؐ تم کو جواب نہیں دیتے؟ ذرا دیر بعد ہم نے دیکھا کہ آپ پر وحی کا نزول ہو رہا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ نزول وحی سے آپ پسینے میں شرابور ہو گئے پھر آپؐ نے پسینہ پونچھا اس کے بعد فرمایا: سوال کرنے والا کہاں ہے؟ آپؐ کے سوال کا انداز ایسا تھا جیسے سوال کرنے والے کی تعریف کے طور پر پوچھا ہو، پھر فرمایا: بھلائی برائی کا پیش خیمہ نہیں بنتی، البتہ موسم بہار میں جو سبزہ اگتا ہے اس کو جانور (کبھی) کھا کر مر جاتا ہے یا بیمار پڑ جاتا ہے، لیکن جو جانور گھاس کھاتا ہے اس کا پیٹ بھر جاتا ہے، پھر دھوپ میں بیٹھتا ہے، پاخانہ پیشاب کر دیتا ہے پھر چرتا ہے تو وہ محفوظ رہتا ہے۔ مال کی بھی یہی مثال ہے یہ مال بڑا دلکش اور میٹھا ہے، وہ بندۂ مومن کتنا خوش نصیب ہے جو اس مال میں سے مسکینوں یتیموں اور مسافروں کو دیتا ہے۔ ورنہ تو جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ جو شخص مال ناجائز طریقہ سے حاصل کرے گا اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو کھاتا جاتا ہے اور اس کا پیٹ نہیں بھرتا قیامت کے دن وہ خود ہی اپنے اس عمل کا گواہ ہوگا۔"

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ یہ حدیث حضور ﷺ کے انداز تربیت کا نمونہ پیش کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ آپ ﷺ کس طرح ہمہ گیر و ہمہ جہت تربیت کا اہتمام فرماتے تھے اور آپؐ کو کس قدر فکر دامن گیر ہوتی تھی کہ اپنے اصحاب کرام کو روحانی رنگ میں رنگا ہوا دیکھیں اور دیکھیں کہ ان کے ساتھیوں نے دین کے اصولوں کو اپنی زندگیوں پر کس طرح منطبق کر لیا ہے اور اس کی بنیادی چیزوں کو کتنا سمجھا ہے۔ ایک دن آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے صحابہ کرام آپؐ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے، آپ نے فرمایا: "اپنے بعد ہمیں تمہارے بارے میں جو اندیشہ ہے وہ یہ کہ تم پر دنیا کی زیب وزینت اور اس کی چمک دمک کے دروازے کھل جائیں گے"۔ آپؐ کا اندیشہ طبعی تھا، اس لئے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ہے "إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ، وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ"۔ (العدیات: ۷-۱۰) انسان اپنے پروردگار کا احسان ناشناس (اور ناشکرا) ہے وہ اس

سے آگاہ بھی ہے، وہ تو مال کی سخت محبت کرنے والا ہے۔

انسان بڑا جلد باز ہے، نعمتیں ملنے کے بعد اپنے رب کے انعام اور فضل کا انکار کر بیٹھتا ہے، اور مختلف صورتوں میں ناشکری و انکار کا مظاہرہ کرتا ہے، اس سے ایسے کام اور باتیں وجود میں آتی ہیں، جو اس گواہ کا قائم مقام بن جاتی ہیں، جو اس حقیقت کو آئینہ کی طرح پیش کر دے۔ وہ تو مال کی سخت محبت کرنے والا ہے، اس کو اپنی ذات سے بڑی محبت ہوتی ہے، لہٰذا وہ مال کا رسیا ہوتا ہے جس صورت میں بھی سامنے آئے، خواہ مال کی شکل میں ہو یا قوت واقتدار کی شکل میں، یا دیگر دنیوی ساز وسامان کی شکل میں۔

یہ انسان کی فطرت ہے، جب تک ایمانی حقیقت اس کے رگ وریشہ میں سما نہ جائے، دنیا کا حسن و جمال اس پر اپنا اثر ڈالے گا۔ لیکن ایمان کامل اور یقین راسخ دنیا کے بارے میں اس کے تصورات وخیالات اس کے اقدار اور پیمانوں کو بدل دے گا اور اس کی ناشکری و انکار کو اللہ تعالیٰ کے فضل وشکر سے بدل دے گا۔ اسی لئے آپ ﷺ فرماتے ہیں: ''اپنے بعد ہمیں تمہارے بارے میں جو خوف ہے وہ یہ کہ دنیا کے ٹھاٹھ باٹھ اور اس کی زیب وزینت کے دروازے تم پر کھل جائیں'' اس لئے کہ انسان اگر ایمان کی دولت سے بہرہ ورنہ ہو تو لالچی اور رضائے الٰہی کی فکر میں بڑا کوتاہ اور چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی حرص بڑھتی جاتی ہے۔ مقاصد زندگی اونچے ہوتے جاتے ہیں اور زمین کے کیچڑ کی طرح دنیا کی محبت میں لت پت ہوتا چلا جاتا ہے۔ اپنی ذات اور لذتوں کی قید میں پھنس کر رہ جاتا ہے، اس قید خانے سے آزادی کی ایک ہی صورت ہے یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق جڑے اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت میں ڈوب جائے۔

مال انسان کو بہت بڑی نعمت اور بہت بڑی خیر نظر آتا ہے۔ اسی لئے ایک آدمی نے یہ کہتے ہوئے سوال کیا کہ ''اللہ کے رسول! کیا خیر سے بھی شر پیدا ہوتا ہے؟'' طیبی کہتے کہ سائل کے سوال سے رہنمائی حاصل کرنا مقصود ہے۔ اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ نے سائل کی تعریف فرمائی اور وحی کے انتظار میں خاموش رہے۔ آپ کی خاموشی پر لوگوں نے اس سائل کی ملامت کی اور اس سے کہا: تم کو کیا ہو گیا کہ حضور ﷺ سے بات کرتے ہو اور آپ تم سے مخاطب نہیں

ہوتے؟ پھر ہم نے دیکھا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے اور آپ پسینہ پونچھ رہے ہیں۔

آپؐ کے ارشاد ''خیر شر لے کر نہیں آتی'' سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ رزق زیادہ ہو تو بھی خیر اسی میں سے ہے، اس میں شر کسی سبب سے پیدا ہو جانا مثلاً صحیح مصرف میں خرچ کرنے میں بخل کرنا، غیر شرعی جگہ پر اس کا خرچ کرنا، ہر چیز جس کو اللہ تعالیٰ نے بہتر اور خیر بنایا ہے وہ شر نہیں ہو سکتی، اسی طرح جس چیز کو برا بنایا ہے ضروری نہیں کہ وہ ہر پہلو سے بری ہو۔ لیکن اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ جس کو خیر نصیب ہے اس کے خرچ واستعمال میں ایسی کوئی صورت اختیار کی جائے جو بری ہو۔

سعید مقبری کی مرسل میں ہے کہ سعید بن منصور کے نزدیک ''أ خیر ھو'' کو تین مرتبہ دہرایا گیا ہے، اس سوال میں درحقیقت انکار کے معنی ہیں جس کو اصطلاح میں استفہام انکاری کہا جاتا ہے یعنی یہ کہ مال کو اگرچہ خیر کہا گیا ہے لیکن وہ بہر صورت بہتر نہیں ہے، گو اس کو خیر کہا گیا ہے، اس لئے کہ صحیح معنوں میں خیر وہ ہے جس کو درست جگہ میں خرچ کیا جائے۔

اس حدیث میں کلام نبوت کا اعجاز پایا جاتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی مکی زندگی میں حتیٰ کہ مدنی زندگی میں بھی ایسی دشوار معاشی حالت سے گزر رہے ہیں، جہاں مال وثروت کا انسان خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن گویا آپ یہ دیکھ رہے تھے کہ آپ کے بعد امت مسلمہ اس خطرے سے گذرے گی اور خطرہ پورے عالم انسانی کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا، ایسی صورت میں راہ اعتدال کی کیا صورت ہو، اور مال وثروت کی بھرمار کے وقت اللہ تعالیٰ سے تعلق کو مضبوط بنانے کی کیا تدابیر اپنائی جائیں؟ اسلام نے اس مسئلہ کا حل متعدد جگہ بتایا ہے، سورۂ طٰہٰ میں فرمایا:

وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ غُرُوۡبِهَا وَمِنۡ اٰنَآءِ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡ وَاَطۡرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرۡضٰى وَلَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ اِلٰى مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ زَهۡرَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا لِنَفۡتِنَهُمۡ فِيۡهِ‌ؕ وَرِزۡقُ رَبِّكَ خَيۡرٌ وَّاَبۡقٰى وَاۡمُرۡ اَهۡلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصۡطَبِرۡ عَلَيۡهَا‌ؕ لَا نَسۡـئَلُكَ رِزۡقًا‌ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُكَ‌ؕ وَالۡعَاقِبَةُ لِلتَّقۡوٰى۔ (طٰہٰ: ۱۳۰-۱۳۲)

''اور سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید کیا کرو اور ان ساعات (اولین) میں بھی اس کی تسبیح کیا کرو اور دن کے اطراف (یعنی دوپہر کے قریب ظہر کے وقت بھی) تا کہ تم خوش ہو جاؤ اور کئی طرح کے لوگوں کو جو ہم نے دنیا کی زندگی میں آرائش کی چیزوں سے بہرہ مند کیا ہے تا کہ ان کی آزمائش کریں ان پر نگاہ نہ کرنا اور تمہارے پروردگار کی (عطا فرمائی ہوئی) روزی بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرو اور اس پر قائم رہو ہم تم سے روزی کے خواستگار نہیں بلکہ تمہیں ہم روزی دیتے ہیں اور (نیک) انجام (اہل) تقویٰ کا ہے۔''

یہ آیت کریمہ دنیا کی محبت کا ذکر کرتی ہے، اور صحابہ کرامؓ کو راہ دکھاتی ہے، اس سے بچاؤ کی صورت بتاتی ہے اور کہتی ہے سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے تک اپنے پروردگار کی تسبیح کیا کرو۔

صبح کی پرسکون فضا میں جب وہ نمودار ہو رہی ہوتی ہے اور زندگی کی مشغولیات کے دروازے کھولتی ہے، سورج ڈوبتے وقت جب دنیا پر سکون کی چادر پھیلنی شروع ہوتی ہے اور سورج رخصت ہو رہا ہوتا ہے، ان دونوں وقتوں میں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا حب دنیا کا علاج ہے، لہٰذا ہر فرد بشر اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ کر سکون واطمینان چاہتا ہے اور اس پر راضی ہوتا ہے اور مامون پناہ گاہ میں آ جاتا ہے اور دنیا کے حصول اور اس سے لطف اٹھانے میں اعتدال وتوازن کی راہ اپناتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ عطا فرمایا ہے، اس پر خوش رہتا ہے اور یہ رضا وخوشی اللہ تعالیٰ کی عبادت و پاکی بیان کرنے کے نتیجہ میں نصیب ہوتی ہے۔ کم پر راضی رہنا، خرچ میں قناعت سے کام لینا، اعتدال کی راہ اپنانا اور عبادت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا، یہ اس حدیث کے اہم مقاصد میں سے ہے اور آیت کے اس حصہ ''اور کئی طرح کے لوگوں کو جو ہم نے دنیا کی زندگی میں آرائش کی چیزوں سے جو بہرہ مند کیا ہے'' میں دنیوی زندگی کی زیب وزینت اس کے مال واسباب، آل واولاد اور منصب وحکومت کو پیش کیا گیا ہے دنیاوی زندگی کی آرائش، جو اس طرح سامنے آتی ہے، جس طرح سبزہ اگتا ہے تو اس کا حسن وجمال دل کو بھاتا اور نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ حسن وجمال اپنی دلکشی کے سبب جلد دلوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اس حسن وجمال سے ہم ان کو اس لئے نوازتے ہیں کہ آزمائش میں ڈالیں کہ اسی

کے ہو رہتے ہیں یا ہم کو یاد کرتے ہیں۔ (تا کہ ان کی آزمائش کریں) اس نعمت کے ساتھ ان کے شغف و معاملہ کے ذریعہ ان کی فطری صلاحیتوں کو پرکھیں یہ سب سامان آرائش ہے لیکن تمہارے پروردگار کی روزی بہت بہتر ہے جبکہ وہ حلال طریقہ سے حاصل کی جائے اور اس کو میانہ روی کے ساتھ خرچ کیا جائے۔

یہ حدیث طیب و پاکیزہ چیزوں سے دور رہنے اور ترک کرنے کی دعوت نہیں دیتی ہے، بلکہ ہمہ جہت دنیوی زندگی میں اعتدال و توازن قائم رکھنے کا سبق سکھاتی ہے، اللہ تعالیٰ سے بندے کے تعلق کو مضبوط بنانے اور اس پر خوش رہنے کی دعوت دیتی ہے کہ لوگ مال و ثروت کے عیش و طرب میں کھو نہ جائیں، کہ اعلیٰ قدروں میں بھی راہِ اعتدال اپنانے کی دولت سے محروم ہو جائیں کہ آنکھوں کو چکا چوندھ کر دینے والی غلط زیب و زینت ہی کے شکار ہو رہیں، آپ ﷺ کے ارشاد ''إن مما أخاف عليكم من بعدی ما يفتح عليكم من زهرة الدنيا وزينتها'' کا یہی مطلب ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی زیب و زینت میں پھنس کر راہ اعتدال کا دامن چھوٹ نہ جائے۔

اس شخص نے کہا یہ خیر ہم کو جائز طریقہ سے حاصل ہوتی ہے جیسے مال غنیمت وغیرہ تو کیا خیر موجب شر ہوتی ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے، جس کی تشریح اوپر ہو چکی کہ یہ بعید از عقل بات ہے کہ ایک چیز اچھی ہو اور اس کے نتائج برے نکلیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس شخص سے فرمایا: خیر حقیقی کے نتائج خیر ہی ہوتے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا ''أ خير هو'' کیا وہ سراپا خیر ہی ہے؟ جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ دنیا کی زیب و زینت جو تم کو حاصل ہوگی وہ خیر نہ ہوگی بلکہ امتحان و آزمائش ہوگی۔ خیر شر کا موجب نہیں ہوتی، لیکن یہ دنیا کا حسن و جمال خیر نہیں (بلکہ امتحان ہے) کہ وہ یکسوئی کے ساتھ آخرت کی طرف متوجہ ہونے میں حائل ہو جاتی ہے۔ (شرح صحیح مسلم للنووی ج ۷/ص ۱۴۲)

ازہری تشریح کرتے ہوئے اس کی دو مثالیں بیان کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک شخص مال جمع کرنے ہی میں لگا رہتا ہے اور اسی کے مصرف میں خرچ نہیں کرتا إن مما ينبت الربيع ما يقتل سے اسی شخص کی طرف اشارہ ہے اسی لئے موسم بہار گرم تاثیر رکھنے والی ہری بھری گھاس اگاتا ہے اور جانور اس کو خوب کھاتا ہے (اتنا کہ دست آنے لگتا ہے)۔

دوسری مثال اس شخص کی ہے جو اعتدال ومیانہ روی اختیار کرتا ہے آپ کے ارشاد إلا أكلة الخضر سے اسی کی طرف اشارہ ہے، اس لئے کہ خضر کی تاثیر گرم نہیں۔ قاضی عیاض تشریح کرتے ہیں کہ ''حضور ﷺ نے میانہ رو اور حد سے تجاوز کرنے والے دو شخصوں کی مثال بیان کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ کہتے ہو کہ موسم بہار کی گھاس اچھی ہے اس پر جانور کی بقاء وتندرستی کا مدار ہے۔ لیکن بالکلیہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ بعض گھاسیں ایسی ہیں جو جانور کو مار ڈالتی ہیں یا موت سے قریب کر دیتی ہیں، تو اس جانور کی مثال جس کو خوب کھانے سے دست آنے لگیں اس کو ہیضہ ہو جائے، اس شخص کی سی ہے جو مال جمع کرتا جاتا ہے اور اس کو اس کے مصرف میں بھی نہیں خرچ کرتا ہے، آپؐ نے یہ تربیت دینی چاہی کہ مال جمع کرنے میں اعتدال ومیانہ روی بہتر ہے، پھر اس شخص کی مثال بیان فرمائی جس کا خوب مال جمع کرنا مفید ہوتا ہے۔ اس کی مثال ہری گھاس جو کچھ پختہ ہو گئی ہو، اس کے کھانے والے جانور سے دی ہے یہ مثال اس شخص کی ہے جو مال کو شرعی مصارف میں خرچ کرتا ہے اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جو جانور بھر پیٹ کھانے پر اکتفا کرتا ہے اور پاخانہ کرتا ہے تندرست رہتا ہے ایسے ہی وہ شخص جو مال جمع کرتا ہے اور خرچ کرتا ہے۔ واللہ اعلم

آپؐ کا ارشاد: ''إن هذا الما ل خضرة حلوة'' کے معنی ہیں کہ دنیا دیکھنے میں بڑی حسین اور سجی سجائی ہے۔ انباری کا کہنا ہے کہ ''هذا المال خضرة حلوة'' مال کے میٹھے اور خوش منظر ہونے کا مطلب نہیں کہ مال کی صفت خوبی ہے بلکہ یہاں تشبیہ دینا مقصود ہے گویا آپؐ یہ فرما رہے ہیں جیسے جانور ہری ہری گھاس اور سبزہ پر جھپٹتا اور اس کو کھاتا ہے، اسی طرح انسان مال پر فدا ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد کہ ''وإن المال خضرة حلوة فنعم صاحب المسلم''۔ اس بندۂ مومن کے لئے ہے جو اپنے مال میں سے مسکینوں، یتیموں اور مسافروں پر خرچ کرتا ہے اس سے مال کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور غریبی پر مالداری کو بہتر سمجھنے کا ثبوت ملتا ہے، واللہ اعلم (شرح صحیح مسلم للنووی ج ۷ رص ۱۴۲)

آپؐ کا ارشاد کہ ''وإنه من يأخذ بغير حقه كا لذی يأكل ولا يشبع ويكون شهيداً عليه يوم القيامة'' جلال الدین سیوطی اور سندی نے نسائی کی شرح میں وضاحت اس طرح کی ہے کہ اگر صاحب مال اپنے مال میں سے یتیم کو دیتا ہے (یعنی حلال کمائی میں سے)

جس سے معلوم ہوا کہ افضل مال میں دو صورتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ اول یہ کہ جائز طریقہ سے حاصل کیا جائے اور دوسرے یہ کہ صحیح جگہ پر خرچ کیا جائے، ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی اگر نہ پائی گئی تو مال نقصان دہ ہوگا۔

حدیث میں غلط طریقے سے مال حاصل کرنے کا ذکر تو ہے، لیکن اس کے ساتھ مال کو راہ خیر میں خرچ کرنے کا ذکر نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو مال ناجائز طریقے سے حاصل کیا جاتا ہے، اس کو راہ خیر میں خرچ کی توفیق ملتی ہی نہیں۔ صحیح جگہوں پر خرچ کی توفیق اسی وقت حاصل ہوتی ہے، جب مال جائز طریقے سے حاصل کیا گیا ہو۔

آپ ؐ کا ارشاد اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ مال دنیا میں رائج جائز طریقوں سے حاصل کیا جائے (خواہ وہ تجارت وکاروبار کی صورت سے ہو یا ملازمت کی) ہر جگہ امانت اور شرعی اصولوں کا خیال رکھا جائے تب یہ مال مبارک ہوگا جس کا منشاومطالبہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ہے تا کہ یہ شخص ان متقیوں میں شامل ہو جائے جن کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔

"الـمّ ذلک الکتاب لاریب فیه هدی للمتقین الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوٰة ومما رزقنهم ینفقون" (البقرہ:۱) الم، یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں کہ کلام خدا ہے اور خدا سے ڈرنے والوں کی رہنمائی ہے، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اس مال میں سے مسکینوں، تیموں اور مسافروں پر خرچ کرتا ہے۔ رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھتا ہے اس مال کے ذریعہ جہاد کی کارروائیوں میں حصہ لیتا ہے، امت مسلمہ کے مسائل ومشکلات میں شریک ہوتا ہے، اسی طرح اس کے مال کی برکت تمام نیک کاموں میں ظاہر ہوتی ہے، لیکن جو شخص غلط طریقوں سے مال حاصل کرتا ہے، اس کو کبھی نہ سکون نصیب ہوتا ہے نہ مال سے اس کا دل بھرتا ہے (بلکہ مزید حرص بڑھتی جاتی ہے) یہ مال دنیا میں بھی اس کے لئے وبال جان بن جاتا ہے اور آخرت میں بھی اس کے خلاف گواہی دے گا، وہاں مال خود بولے گا اور کہے گا کہ یہ فلاں کے حق کا ہے، اور یہ ناجائز طریقہ سے حاصل کیا گیا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں بیان ہوا ہے، ابوحمید سعدی کہتے ہیں کہ "حضور ﷺ نے "ازد" کے ابن تبیہ نامی ایک شخص کو عامل بنایا (زکوٰۃ وغیرہ کی وصول پر مقرر کیا) وہ جب وصولی کے بعد

واپس ہوا تو حاصل شدہ کچھ مال تو بیت المال میں داخل کیا اور کچھ یہ کہہ کر اپنے پاس رکھا کہ یہ ہم کو ہدیہ کیا گیا ہے۔ اس کی بات سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں کیوں نہ بیٹھا رہا کہ دیکھتا اس کو ہدیہ کیا جاتا ہے، خدا کی قسم جو شخص بھی اس (مال صدقہ) میں سے کچھ لے گا، قیامت کے دن اس کو اپنی گردن پر لادے ہوئے آئے گا، اونٹ ہوگا تو وہ بلبلا رہا ہوگا، بیل ہوگا تو ڈکار رہا ہوگا۔ پھر آپؐ نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور تین بار فرمایا: اے اللہ ہم نے پہنچا دیا۔

حدیث کا فقہی پہلو

(۱) علماء سلف وخلف میں سے جنھوں نے آیت کریمہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (التوبہ: ۱۰۳) ان کے مال میں سے زکوٰۃ قبول کرلو کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے رہو اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو۔ تمہاری دعا ان کے لئے موجب تسکین ہے۔ آیت میں صدقہ سے مراد زکوٰۃ ہے حدیث شریف اس آیت کی اس طرح وضاحت کرتی ہے کہ یہ مال بڑا دلکش اور میٹھا ہے کیا خوب ہے وہ مسلمان جو اس مال میں سے مسکین ویتیم کو دیتا ہے مسافر کی مدد کرتا ہے۔

(۲) فقیر کو اس کی ضرورت بھر کا مال دینا چاہئے اس معاملہ میں قریب ترین مذہب یہ ہے کہ محتاج کو اتنا دیا جائے جو اس کے فقر کی تنگی کو دور کردے، اور فاقہ کے راستوں کو ختم کردے۔

(۳) مال کا جمع کرنا حرام نہیں ہے لیکن اس کو بڑھانا اعتدال اور اقتصادی تقاضوں سے آگے نکل جانا روح اسلام کے خلاف ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مال دراصل اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، مال کا مالک اور اس کا حاصل کرنے والا وکیل یا امین کی حیثیت رکھتا ہے یہ اس مال کو خرچ کرنے میں آزاد نہیں کہ جہاں چاہے خرچ کرے۔ بلکہ مال کے اصلی مالک کا پابند اور تابع ہے اس کے حکم واشارہ کے مطابق خرچ کرے گا، اور یہ کہ مالک اللہ ہے جو بندوں کا خالق

و پالنہار ہے۔ ’’کیا خوب ہے وہ بندۂ مومن جو اس مال میں سے مسکینوں، یتیموں اور مسافروں پر خرچ کرتا ہے‘‘۔

(۲) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو مال ناجائز طریقہ سے حاصل کیا جاتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی، لہٰذا کمانے کے سلسلہ میں سنت و شریعت کے اصولوں کو اپنانا چاہئے خواہ کمائی کا جو بھی ذریعہ ہو۔

(۳) حدیث یہ بھی بتاتی ہے کہ مال ایک امتحان و آزمائش ہے لہٰذا بندۂ مومن کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اس کے کمانے میں اتنا منہمک ہو جائے کہ اس کے کمانے و خرچ کرنے میں اعتدال و توازن کا دامن چھوڑ دے، او راسی کا ہو رہے اُسے چاہیے کہ ہوشیار اور چوکنا رہے کہ کہیں اس کے فتنہ و آزمائش میں نہ پڑ جائے، جو اس کے لئے باعثِ خیر و برکت ہوسکتا تھا، وہ اس کو لالچ اور دنیاداری کے راستوں اور صورتوں سے پاک رکھے، اظہار شان و شوکت اور تکبر سے دور رہے۔

(۴) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے عوام کی سمجھ میں آنے کے لئے معمولی چیزوں کی مثال دی جاسکتی ہے، تاکہ داعی اپنی بات سہولت و آسانی کے ساتھ دلوں میں اتار سکے اور ذہنوں میں بٹھا سکے۔

(۵) حدیث سے یہ بھی رہنمائی ملتی ہے کہ اگر کسی عالم سے سوال کیا جائے تو وہ راسخ فی العلم ہوتے ہوئے بھی غور و فکر کے لئے جواب کو موخر کردے تاکہ غور و فکر کے بعد مسئلہ کا ایسا صحیح جواب دے جو اپنے سے بھی فائق علما سے معلوم کر لیا گیا ہو۔

(۶) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فقر پر کسبِ معاش کو اولیت حاصل ہے۔

(۷) حدیث سے یہ بھی رہنمائی ملتی ہے کہ فضول خرچی اور زیادہ کھانا اور اس کا حریص ہونا برا ہے۔ ناجائز طریقہ سے کمائی کے مال میں برکت نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اہل حق پر خرچ کی توفیق ملتی ہے۔

حدیث - ۴۰

جہنم کو نفسانی خواہشوں اور جنت کو ناگوار چیزوں سے گھیر دیا گیا ہے

''عن ابی هريرة رضى الله عنه ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال حجبت النار بالشهوات وحجبت الجنة بالمكاره۔''

(فتح الباری، ج ۱۱ص ۳۲۷۔ مسند احمد، ج ۲،ص ۳۳۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہنم خواہشات نفسانی سے اور جنت دل کو ناگوار گزرنے والی چیزوں سے گھیر دی گئی ہے۔

یہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان جامع ملفوظات میں سے ہے، جو خواہشوں کی مذمت بیان کرنے میں نہایت بلیغ اور انوکھا انداز رکھتے ہیں۔ خواہ نفس ان کا کتنا ہی شائق کیوں نہ ہو۔ اسی طرح اطاعت پر آمادہ کرنے کے لئے نہایت ایجاز کا نمونہ ہے خواہ اطاعت کی باتیں دل کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہوں۔

اسلام، اسلامی شخصیت کی تعمیر خدائی نگرانی میں احتیاط کے کٹہرے میں اس حفاظت کے ساتھ اس طرح کرتا ہے کہ قدم کہیں ڈگمگانے نہ پائیں، فکر و رجحان میں کوئی کجی نہ آنے پائے، شیطان کو اس نفس امارہ کے ذریعے ہی انسان پر اثر انداز ہونے کا راستہ ملتا ہے، جو برابر برائی ہی کی طرف مائل کرتا رہتا ہے، اس نفس امارہ کے ذریعے شیطان انسان کو قدم پھسلا دینے والی چیزوں کے ذریعے بہکاتا ہے اور اس کو غلط لذتوں کی طرف موڑتا ہے۔ شہوات نفسانی کی تمنائیں پیدا کر کے، عادات وعبادات دونوں کو بگاڑ دیتا ہے۔

یہ حدیث لغزش میں ڈالنے والی باتوں کا مداوا کرتی ہے اور بندۂ مومن کو موت اور زندگی کی یاددہانی کراتی ہے، قیامت کے منظر اور جہنم کی آگ کی تصویر کشی کرتی ہے۔ اسی طرح جس طرح کہ جنت کی نعمتوں اور اس کے شوق آگیں مناظر کو بیان کرتی ہے کہ دلوں میں اس پر فریفتگی کے جذبات پیدا ہوں اور نفس کی سرکشی کو ختم کرکے اس کو ہمیشہ رہنے والی جنت کی راہ اپنانے کی ڈگر پر لگا دے۔ نفس کی سرکشی کو ختم کرنے کے لئے موت، قیامت کا حساب، قبر کی منزل اور حشر کی یاد دلاتے رہنا بہت مؤثر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَاالْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرُ. (آل عمران:۱۸۵)

ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے، اور تم کو قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا تو جو آتش جہنم سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔"

یہ آیت بندۂ مومن کو جنت کی بہاروں کی طرف متوجہ کرتی ہے اور غلط راہ پر ڈالنے والی اور نفسانی خواہشوں کی طرف لے جانے والی چیزوں سے ڈراتی اور نفس کو باور کراتی ہے کہ اس دنیا کی زندگی چند روزہ اور ایک خاص مدت تک محدود ہے۔ دنیا ایک دن بالکل ختم ہو جائے گی، تمام جاندار چیزیں مر جائیں گی، ہر ایک موت کا گھونٹ پیے گا اور اس زندگی سے محروم ہو جائے گا، اس میں کسی طرح کا کوئی فرق و امتیاز نہ ہوگا نہ امیری غریبی نہ نیک و بد کا۔ ہاں اگر کوئی فرق و امتیاز ہوگا تو وہ انجام میں ہوگا جیسا کہ قرآن کریم نے بیان کر دیا ہے کہ "اور تم کو قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا تو جو آتش جہنم سے دور رکھا گیا، اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا۔"

آیت کے اندر "زحزح" کا لفظ ہی ایسا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ جہنم نفسانی خواہشوں سے گھرا ہوا ہے، لہٰذا نفس کو اس سے ہٹانا اور دور رکھنا نفس کو شاق ہے، اس لئے نفس کے ساتھ مجاہدہ، احساسات اور اعصاب پر قابو پانا اور تقویٰ اختیار کرنا ضروری ہے، تاکہ نفس کی لگام چھوٹنے نہ

پائے کہ وہ جہنم کی کشش سے قریب ہو جائے۔

یہ اسلوب بیان کہ جہنم کو نفسانی خواہشوں سے گھیر دیا گیا ہے، بہت طاقتور اور اصل تصویر سامنے کردینے والا ہے، ایک روایت میں ''حجبت'' کے بجائے حُفَّتِ النار بالشھوات'' حفت کا لفظ آیا ہے مطلب دونوں کا ایک ہی ہے آگ میں بھی ایسی ہی کشش ہے جیسی گناہ میں ہے۔ لہٰذا بندۂ مومن کو اس کی ضرورت ہے کہ اس کو کوئی ایسا شخص ملے جو اسے گناہ کی کشش سے دور کرے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ انسان اپنی تدابیر و ہوشیاری کے باوجود عمل میں کوتاہی کا شکار رہتا ہے۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہے۔ یقیناً انسان آقا کے فضل وعنایت کا محتاج ہے اور مومن کا آگ سے دور کیا جانا اسی وقت ہوسکتا ہے، جب اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو اس کی وضاحت ایک دوسرے انداز سے بھی آئی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت وجہنم کو پیدا کیا تو حضرت جبریل علیہ السلام کو جنت میں بھیجا کہ اس کو دیکھو۔ حضرت جبریلؑ جب جنت دیکھ کر واپس آئے تو بارگاہِ رب العزت میں عرض کیا کہ آپ کی عزت وجلال کی قسم جو شخص بھی جنت کے اس حسن و جمال اور آرام وراحت کے بارے میں سنے گا فوراً اس میں داخل ہو جائے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا اور جنت ناپسندیدہ چیزوں سے گھیر دی گئی، اس کے بعد پھر حضرت جبریلؑ سے فرمایا دوبارہ جنت میں جاؤ جب دوسری بار دیکھ کر واپس ہوئے تو عرض کیا آپ کی عزت وجلال کی قسم! اب تو مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی بھی جنت میں نہ داخل ہو سکے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جہنم کی طرف جاؤ اس کو دیکھو، جب جہنم دیکھ کر واپس ہوئے تو عرض کیا جو بھی جہنم کے بارے میں سنے گا اس میں ہرگز نہ داخل ہوگا، اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ جہنم کو نفسانی خواہشوں سے گھیر دیا جائے، اس کے بعد حضرت جبریلؑ کو حکم ہوا اب جا کر دیکھو، جب وہ دوبارہ دیکھ کر لوٹے تو عرض کیا کہ آپ کی عزت وجلال کی قسم اب تو جہنم سے کوئی بچ نہیں سکتا ہے۔

یہ حدیث دعوت وارشاد کے کام میں لگے ہوئے لوگوں کو ان کی اپنی حقیقت اور منصب کا تعارف کراتی ہے کہ ان کو زندگی اور جہاد کے میدان میں عملی اور واقعی کوششوں سے سابقہ ہے، وہ نفس انسانی کی حقیقت اور اس کے اندر پوشیدہ کمزوریوں کو جانتے ہیں، وہ جماعتوں اور مختلف

معاشروں کی حقیقت ومزاج کو بھی جانتے ہیں، انھیں مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ ان کے اصول دعوت نفسانی خواہشوں کے سامنے کس طرح شکست کھا جاتے ہیں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ شیطان ان دعوتی کام کرنے والے دلوں اور اس راہ کی لغزشوں میں کن راستوں سے داخل ہو جاتا ہے اور اس سے نجات کی کیا صورت ہے، داعی کا یہی شعار ہے، اس راہ کی دشواریوں میں کیسے ثابت قدمی دکھائی جاتی ہے، ناگواری اور کشمکش کے مواقع پر خوف خدا کا کیسا پاس ولحاظ ہوتا ہے کہ نہ تو حق سے ہٹتا ہے کہ حد سے متجاوز ہو کر وہ تجاوز وزیادتی کو درست سمجھتا ہے، اور نہ ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مدد کی امید نہ باقی رہے، داعی مشکلات کو جھیلتا رہتا ہے اور نگاہوں میں کلام نبوت کے یہ بلیغ الفاظ پھرتے رہتے ہیں کہ جنت کے گرد ناگواریوں کا حصار قائم کر دیا گیا ہے دعوت کا کام کرنے والے اس بلیغ نبوی اسلوب بیان کی روشنی میں یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ ناگواریوں کے صحرا و بیابان سے گزرے بغیر جنت میں پہنچنا ممکن نہیں اور جہنم سے نجات اسی وقت ممکن ہے جب کہ نفسانی خواہشوں سے بچا جائے۔

ابن عربی کہتے ہیں کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جہنم کے گرد خواہشات کا حصار قائم کر دیا گیا ہے (جس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ جہنم خواہشات کے پس پردہ ہے جو خواہشات نفسانی کے تقاضوں کو پورا کر کے اس حصار کو توڑ دے گا جہنم اس کے سامنے آجائے گی اور یہی اس کا ٹھکانا بن جائے گی، اور جو اس حصار کو توڑنے سے محفوظ رہا وہ جہنم سے بچ جائے گا۔

(فتح الباری، ج ۱۱، ص ۳۲۰)

بندۂ مومن کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے والی چیزوں میں سے نیک لوگوں کی صحبت اور ان سے جنت وجہنم کا مذاکرہ کرتے رہنا بھی شامل ہے، دیگر احادیث سے اس کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جنت میں ایک کوڑے کی جگہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے اس موقع سے یہ آیت کریمہ پڑھئے: فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدۡخِلَ الۡجَنَّةَ فَقَدۡ فَازَ جو آتش جہنم سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا۔‘‘

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، ''جو شخص یہ چاہتا ہے کہ جہنم سے دور رکھا جائے اور جنت میں داخل ہو تو اس کی موت اس حال میں آنی چاہیئے کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو (شریعت کے مطابق) کرنا چاہیئے۔

(تفسیر ابن کثیر: ج ا۔ آل عمران: ص ۶۵۳)

حدیث میں ''حجبت'' اور ''حفت'' دو لفظ آئے ہیں۔ دونوں کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں۔ جہنم کو خواہشوں سے گھیر دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیوی چیزوں میں جن میں انسان کو مزہ آتا ہے اور شریعت نے ان سے منع کیا ہے یا جن چیزوں کا حکم دیا گیا ہے ان کو چھوڑا جائے، شبہات اور اس کے ساتھ مباحات پر کثرت سے عمل کو بھی اسی میں شامل کر دیا گیا ہے کہ کہیں اس میں تساہلی کے سبب انسان حرام کا مرتکب نہ ہو جائے۔

جنت ناگوار چیزوں سے گھیر دی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بندۂ مومن کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا مکلّف بنا کر نفس کے مجاہدے میں ڈال دیا گیا ہے۔ مثلاً عبادت کو اس کے پورے حقوق کے ساتھ ادا کرنا اور اس پر پابندی کرنا، منع کی ہوئی چیزوں سے قول و عمل دونوں طرح سے بچنا اس کو مکارہ (مشکل و ناپسندیدہ) سے تعبیر کیا گیا ہے، اس لئے کہ اس کے عمل کرنے والے کو مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا کہ وہ آگ میں اسی وقت داخل ہوگا جب اپنی خواہشات نفسانی پر عمل کرے اور جنت میں اس وقت داخل ہوگا جب مشکلات کو برداشت کرے جس کو ''مکارہ'' ناگوار و ناپسندیدہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جنت و جہنم دونوں کے گرد ایک دیوار قائم ہے جو نفسانی خواہشوں پر عمل کر کے جہنم کی دیوار کو توڑ دے گا وہ جہنم میں داخل ہوگا اور جو نفس پر گراں اور دشوار کام یعنی جن کاموں کا حکم ہے ان پر عمل کی مشقت جھیلے گا اور جن باتوں سے روکا گیا ہے ان سے بچے گا اور نفسانی خواہشات کو دبانے کی ناگواری کو برداشت کرے گا وہ جنت کے گرد قائم دیوار کو توڑ کر اس میں داخل ہو جائے گا۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ''یہ حدیث اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ جنت کا راستہ بہت کٹھن اور دشوار گزار ہے، اس کی راہ میں جگہ جگہ سخت گھاٹیاں اور دشواریاں ہیں، مسافت بھی

ڈبل ہے، آفتیں اور مصائب بھی زبردست ہیں، بہت سی رکاوٹیں اور پریشانیاں ہیں، تباہ کن سرنگیں اور جنت تک رسائی سے محروم کردینے والے خطرات ہیں، جنت کی راہ پر پورے آداب کے ساتھ چلنا کٹھن کام ہے۔ جب جنت ایسی ہی ہے کہ جس کو کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی دل میں اس کا تصور وخیال آسکتا ہے تو پھر یہ سودا ہونا بھی چاہئے مہنگا "الا ان سلعة الله غالية، الا ان سلعة الله الجنة" سن لو اللہ کا سودا مہنگا ہے۔ سن لو اللہ کا سودا جنت ہے۔

حدیث کا فقہی پہلو

یہ حدیث مجاہدۂ نفس کا حکم دیتی ہے خواہ عمل کی شکل میں ہو یا ناجائز چیزوں سے باز رہنے کی شکل میں مثلاً عبادات کا اچھی طرح ادا کرنا اور اس پر مداومت کرنا اور منع کی ہوئی چیز سے بچنا خواہ وہ بولنے، کہنے کی صورت میں ہو یا عمل کی صورت میں اس کو "مکارہ" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے اس لئے کہ عمل کرنا مشکل ودشوار ہے، بندہ جہنم میں اسی وقت داخل ہوگا جب اپنی خواہشات کا غلام بن جائے گا، اور جنت اسی صورت میں ملے گی کہ نفس پر شاق گزرنے والے کاموں کو کرے۔

موجودہ حالات اور حدیث

(۱) یہ حدیث بندۂ مومن کو ان خطرات سے آگاہ کرتی ہے، جن میں مبتلا ہو کر انسان جہنم کا سزاوار بن جاتا ہے، ان ہلاکت خیز چیزوں سے کیسے بچے، وہ کیا چیزیں ہیں جن سے مومن خواہش نفسانی اور آنکھوں کی پسند اور پیٹ کی طلب یا اسی طرح کی دوسری چیزوں اور مطالبات نفس کے بارے میں دھوکا کھاتا ہے۔

(۲) جس طرح یہ حدیث خطرات سے آگاہ کرتی ہے، اسی طرح ان اچھائیوں اور نیک عادتوں کی طرف رہنمائی بھی کرتی ہے، جو اللہ کے قرب کا ذریعہ بنتی ہیں اور دلوں میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت تجلیات کو محبوب بنادیتی ہیں جس دن اللہ کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا، اس کے سایہ کا شوق پیدا کردیتی ہیں۔

صحابہ کرامؓ: جن کی روایتیں شامل کتاب ہیں

حضرت ابو ہریرہؓ

سید الحفاظ، امام، فقیہ، مجتہد، صحابیٔ رسول، حضرت ابو ہریرہؓ یمن کے قبیلے دوس سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نام کیا تھا؟ اس سلسلے میں بہت سے اقوال ہیں۔ سب سے راجح قول یہ ہے کہ ان کا نام عبدالرحمٰن بن صخر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ان کا نام عبدشمس ابوالاسود تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا نام عبداللہ رکھا اور کنیت ابو ہریرہ۔ ان کی ماں کا نام میمونہ بنت صبیح تھا۔ انھوں نے نبی ﷺ سے غیر معمولی مقدار میں پاکیزہ اور بابرکت علم حاصل کیا۔ کثرت روایت میں ان کا کوئی ہم سر نہیں ہے۔ اسی طرح انھوں نے ابیؓ، ابوبکرؓ، عمرؓ، اسامہؓ، عائشہؓ، فضلؓ اور کعب احبار سے بھی روایت کی ہے۔ صحابہ وتابعین کی بڑی تعداد نے ان سے روایت کی ہے۔

غزوہ خیبر کے سال ۷ھ کے اوائل میں وہ مدینہ تشریف لائے اور اسلام قبول کیا۔ عبدالرحمٰن فرماتے ہیں: میں نے ابو ہریرہؓ کو دیکھا ہے۔ ان کی رنگت گندمی، سینہ کشادہ اور داڑھی کا رنگ سرخ تھا۔ کریمہ بنت الحسحاس فرماتی ہیں: میں نے ام الدرداء کے گھر میں ابو ہریرہؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: تین چیزیں کفر ہیں: نوحہ کرنا، گریبان چاک کرنا اور نسب کو مطعون کرنا۔ ابن سیرین کہتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ نے ایک موقعے پر فرمایا: بسا اوقات میں بھوک کے مارے زمین پر گر پڑتا تھا یہاں تک کہ لوگ کہتے تھے: ''اسے جنون ہوگیا ہے۔''

عمر بن ذر، مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم میں بسا اوقات بھوک سے نڈھال ہوکر زمین پر گر پڑتا تھا، کبھی بھوک کو دبانے کے لئے پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میں ایک گزرگاہ پر بیٹھا تھا۔ وہاں سے ابوبکرؓ گزرے۔ ان سے میں نے کتاب اللہ کی ایک آیت دریافت کی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ میری حالت دیکھ کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ لیکن وہ چلے گئے۔ مجھے اپنے ساتھ نہ لے گئے۔ پھر وہاں سے عمرؓ کا گزر ہوا، ان کے ساتھ بھی میں نے ویسا ہی کیا، لیکن وہ بھی مجھے اپنے ساتھ نہ لے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ وہاں سے گزرے۔ آپؐ نے میرا چہرہ دیکھ کر میری بھوک کا اندازہ کرلیا۔ فرمایا: ابو ہریرہ؟ میں نے عرض کیا لبیک یا رسول اللہ۔ پھر میں آپؐ کے ساتھ ہولیا۔ آپؐ اپنے گھر تشریف لے گئے تو وہاں دودھ کا ایک پیالہ پایا۔ آپؐ نے گھر والوں سے دریافت کیا: یہ کہاں سے آیا؟ جواب ملا: فلاں نے آپؐ کے لئے بھیجا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اے ابو ہریرہ جاؤ اہل صفہ کو بلالاؤ'' ابو ہریرہ فرماتے ہیں: اہل صفہ مہمانان اسلام تھے۔ ان کے ساتھ اہل وعیال تھے نہ ان کے پاس مال ودولت تھی۔ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ میں جاکر انھیں بلالایا۔ وہ آکر بیٹھ گئے تو آپؐ نے فرمایا: ابو ہریرہ لو یہ انھیں پلاؤ۔ میں انھیں پلانے لگا۔ جب ایک شخص پی کر خوب سیراب ہو جاتا تو میں اس سے پیالہ لے کر دوسرے شخص کو پیش کرتا۔ یہاں تک کہ جب لوگ پی کر سیراب ہوگئے تو میں نے پیالہ واپس رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کردیا۔ آپؐ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا: اب صرف ہم دونوں۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول آپؐ نے سچ فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا: اب تم پیو۔ میں نے تھوڑا سا پیا، آپؐ نے فرمایا: اور پیو، میں نے کچھ اور پیا۔ آپؐ برابر فرماتے رہے: ''اور پیو''۔ اور میں تعمیل حکم میں پیتا چلا گیا۔ یہاں

تک کہ میں نے عرض کیا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اب بالکل گنجائش نہیں ہے۔ تب آپؐ نے پیالہ لے کر باقی دودھ نوش فرمایا۔

حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں غزوۂ خیبر کے بعد چار سال رہے۔ وہ ازواج مطہرات کے گھروں میں بھی آپؐ کے ساتھ رہ کر آپ کی خدمت کرتے، آپؐ کے پیچھے نماز پڑھتے۔ حج کرتے، غزوات میں شریک رہتے اور آپؐ کی مجالس سے غیر حاضر نہ رہتے۔ مسجد ان کی رہائش تھی اور رسول اللہ ﷺ ان کے امام تھے۔ اس طرح انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی بہت سی سنتوں کو جان لیا تھا اور شریعت کی بہت سی باریکیوں کا مشاہدہ کرلیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کو بھی حدیثیں حاصل کرنے کی ان کی شدید خواہش اور علم سے ان کی محبت کا علم تھا۔ اسی لئے وہ جو کچھ آپ سے سوال کرتے آپ فوراً اس کا جواب دیتے تھے، ان کے لیے توفیق الٰہی کی دعا کرتے تھے اور انھیں خصوصی تعلیم وتربیت سے نوازتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ اپنے بارے میں خود بیان کرتے ہیں: ''میرے مہاجر ساتھی اپنی زمین جائیداد اور اس کی نگہداشت میں مصروف رہتے تھے۔ میں غریب آدمی تھا۔ ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہتا اور آپؐ کے ارشاداتِ عالیہ کو سن کر یاد کرلیا کرتا تھا۔ جب کہ میرے ساتھیوں کو اس کی توفیق کم ہی ملتی تھی۔ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے کچھ بیان کیا، پھر فرمایا: ''کون ہے جو اپنا کپڑا پھیلائے، میں اس میں اپنی حدیثیں انڈیل دوں۔ پھر وہ اسے سمیٹ لے، ایسا کرنے پر وہ جو کچھ مجھ سے سنے گا کبھی نہ بھولے گا''۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اپنا کپڑا پھیلایا پھر اسے سمیٹ لیا۔ اللہ کی قسم اس کے بعد جو کچھ میں نے آپؐ سے سنا کبھی نہیں بھولا۔

سنن نسائی میں ہے کہ ایک مرتبہ ابوہریرہؓ نے اپنے لئے دعا کی: أَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْأَلُكَ عِلْماً لَا یُنْسیٰ (اے اللہ میں تجھ سے ایسے علم کا سوال کرتا ہوں جسے کبھی نہ بھولوں) نبی ﷺ نے فرمایا: آمین۔

ان کی مرویات کی تعداد زیادہ ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ سوال کرنے میں بے باک تھے۔

معاذ بن محمد سے روایت ہے کہ حضرت ابی بن کعب نے فرمایا: ابوہریرہؓ نبی ﷺ سے سوال کرنے میں بڑے بے باک تھے۔ بسااوقات وہ آپؐ سے ایسے سوالات کرلیتے تھے جن کی ہم جرأت نہیں کرپاتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے پانچ ہزار تین سو چوہتر احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے تین سو چھتیس احادیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں ہیں۔ ان کے علاوہ ترانوے احادیث صرف صحیح بخاری میں اور اٹھانوے احادیث صرف صحیح مسلم میں ہیں۔

سلیم بن بشیر فرماتے ہیں کہ ابوہریرہؓ اپنے مرض وفات میں رونے لگے۔ کسی نے دریافت کیا: کیوں رورہے ہیں؟ فرمایا: میں تمہاری اس دنیا سے جدائی پر نہیں رورہا ہوں۔ بلکہ میرے رونے کا سبب یہ ہے کہ سفر طویل ہے اور زادراہ کم۔ میری زندگی کی شام ایسی صورت میں ہورہی ہے کہ اب یا تو مجھے جنت کی بلندی حاصل ہوگی یا جہنم کی پستی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔

واقدی فرماتے ہیں: ابوہریرہؓ ذوالحلیفہ میں رہتے تھے۔ مدینہ میں ان کا ایک گھر تھا جسے اپنے آزاد کردہ غلاموں کو دے دیا تھا۔ ۵۹ھ میں اٹھتر سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

حضرت ابو کبشہ انماریؓ

حضرت ابو کبشہ انماریؓ کا شمار ان صحابہ کرام میں ہوتا ہے، جو نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے سے قبل مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ ان کا تعلق سرزمین دوس سے تھا۔ ان کے نام کے سلسلے میں اختلاف ہے۔ ابن حبان نے اپنی کتاب الثقات میں ان کے حالات میں لکھا ہے: عبداللہ بن ابی کبشہ: ان کا نام ابو کبشہ الانماری سعید بن عمر ہے۔ بعض نے لکھا ہے: وہ شام میں رہے۔ ان کا نام عمرو بن سعید ہے۔ بعض نے ان کا نام عمیر۔ بعض نے عامر اور بعض نے سلیم بتایا ہے۔ ابو احمد الحاکم فرماتے ہیں: ''وہ صحابی ہیں۔ ان کا نام عمیر بن سعد ہے''۔ ترمذی نے بھی یہی لکھا ہے کہ جن لوگوں کا نام عمرو تھا ان میں امام بخاری نے ان کو بھی شمار کیا ہے اور ان کے نام میں اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ بیہقی نے دلائل النبوۃ میں مسعودی کی سند سے روایت کیا ہے کہ ابو کبشہ نے فرمایا: غزوۂ تبوک کے سفر میں جب لوگ مقام حجر (حجر قوم ثمود کے علاقے کا نام ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے عذاب نازل فرمایا تھا) تک پہنچنے کی جلدی کرنے لگے تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ اس وقت آپ اپنے اونٹ کی نکیل تھامے ہوئے فرما رہے تھے: تم لوگ ایسی قوم کے علاقے میں کیوں جا رہے ہو جس پر اللہ کا غضب نازل ہوا تھا......'' اس حدیث سے اشارۃً معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت ابو کبشہ بعض تاریخی مواقع پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے تھے، اس سے نبی ﷺ کے ساتھ ان کے شدتِ تعلق کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

حضرت ابو کبشہؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے بھی روایت کی ہے۔ اور ان سے ان کے دونوں بیٹوں عبداللہ اور محمد کے علاوہ سالم بن ابی الجعد اور دیگر نے بھی روایت کی ہے۔ حضرت ابو کبشہؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدر و احد اور دوسرے تمام معرکوں میں شریک رہے ہیں۔ جس دن حضرت عمر بن الخطابؓ خلیفہ بنائے گئے اسی دن ان کا انتقال ہوا۔ یہ سہ شنبہ کا دن اور ۱۳ھ جمادی الآخرۃ کی بائیس تاریخ تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود بن غافل بن حبیب ہذلی ہیں۔ یہ بنو زہیر کے حلیف تھے۔ ان کا شمار سابقین اولین اور اصحاب علم اور معزز صحابہ میں ہوتا ہے۔ غزوۂ بدر میں شریک رہے۔ دونوں ہجرتیں (ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ) کیں۔ ان کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں۔ ان کی ذات سے بڑا علمی فیض پہنچا۔ ان کی روایات بڑی تعداد میں ہیں اور مستند بھی۔ ان میں سے چونسٹھ احادیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں ہیں۔ اکیس احادیث صرف بخاری میں ہیں۔ پینتیس احادیث صرف مسلم میں ہیں.. باقی کتب احادیث میں ان کی روایات کی تعداد مکررات کے ساتھ آٹھ سو چالیس ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود دبلے جسم، پستہ قد، گندمی رنگت، اور پتلی ٹانگوں والے تھے۔ ان کا شمار ذہین اور اہل علم صحابہ میں ہوتا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ اپنے والد کے بعد تلاش معاش میں مکہ آئے اور وہاں عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چرانے لگے۔ ایک دن ان کی ملاقات دو آدمیوں سے ہو گئی۔ ان میں سے ایک نے ان سے بڑی شیریں گفتگو کی۔ اس سے مل کر انھیں بڑی خوشی ہوئی۔ بعد میں انھیں معلوم ہوا کہ یہ دونوں اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ او

ران کے ساتھی ابوبکرؓ ہیں۔ یہ معلوم ہوتے ہی وہ عقبہ کے پاس آتے ہیں۔ اس کی بکریاں اس کے پاس چھوڑ کر نبی ﷺ کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کی خدمت میں پہنچ کر آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ جو باتیں انھوں نے آپ سے سنی تھیں، انھیں سکھا دیں۔ آپ نے دعوت پیش کی، جسے سن کر وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم بڑے سمجھ دار بچے ہو''۔

حضرت ابن مسعودؓ اپنے بارے میں فرماتے ہیں: ''میں اسلام قبول کرنے والا چھٹا فرد تھا۔ ہمارے علاوہ زمین پر کوئی مسلمان نہ تھا۔ ابن مسعود کو دو ہجرتیں کرنے کا شرف حاصل ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: غزوۂ احد میں ایک نازک موقعے پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو چار صحابہ رہ گئے تھے، حضرت ابن مسعودؓ ان میں سے ایک تھے۔ حضرت ابن مسعودؓ ہمہ وقت حضرت ﷺ کے ساتھ رہتے تھے کبھی آپ سے جدا نہ ہوتے تھے۔ آپ کے نعلین، مسواک اور وضو کے پانی کے ذمہ دار تھے۔

حضرت ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں: میں اپنے بھائی کی ساتھ یمن سے آیا۔ ہم لوگ کچھ عرصہ تک ابن مسعود کو رسول ﷺ کے گھر کا ایک فرد سمجھتے رہے۔ اس لئے کہ وہ کثرت سے آپ کے گھر والوں کے پاس آتے جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: ''کتاب اللہ کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے، جس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں اور کس مسئلے میں نازل ہوئی تھی'' مزید فرماتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر ستر سورتیں یاد کی ہیں، آپ کے اصحاب کو معلوم ہے کہ میں ان میں کتاب اللہ کا سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کتاب اللہ کا علم کسی کے پاس مجھ سے بڑھ کر ہے تو میں ضرور اسے حاصل کرنے کے لئے اس کے پاس جاتا۔

حضرت عمار فرماتے ہیں: ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ابن مسعودؓ کے پاس سے ہوا۔ اس وقت وہ قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ''جس شخص کی خواہش ہو کہ قرآن کو اسی طرح تر و تازہ پڑھے، جس طرح وہ نازل ہوا تھا، تو اسے ابن مسعود سے سننا چاہیے''۔ ان کے فضائل میں سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے جو حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ''اگر میں بغیر مشورے کے کسی کو مسلمان کا امیر بناتا تو ابن ام عبد کو بناتا'' حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ کی اقتدا کرو، عمار کے طریقہ پر چلو، ابن ام عبد کے عہد کو مضبوطی سے تھام لو۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا، مجھے قرآن سناؤ، میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول، آپ کو سناؤں جبکہ وہ آپ ہی پر نازل ہوا ہے، فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ دوسرے سے سنوں، میں نے سورہ نساء کی تلاوت شروع کی۔ یہاں تک کہ جب میں آیت فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ شَهِيْدًا (پھر سوچو کہ اس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمہیں گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے) پر پہنچا تو آپ نے اپنے پیر سے دبا کر مجھے رک جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کی آنکھیں اشک بار تھیں۔

حضرت ابن مسعود دعا کرتے تو کہتے تھے: خائف مستجیر، تائب مستغفر، راغب راھب، (اے اللہ، اپنی عاقبت کے بارے میں خوف و اندیشہ کا شکار ہوں، تیری پناہ کا طالب ہوں۔ توبہ و استغفار کرتا ہوں۔ تیرے

انعامات کا مشتاق اور تیرے عذاب سے لرزاں ہوں) وہ فرماتے تھے: جو آخرت کا طالب ہو، اس نے اپنی دنیا کو نقصان پہنچایا اور جو دنیا کا طالب ہوا اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا۔ لوگو! ہمیشہ باقی رہنے والی چیز کے لئے فنا ہو جانے والی چیز کو قربان کر دو"۔ یہ پاکیزہ باتیں، یہ بہترین عادات واطوار اور خانوادۂ نبوت میں ان کی مستقل حاضری، ان چیزوں کا، صحابہ کے درمیان حضرت ابن مسعودؓ کی شخصیت کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی وفات ۳۲ھ میں مدینہ میں ہوئی۔ بقیع میں مدفون ہوئے۔

حضرت انس بن مالکؓ

حضرت انس بن مالکؓ کا سلسلہ نسب یہ ہے: انس بن مالک بن النضر بن ضمضم بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار۔ ان کی کنیت ابوحمزہ تھی وہ مدینہ کے رہنے والے تھے۔ اور ان کا تعلق انصار کے قبیلے خزرج کی شاخ بنونجار سے تھا۔ امام، مفتی، قاری اور محدث تھے، کثرت سے احادیث روایت کی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے خادم، صحابہ میں سب سے آخر میں وفات پائی۔

نبی ﷺ سے براہ راست بہت سی احادیث روایت کیں اور حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، معاذؓ، اسید بن الحضیرؓ، ابوطلحہؓ، اپنی ماں ام سلیم بنت ملحان، اپنی خالہ ام حرام، ان کے شوہر عبادۃ بن صامت اور ابوذر رضی اللہ عنہم کے واسطے سے بھی روایت کی۔ ان کے واسطے سے ایک بڑی تعداد نے روایات نقل کی ہے ان میں حسن، ابن سیرین، شعبی، مکحول اور عمر بن عبدالعزیز بھی ہیں۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں: "میری ماں ام سلیم مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئیں۔ اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول، یہ میرا بیٹا انیس ہے۔ اسے آپ کے پاس لے کر آئی ہوں یہ آپ کی خدمت کرے گا۔ اس کے لئے دعا فرما دیجئے آپ نے دعا کی: اے اللہ اسے بہت سا مال عطا کر اسے کثیر آل اولاد سے نواز"۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں اللہ کے رسول ﷺ کی یہ دعا مقبول ہوئی، اللہ کی قسم آج میرے پاس ڈھیر سا مال ہے اور میرے بیٹوں اور پوتوں کی تعداد ۱۰۰ سے متجاوز ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے میرے لئے دعا فرمائی: "اے اللہ اس کو کثیر مال اور اولاد عطا فرما اور اس کی عمر دراز فرما"...... اس دعا کی قبولیت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے میری دولت میں اس قدر اضافہ کیا کہ میرا انگور کا باغ سال میں دو مرتبہ پھل دیتا ہے اور میری صلبی اولاد کی تعداد ایک سو تین ہے۔

ابوخلدہ فرماتے ہیں: میں نے ابوالعالیہ سے دریافت کیا: کیا حضرت انس نے نبی ﷺ سے سنا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: انھوں نے تو رسول اللہ ﷺ کی دس سال خدمت کی ہے۔ آپؐ نے ان کے لئے دعا فرمائی۔ اس کے نتیجے میں ان کا ایک باغ سال میں دو مرتبہ پھل دیتا تھا۔ اس باغ میں ایک پودا تھا۔ جس کے پھولوں سے مشک کی سی خوشبو آتی تھی۔ آں حضرت ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد سے وصال تک حضرت انسؓ آپ کی صحبت میں رہے اور خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے آپؐ کے ساتھ متعدد غزوات میں شرکت کی۔ انھیں بیعت رضوان میں بھی شریک ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت کا ایک مظہر یہ تھا کہ انھیں خانوادۂ نبوت میں داخل ہونے کے مواقع اس وقت ملے جب وہ ابھی بہت چھوٹے تھے۔ وہ امہات المومنین کی خدمت میں آتے جاتے، وفود کا استقبال کرتے، نبی ﷺ کے لئے پانی اور

مسواک فراہم کرنے کی خدمات انجام دیتے، آپؐ کے ارشادات کو اپنے دل و دماغ میں محفوظ کرتے اور آپؐ کے تربیتی واقعات کو اپنے ذہن کی گہرائیوں میں راسخ کرتے۔ یہاں تک کہ ان کے پاس اسلامی تعلیمات واحکام کا قابل لحاظ ذخیرہ اور نادر سرمایہ اکٹھا ہو گیا جو لوگوں کے واسطے سے مختلف شہروں میں پہنچا پھر احادیث کی کتابوں میں مدون ہوا۔

یہ علم حدیث پر اللہ تعالیٰ کی عنایت خاص تھی کہ اس نے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انس بن مالکؓ جیسے افراد پیدا کئے جنھوں نے اس مہتم بالشان علم کی خدمت اور اشاعت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ حضرت انسؓ نے رسول اللہ ﷺ کو گھر میں بھی دیکھا اور بازار میں بھی، مسجد میں بھی دیکھا اور میدان کارزار میں بھی۔ ان کے صاحبزادے موسیٰ بن انس بیان کرتے ہیں کہ انھوں (انسؓ) آٹھ غزوات میں شرکت کی تھی۔ حضرت انسؓ ہر ہر کام میں آں حضرت کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے ان کے بارے میں فرمایا: ''میں نے ابن ام سلیم (یعنی انسؓ) سے زیادہ رسول اللہ ﷺ جیسی نماز پڑھتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا''۔

رسول اللہ ﷺ کی عبادت، اخلاق اور دین داری کا اثر فطری طور پر حضرت انسؓ پر پڑا تھا۔ حضرت ثمامہؒ فرماتے ہیں: حضرت انسؓ نماز پڑھتے تھے تو طول قیام سے ان کے پیروں میں خون جھلکنے لگتا تھا۔ ان کا دل پاکیزہ تھا اور ان کا تعلق اپنے رب سے بہت مضبوط تھا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستجاب الدعاء بھی تھے۔ ثابت البنانی بیان کرتے ہیں: حضرت انسؓ کی جائیداد کا نگراں آیا اور اس نے خبر دی کہ آپ کی زمین کو سینچائی کی ضرورت ہے۔ حضرت انس نیچے اترے پھر وہ میدان میں نکلے، نماز پڑھی پھر دعا مانگی، ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ بادل کا ایک ٹکڑا آیا اور ان کی زمین کے اوپر برسنے لگا اس قدر بارش ہوئی کہ ان کے کھیت پانی سے بھر گئے۔ یہ گرمی کا زمانہ تھا۔ انھوں نے گھر کے ایک آدمی کو بھیج کر معلوم کرایا کہ پانی کہاں تک برسا ہے؟ پتا چلا کہ ان کے کھیت کے حدود سے بس تھوڑا آگے تک بارش ہوئی تھی۔ ایسی ہی ایک روایت ثمامہ سے بھی منقول ہے۔ یہ حضرت انسؓ کی ایک واضح کرامت تھی جو دو سندوں سے ثابت ہے۔

حضرت ام سلیمؓ کے خاندان پر رسول ﷺ کی خاص نظر عنایت تھی۔ آپؐ ان کے گھر والوں سے محبت کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً ان کے یہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اس چیز نے حضرت انس کی تربیت، ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما، ان کے جوش و جذبہ، سنت کے نقوش کے گہرے فہم اور احادیث کی نشر و اشاعت پر بڑا اثر ڈالا۔ حمید حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ''نبی ﷺ ایک مرتبہ ام سلیمؓ کے گھر تشریف لے گئے، انھوں نے کھجور اور گھی پیش کیا، آپؐ نے فرمایا: ''انھیں واپس لے جاؤ، میں روزے سے ہوں'' پھر آپؐ نے گھر کے ایک گوشے میں ہمیں نفل نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد آپؐ نے ام سلیمؓ اور ان کے گھر والوں کے لئے دعا فرمائی۔ ام سلیمؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپؐ نے میرے لئے دعا فرمائی۔ دنیا اور آخرت کے بھلائی کی کوئی دعا ایسی نہ تھی جو آپؐ نے نہ کی ہو۔ پھر فرمایا: اے اللہ! اسے مال اور اولاد سے نواز اور ان میں برکت دے''۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: اس دعا کی مقبولیت کے نتیجے میں میں انصار میں سب سے مال دار شخص ہوں۔ اور میری بیٹی نے بیان کیا کہ حجاج کے بصرہ آنے تک میری صلب سے ایک سو انتیس بچے دفن ہوئے۔

حضرت انسؓ مختلف شہروں میں جا کر لوگوں کو حدیث کی تعلیم دیتے اور ان کے سامنے اخلاق

وکردار، عمل، اور نماز میں رسول اللہ ﷺ کا نمونہ پیش کرتے تھے۔

حضرت انسؓ حجاج کے مظالم کی وجہ سے اس کے مخالفین میں شامل ہو گئے تھے۔

حضرت انسؓ کی وفات ۹۳ھ میں ہوئی۔ اس اعتبار سے انھوں نے ایک سو تین سال عمر پائی۔ ان سے دو ہزار دو سو چھیاسی (۲۲۸۶) احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے ایک سو اسی احادیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں، اسّی احادیث صرف بخاری میں اور نوے احادیث صرف صحیح مسلم میں ہیں۔

(دیکھئے سیر اعلام النبلاء ص: ۳۹۵-۴۰۶، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ جلد ا ص: ۷۱-۷۲)

حضرت عباسؓ بن عبد المطلب

حضرت عباس بن عبد المطلب رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہجرت سے قبل ہی اسلام لا چکے تھے، لیکن انھوں نے اپنا مسلمان ہونا مخفی رکھا تھا۔ غزوۂ بدر کے موقع پر وہ اپنی قوم (قریش) کے ساتھ نکلے تھے۔ جب وہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تو انھوں نے مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ واللہ اعلم

حضرت عباسؓ سے متعدد احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے پینتیس احادیث مختلف کتب احادیث میں منقول ہیں۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم دونوں میں ایک حدیث ہے۔ صحیح بخاری میں صرف ایک حدیث اور صحیح مسلم میں صرف تین احادیث ہیں۔

حضرت عباسؓ کی ولادت عام الفیل سے تین سال قبل ہوئی، وہ دراز قد، حسین صورت اور کڑک دار آواز کے مالک تھے۔ انھیں حلم و بردباری کا وافر حصہ ملا تھا۔ وہ اپنی قوم کے سرداروں میں سے تھے۔ ابو رزین سے روایت ہے کہ کسی نے حضرت عباسؓ سے دریافت کیا: آپ بڑے ہیں یا نبی ﷺ؟ انھوں نے جواب دیا: ''وہ (نبی) بڑے ہیں۔ البتہ میں ان سے پہلے پیدا ہوا ہوں۔''

حضرت عباسؓ پڑوسی کی حمایت اور داد و دہش کرتے تھے۔ دوسروں کی پریشانیوں اور مصیبتوں میں کام آتے تھے۔ ان کے دوست ابو سفیان بن حربؓ تھے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: عباس کو گرفتار کرنے والے ابو الیسر تھے۔ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا۔ تم نے انھیں کیسے گرفتار کیا تھا؟ انھوں نے جواب دیا: انھیں گرفتار کرنے میں مجھے ایک ایسے شخص نے مدد دی جسے میں نے کبھی پہلے دیکھا تھا نہ کبھی بعد میں دیکھا۔ اس کی ایسی ہیئت تھی۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: تمہاری مدد کرنے والا ایک معزز فرشتہ تھا۔

نبی ﷺ نے عباسؓ سے فرمایا: آپ اپنا فدیہ دیجیے اور ساتھ ہی اپنے بھتیجے عقیل، نوفل بن حارث، اور اپنے حلیف عتبہ بن جحدم کا بھی فدیہ دیجئے، انھوں نے انکار کیا اور کہا: میں تو پہلے سے مسلمان ہوں۔ میری قوم کے لوگ مجھے زبردستی لے کر آئے تھے۔ آں حضور ﷺ نے فرمایا: آپ کے معاملے کی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اگر آپ کی بات صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزا دے گا۔ جہاں تک آپ کا ظاہری معاملہ ہے تو وہ ہمارے خلاف تھا۔ اس لئے آپ اپنا فدیہ دیجیے۔

نبی کریم ﷺ کا یہ موقف عدل، انصاف اور محبت سے مملو تھا اور اس میں صلہ رحمی کا خیال رکھا گیا تھا۔

آپ کو معلوم ہوا کہ عباسؓ کے پاس بیس اوقیہ سونا ہے۔ انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول اسے میری طرف سے فدیہ سمجھ لیجیے، آپؐ نے فرمایا: نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا ہے۔ انھوں نے عرض کیا: میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی مال نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: وہ مال کس کا ہے جو آپ نے مکہ میں ام الفضل کے پاس رکھوایا ہے۔ اس وقت وہاں آپ دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ اگر میں اس سفر میں کام آ جاؤں تو اتنا مال فضل کا ہے۔ اتنا قثم کا اور اتنا عبد اللہ کا۔ عباس نے عرض کیا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اس چیز کا ام الفضل کے علاوہ کسی کو علم نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ عباسؓ نے ایک موقع پر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیس اوقیہ سونے کے بدلے بیس غلام عطا کئے جو سب کے سب مال دار تھے۔ اس کے علاوہ مجھے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید ہے۔

ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: شام ہوتے ہوتے تمام بدری قیدیوں کی مشکیں کس دی گئی تھیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کو نیند نہیں آئی۔ کسی نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا: میرے چچا کے کراہنے کی آواز نے میری نیند اڑا دی ہے۔ لوگوں نے ان کی مشکیں کھول دیں۔ جب ان کے کراہنے کی آواز بند ہوئی تب جا کر رسول اللہ ﷺ کو نیند آئی۔ مطلب بن ربیعہ سے روایت ہے کہ ایک موقعے پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو مجھے عباس کے معاملے میں تکلیف پہنچاتے ہیں۔ چچا باپ کے درجے میں ہوتا ہے۔ جس نے عباس کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھے تکلیف پہنچائی۔ واقعات سے ثابت ہے کہ غزوہ حنین میں ایک موقعے پر جب مسلمان فوج ہزیمت سے دوچار ہو گئی تھی حضرت عباسؓ نبی ﷺ کے خچر کے لگام تھامے ہوئے آپ کے ساتھ میدان میں جمے ہوئے تھے یہاں تک کہ جنگ کا پانسا پلٹا اور مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔

ایک موقعے پر نبی ﷺ نے فرمایا: ''یہ عباس ہیں۔ تمہارے نبی کے چچا۔ قریش میں سب سے زیادہ فیاض اور سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والے'' ابن عمرؓ فرماتے ہیں: ''عام الرمادہ'' میں جب کہ شدید قحط پڑا تھا حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ کے وسیلے سے استسقاء کی دعاء کی تھی۔ ان کی دعا کے الفاظ یہ تھے: اے اللہ یہ تیرے نبی کے چچا ہیں۔ ہم ان کے واسطے سے تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمارے لئے بارش نازل فرما۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بارش ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے درمیان خطبہ دیا تو فرمایا: رسول اللہ ﷺ اپنے چچا عباسؓ کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتے تھے جیسا لڑکا اپنے باپ کے ساتھ کرتا ہے۔، وہ ان کی تعظیم و تکریم کرتے، ان کی قسم کو پورا کرتے۔ لوگو تم بھی ان کے معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کرو۔ اور انھیں اپنی پریشانیوں میں بارگاہ الٰہی میں وسیلہ بناؤ''۔

حضرت عباسؓ اٹھاسی سال زندہ رہے۔ ان کی وفات ۳۲ھ میں ہوئی۔ حضرت عثمانؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع میں مدفون ہوئے۔ (سیر اعلام النبلاء جلد۲ص:۷۸۔۱۰۳)

حضرت عمر بن الخطابؓ

حضرت عمر بن الخطابؓ کا سلسلہ نسب یہ ہے: عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبد العزیٰ بن عدی بن کعب بن لوی، قبیلہ قریش کی شاخ بنو عدی سے تعلق تھا۔ کنیت ابو حفص اور لقب الفاروق تھا۔ نبوت کے چھٹے

سال اسلام قبول کیا۔ اس وقت ان کی عمر ستائیس سال تھی۔ وہ قبیلہ قریش کے معزز لوگوں میں سے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں سفارت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ جب قریش کی بعض شاخوں کے درمیان آپس میں یا کسی دوسرے قبیلے سے جنگ ہوتی تو انھیں سفیر بنا کر بھیجا جاتا۔ ان کا شمار سابقین اولین، عشرہ مبشرہ بالجنۃ، خلفاء راشدین اور بڑے علماء و زہاد صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کی صاحب زادی حضرت حفصہؓ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے تھیں۔

امام ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک موقع پر دعا فرمائی: اے اللہ عمر بن الخطاب اور ابوجہل بن ہشام میں سے کسی ایک کے ذریعے جو تجھے زیادہ محبوب ہو، اسلام کو طاقت نصیب فرما۔ امام احمد نے حضرت عمرؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں وہ اپنے اسلام قبول کرنے سے پہلے کا ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں ''میں ایک مرتبہ رسول ﷺ کو نقصان پہنچانے کے ارادے سے نکلا۔ میں نے دیکھا کہ آپ مجھ سے پہلے مسجد پہنچ گئے۔ میں آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ آپ نے سورۂ الحاقہ کی تلاوت شروع کی۔ قرآن سن کر مجھے اس کے حسن ترتیب و تالیف پر حیرت ہونے لگی۔ میں نے اپنے جی میں کہا۔ اللہ کی قسم یہ تو شعر ہے جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔ اسی وقت میں نے آپ کو ان آیات کی تلاوت کرتے ہوئے سنا: إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ، قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ (الحاقۃ: ۴۰، ۴۱) (یہ کہا ہے ایک پیغام لانے والے سردار کا کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ تم تھوڑا یقین کرتے ہو) اسی وقت اسلام میرے دل میں گھر کر گیا تھا۔

یہ رسول ﷺ کی دعا کی پہلی برکت تھی۔ اسلام عمر کے دل و دماغ میں سرایت کرنے اور ان کے وجدان و احساسات کو برانگیختہ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ انھیں اپنی بہن اور بہنوئی کے اسلام قبول کرنے کی اطلاع ملی۔ وہ ان کے گھر کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر ان دونوں سے کہا: پتا چلا ہے کہ دونوں بے دین ہو گئے ہو۔ ان کے بہنوئی نے کہا: اے عمر ہم دوسرا دین قبول نہ کریں خواہ وہ برحق ہو؟ یہ سننا تھا کہ عمر بھڑ گئے۔ انھیں پکڑ کر خوب زدوکوب کیا۔ ان کی بہن نے یہ دیکھا تو انھیں طیش آ گیا۔ انھوں نے کہا: ہم دوسرا دین قبول نہ کریں خواہ وہ برحق ہو؟ میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ یہ دیکھ کر عمر کا دل پسیج گیا۔ انھوں نے کہا تمھارے پاس جو کتاب ہے اسے مجھے بھی دکھاؤ۔ میں پڑھ کر دیکھوں۔ بالآخر وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

ابن سعد اور طبرانی نے ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا: عمر کا قبول اسلام فتح و کامرانی، ان کی ہجرت نصرت الٰہی اور ان کی خلافت رحمت تھی۔ ہم عمر کے اسلام قبول کرنے سے پہلے تک مسجد حرام میں نماز نہ پڑھ سکتے تھے۔ لیکن جب عمر نے اسلام قبول کر لیا تو انھوں نے لڑ جھگڑ کر یہ حق حاصل کیا۔ چنانچہ اس کے بعد مسجد حرام میں نماز ادا کرنے پر مشرکین ہم سے تعرض نہ کرتے تھے۔

بخاری و مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے حضرت عمر کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: ''میں سویا ہوا تھا کہ خواب میں میں نے خود کو جنت میں پایا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت ایک محل کے کنارے وضو کر رہی ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کس کا محل ہے؟ جواب ملا: عمر کا۔ اس وقت مجھے تمھاری غیرت کا خیال آ گیا چنانچہ میں پلٹ آیا'' یہ سن کر عمر آبدیدہ ہو گئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول کیا میں آپ کے

مقابلے میں غیرت کا مظاہرہ کروں گا؟

بخاری و مسلم نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک مرتبہ میں سو رہا تھا، میں نے خواب میں دیکھا کہ میں دودھ پی رہا ہوں یہاں تک کہ میرا پور پور سیراب ہو گیا۔ پھر میں نے پیالہ عمر کو تھما دیا۔ لوگوں نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول اس کی کیا تعبیر ہے؟ آپ نے فرمایا: علم‘‘

امام بخاری نے ابو ہریرہؓ کے حوالے سے یہ روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: پہلی امتوں میں کچھ لوگ ایسے ہوتے جن کو الہام ہوتا تھا۔ میری امت میں اگر کوئی شخص ایسا ہے تو وہ عمر ہیں‘‘۔ ترمذی نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ نے عمر کی زبان پر حق جاری کر دیا ہے اور ان کے دل کو بھی حق کی آماجگاہ بنا دیا ہے‘‘۔

ابن عمر فرماتے ہیں: کوئی معاملہ درپیش ہوا۔ لوگوں نے ایک رائے دی اور حضرت عمرؓ نے دوسری رائے دی۔ بالآخر قرآن حضرت عمر کی رائے کے مطابق نازل ہوا۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: جب (منافق) عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو رسول اللہ ﷺ کو اس کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے بلایا گیا۔ آپؐ جب اس کی نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے تو میں نے آگے بڑھ کر عرض کیا: کیا آپ اللہ کے دشمن عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھیں گے جو ایسی ایسی باتیں کہتا تھا؟ رسول اللہ ﷺ میری باتیں سن کر مسکراتے رہے۔ یہاں تک جب میں بہت کچھ کہہ چکا تو آپؐ نے فرمایا: اے عمر ہٹ جاؤ، مجھے اختیار دیا گیا ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ، اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (التوبة:۸۰)

اے نبی تم خواہ ایسے لوگوں کے لئے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو۔ اگر تم ستر مرتبہ بھی انھیں معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا۔

اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ اس کے لیے میرے ستر سے زائد مرتبہ معافی کی درخواست کرنے پر اسے انھیں معاف کر دیا جائے گا تو میں ضرور ایسا کروں گا‘‘۔ پھر آپؐ نے کی نماز پڑھائی، جنازہ کے ساتھ چلے، او رتدفین سے فراغت تک اس کی قبر پر کھڑے رہے۔ مجھے اپنے اوپر تعجب ہوا کہ میں نے کیونکہ کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایسی جسارت کی جب کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ اللہ کی قسم ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ یہ دونوں آیتیں نازل ہوئیں:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَاتَ اَبَداً وَلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ (التوبة:۸۰)

’’اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔‘‘

چنانچہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی۔

قضاء کے معاملہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام حضرت عمرؓ کا خط اپنے موضوع پر بے مثال خط

ہے۔ وہ بہت سے اصول، فقہ اور استنباط احکام کے قواعد پر مشتمل ہے۔ اس سے اصالت رائے، دقت فہم اور حسن بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔ علامہ ابن قیم نے اپنی تصنیف اعلام الموقعین میں اس خط کے مشتملات کی تشریح کی ہے۔ (اعلام الموقعین جزاء: ص۸۹ تا آخر) آپؓ کی شہادت ۲۳ھ میں حج سے واپسی کے بعد ہوئی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ

آپ حضور ﷺ کے خلیفہ اول تھے۔ آپ کا نام عبداللہ بن ابی قحافہ عثمان بن عامر سعد بن تیم بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب قریشی تھا۔ اعلان نبوت کے بعد آپ ﷺ سے پہلی ملاقات میں اسلام لائے۔ آپ کا لقب عتیق تھا کہ اسلام لا کر آگ سے آزاد ہو گئے، بعض لوگوں نے کہا کہ اپنے حسن و جمال کی وجہ سے عتیق لقب پڑا، یہ حضرت مصعب بن زبیر وغیرہ کی رائے ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ آپ کا نام صدیق پڑ گیا۔ اس لئے کہ حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرنے میں آپ نے پہل کی اور سچائی کو اپنا شعار بنالیا۔ ان سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی، نہ ہی کسی موقعے پر شک وتذبذب میں پڑے۔ خدمت اسلام کے سلسلے میں آپ کے بڑے بڑے کارنامے ہیں۔

واقعہ معراج بھی انہیں واقعات میں سے ہے جن میں آپ کو ذرا بھی شک نہ ہوا فوراً تسلیم کر لیا اور کفار کو اس کا جواب دیا۔ آپ ہجرت کے وقت بغیر ادنیٰ تکلیف وتذبذب کے اہل وعیال کو چھوڑ کر ہجرت پر آمادہ ہو گئے، غار کی نازک گھڑی میں اور پورے سفر میں آپؐ کے ساتھ رہے۔ بدر کے دن آپ کی گفتگو اور پھر صلح حدیبیہ کے موقعے پر آپ نے حضور ﷺ کے اقدام کو بے چون وچرا مان لیا جب کہ دوسرے لوگ صلح کے بارے میں آپ ﷺ کے فیصلے پر مطمئن نہیں تھے۔ پھر آپ کا اس وقت رو پڑنا جب رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو اختیار دیا کہ دنیا کو اختیار کرے یا آخرت کو، اور اس نے آخرت کو اختیار فرمایا۔ اس کے بعد حضور ﷺ کی وفات کے وقت ثابت قدم رہنا اور لوگوں کے سامنے تقریر کرنا اور تسلی دینا، پھر بیعت کے معاملے میں مسلمانوں کے مفاد کی خاطر اس منصب کو قبول کرنا اور استقامت کا ثبوت دینا اور لشکر اسامہ بن زید کو شام کی طرف روانہ کرنے میں پوری ہمت وجرأت کا ثبوت دینا، پھر مرتدین سے جنگ کے بارے میں صحابہ کرام سے آپ کا بحث کرنا اور دلائل سے ان کو قائل کر دینا حتیٰ کہ ان کے دل حق کے لئے منشرح ہو گئے۔ جس پر ان کو خود انشراح تھا، پھر اپنی خلافت کے اختتام پر نہایت نازک فیصلہ فرمایا جو ان کے بہترین فیصلوں اور فضائل میں شمار ہوتا ہے وہ یہ کہ آپ نے اپنے بعد حضرت عمر کو خلیفہ بنایا، اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کے منصب خلافت سنبھالنے کی صلاحیت کو بھانپ لینا اور ان کیلئے اس کی وصیت کرنا، اور اس منصب کو ان کے حوالے کرنا آپ ہی کے کمالات وفضائل میں سے تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کو بہت اچھی طرح حق خلافت ادا کرنے کا جوہر عطا فرمایا۔ انہوں نے اپنے عہد خلافت میں دین کو پھیلایا اور عزت بخشی اور اللہ تعالیٰ کے وعدے کو سچ کر دکھایا کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو تمام ادیان پر غالب فرمائے گا۔ حضرت ابوبکرؓ کی اتنی خوبیاں ہیں کہ ان کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ساری باتیں امام نودی نے بیان فرمائی ہیں۔ امام نودی فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ زمانۂ جاہلیت میں ہی قریش کے سرداروں میں سے تھے، ان کی شوریٰ کے ایک رکن تھے۔ ان کی تمام باتوں

سے اچھ طرح واقف تھے، لیکن جب اسلام آیا تو اس کو تمام چیزوں پر ترجیح دی اور پوری طرح اسلام میں داخل ہو گئے۔ آپ قریش کے ان گیارہ حضرات میں سے ایک تھے جو زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں میں معزز تھے۔ تاوان اور دیت کا معاملہ حضرت ابو بکرؓ ہی کے حوالہ تھا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے: کہ حضور علیہ ﷺ نے فرمایا ''اسلام کے بارے میں ہم نے جس کسی سے بھی بات کی اس نے انکار کیا اور بحث و مباحثہ کیا۔ سوائے ابن قحافہ ابو بکر کے کہ ہم نے ان سے جو بات بھی کہی انہوں نے اس کو مان لیا اور اس پر جم گئے''۔

امام احمد نے حضرت ابو ہریرہ سے تخریج کی ہے، کہ حضور علیہ ﷺ نے فرمایا ''ابو بکر کے مال سے بڑھ کر کسی کے مال سے ہم کو فائدہ نہیں پہنچا'' یہ سن کر حضرت ابو بکر رو پڑے اور فرمایا: اللہ کے رسول میں اور میرا مال آپ ہی کا نہیں ہے؟

ابوسعید بن اعرابی نے ابن عمرؓ سے تخریج کی ہے فرمایا: حضرت ابو بکر جس دن اسلام لائے ان کے گھر میں اس دن چالیس ہزار درہم تھے، لیکن جب مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے لئے نکلے تو ان کے پاس صرف پانچ ہزار درہم تھے۔ وہ اپنا سارا مال مسلمان غلاموں کو آزاد کرانے اور اسلام کی مدد میں خرچ کرتے تھے۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضور علیہ ﷺ نے فرمایا ''ہم پر جس کسی کا احسان تھا ہم نے اس کا بدلہ چکا دیا سوائے ابو بکر کے کہ ان کا ہم پر ایسا احسان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی قیامت کے دن اس کا بدلہ چکائے گا۔ ابو بکر کے مال نے ہم کو جو فائدہ پہنچایا وہ کسی کے مال نے نہیں پہنچایا۔

حضور علیہ ﷺ نے فرمایا ''لوگوں میں اپنے مال اور ہر حال میں ساتھ دینے کے سلسلے میں ابو بکر سے بڑھ کر مجھ پر کسی کا احسان نہیں، اپنے رب کے علاوہ اگر میں کسی کو دوست بناتا تو ابو بکر کو بناتا۔ لیکن اسلامی اخوت اس کی خاطر محبت میں ابو بکر کی مثال نہیں۔ ہر خلا پر کیا جا سکتا ہے لیکن ابو بکر کا خلا نہیں پر کیا جا سکتا۔

تمیم رازی نے اپنی کتاب فوائد میں اور ابن عساکر نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے تخریج کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور علیہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت جبرئیل ہمارے پاس آئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حکم فرماتا ہے کہ ابو بکر سے مشورہ لیا کریں۔ اس بات پر تمام اہل سنت کا اتفاق ہے کہ حضور علیہ ﷺ کے بعد لوگوں میں سب سے افضل حضرت ابو بکرؓ اور ان کے بعد حضرت عمر پھر حضرت عثمان اور ان کے بعد حضرت علی اور ان کے بعد عشرہ مبشرہ ہیں۔ غزوۂ بدر میں شرکت کرنے والے صحابہ، پھر غزوۂ احد میں شرکت کرنے والے صحابہ، ان کے بعد اصحاب بیعت پھر دیگر صحابہ کرام کا مرتبہ ہے۔

امام احمد اور ترمذی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ حضور علیہ ﷺ نے فرمایا ''ہماری امت پر سب سے زیادہ مہربان ابو بکر ہیں اور اللہ کے معاملے میں ان میں سب سے زیادہ سخت عمر ہیں۔ اور شرم وحیا میں عثمان سب سے بڑھے ہوئے ہیں اور حرام وحلال کو سب سے زیادہ جاننے والے معاذ بن جبل ہیں اور فرائض کے سب سے زیادہ جاننے والے زید بن ثابت ہیں اور قرآن سب سے زیادہ پڑھنے والے ابی بن کعب ہیں۔ ہر امت میں ایک امین ہوتا ہے، ہماری امت کے امین ابوعبیدہ بن الجراح ہیں۔

حضرت ابو بکر کے مرض کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ دوشنبہ کے دن انہوں نے سات جمادی الآخر کو

جس دن ٹھنڈک تیز تھی، غسل فرمایا، جس سے پندرہ دن تک بخار میں اس طرح مبتلا رہے کہ نماز کے لیے بھی نہیں نکل سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو حکم فرماتے کہ وہ امامت فرمائیں۔ جمادی الآخر کی آٹھ راتیں باقی تھیں کہ آپ کی وفات کا حادثہ پیش آ گیا۔ یہ حادثہ ۱۳ ہجری کو پیش آیا۔ آپ کا زمانہ خلافت دو سال تین ماہ دس رات رہا، وفات کے وقت آپ کی عمر ۶۳ سال تھی۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا امام اکبر خلیفہ رسول ﷺ ابوبکر عبداللہ بن قحافہ بن کعب بن لؤی کی بیٹی ہیں قریش کی تمیمی شاخ سے ہیں۔ مکہ ہی میں پیدا ہوئیں، امت مسلمہ کی عورتوں میں بالاتفاق آپ سب سے زیادہ فقیہ تھیں، آپ کی والدہ ام رومان بنت عامر بن عویمر بن عبدشمس بن عتاب اذینیہ کنانیہ تھیں۔ آپ کے والدین نے آپ کو لے کر ہجرت کی۔ حضرت خدیجہ بنت خویلد کی وفات کے بعد ہجرت سے پہلے آپ ﷺ نے حضرت عائشہ سے شادی فرمائی۔ نکاح کی یہ تقریب ہجرت سے چند ماہ قبل پیش آئی اور رخصتی غزوۂ بدر سے واپسی کے بعد شوال ۲ھ میں ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر ۹ سال تھی۔ (جزیرۃ العرب کی آب وہوا میں لڑکیاں اس عمر میں بالغ ہو جاتی ہیں۔)

حضرت عائشہ نے حضور ﷺ سے بہت سی روایات بیان فرمائی ہیں۔ حضور ﷺ کے بعد اپنے والد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت سعدؓ اور حمزہ بن عمرو اسلمی سے بھی روایتیں کی ہیں، ابراہیم ابن زید نخعیؒ نے آپ سے مرسلاً حدیث بیان کی ہے، ابراہیم بن یزید تیمی نے بھی روایت کی ہے، اسی طرح اسحاق بن طلحہ اور دوسرے بہت سے لوگوں نے روایت کی ہے۔

مسند عائشہ میں دو ہزار دو سو دس حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے ایک سو چوہتر حدیثوں سے تو امام مسلم و بخاری دونوں نے اتفاق کیا ہے۔ علاوہ ازیں چون (۵۴) حدیثوں میں امام بخاری منفرد ہیں اور انہتر حدیثوں میں امام مسلم منفرد ہیں۔ حضرت عائشہؓ ان خوش نصیبوں میں ہیں جو والدین کے مسلمان ہونے کے بعد پیدا ہوئیں۔ آپ حضرت فاطمہؓ سے آٹھ سال چھوٹی ہیں۔ فرمایا کرتی تھیں میں نے جب سے ہوش وحواس سنبھالا اپنے والدین کو اسلام پر پایا۔ یہ چیزیں بتاتی ہیں کہ حضرت عائشہ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی لطف و کرم رہا۔ چنانچہ وہ وحی ونبوت کے ماحول میں پلی بڑھیں۔ ان کی پرورش ایسے گھر میں ہوئی، ایسے والدین کی نگرانی میں ہوئی جو خیر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ شرف بخشا کہ ان کے والد بزرگوار کا ذکر قرآن کریم میں فرمایا۔ فرمایا: اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا جیسے مشیت خداوندی ان کو نبی رحمت کی صاحب شرف بیوی ہونے کے لئے تیار کر رہی تھی تا کہ وہ امت مسلمہ کے لئے ایک مدرسہ اور مربیہ بنیں۔

ہشام بن عروہ اپنے والد سے اور وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے بیان کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: عائشہ تم مجھ کو تین رات خواب میں دکھائی گئیں، فرشتے تم کو بہترین ریشم کے جوڑے میں لائے اور کہا کہ یہ تمہاری بیوی ہے میں تمہارا چہرہ کھولتا اس جوڑے میں تم مجھ کو نظر آتیں، میں کہتا کہ اگر

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو ہو کے رہے گا۔

ان باتون اور اشاروں سے پتا چلتا ہے کہ وہ براہ راست نبوت کی زیر نگرانی، اپنے والد سے تربیت کے جام نوش فرما رہی تھیں، اس لیے کہ آپ ﷺ ان کے گھر روز ہی تشریف لایا کرتے تھے۔ چنانچہ جو باتیں ہوتیں ان کو دیکھتیں، غور فرماتیں اسلامی احکامات اور اخلاقی اقدار سے پورا پورا فائدہ اٹھاتیں، چانچہ وہ اپنی سہیلیوں میں ممتاز ونمایاں تھیں۔ علی بن زید بن جدعان اپنی دادی سے اور وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتی ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''مجھے نو چیزیں ایسی ملیں جو مریم بنت عمران کے بعد کسی کو نہیں ملیں۔ حضرت جبرئیل اپنی ہتھیلی میں میری صورت لے کر اترے اور حضور ﷺ سے فرمایا مجھ سے شادی کرلیں۔ آپ نے مجھ سے کنواری ہونے کی حالت میں نکاح فرمایا، جبکہ میرے سوا کسی اور کنواری سے آپ نے نکاح نہیں فرمایا۔ آپ کا انتقال اس حال میں ہوا کہ سر مبارک میری گود میں تھا۔ آپ ہمارے ہی حجرے میں دفن فرمائے گئے۔ میرے حجرے کے گرد فرشتوں کا ہجوم ہوا، مجھے یہ بھی شرف حاصل ہے کہ میں آپ کے لحاف میں ہوتی اس حال میں کہ آپ پر وحی نازل ہوتی۔ میں آپ کے خلیفہ اور صدیق کی بیٹی ہوں، میری براءت آسمان سے اتری، مجھے اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ صفات پیدا کیا اور پاکیزہ صفات باپ کے گھر پیدا کیا۔ مجھ سے مغفرت اور باعزت روزی کا وعدہ فرمایا گیا۔

حضرت عائشہ اپنے حالات بزبانِ خود بیان فرما رہی ہیں۔ اُن خصوصیات پر روشنی ڈال رہی ہیں جو ایک مثالی بیوی کی ہوسکتی ہیں کہ نبوی نمونہ کی وہ تصویر پیش کریں جو قابل اقتدا ہو۔ وہ ایک ایسا مدرسہ فقہ ہیں جو اپنے علم کو پھیلا رہا ہے۔

حضرت عائشہ کی زندگی علم وسخا، عبادت ومجاہدہ اور دینی ومعاشرتی زندگی کی خوبیوں کی جامع ہے۔ ان کی زندگی کے بہت سے ایسے واقعات ہیں، جو ان کی ذہانت، یادداشت اور حدیث فقہ اور فرائض کے اندر علمی مہارت وکمال کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ وفات کے وقت حضرت ابن عباس تشریف لائے اور خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی، اندر بلالیا، حضرت ابن عباس نے فرمایا آپ امہات المومنین میں حضور ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں اور حضور ﷺ اچھی چیزوں سے محبت فرماتے تھے۔ ابواء میں قیام کی رات آپ کا ہار گر گیا، اس موقعے پر اللہ تعالیٰ نے آیت تیمّم نازل فرمائی۔ (فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْداً طَيِّباً) (النساء:۴۲) یہ آپ ہی کی وجہ سے ہوا اللہ تعالیٰ۔ نے امت کے لئے رخصت کا حکم نازل فرمایا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ساتویں آسمان سے آپ کی برأت نازل فرمائی جس کی دنیا کی ہر مسجد میں دن رات تلاوت ہوتی ہے۔ یہ سن کر فرمایا: ابن عباس یہ کیا کہتے ہو، خدا کی قسم مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہوسکا۔ میں تو یہ آرزو رکھتی ہوں کہ کاش بھولی بسری ہوچکی ہوتی۔ حضرت قیس سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا اپنے دل میں آرزو رکھتی تھیں کہ موت کے بعد اپنے حجرے ہی میں مدفون ہوتیں، پھر فرمایا میں نے حضور ﷺ کے بعد ایسا نیا کام کیا کہ اب دیگر ازواج مطہرات کے ساتھ مجھے بھی دفن کرو۔ چنانچہ بقیع میں دفن فرمائی گئیں، نئی بات سے ان کی مراد جنگ جمل میں انکی شرکت ہے۔ اس شرکت پر وہ بہت زیادہ نادم ہوئیں آپ کی وفات ۵۷ ہجری میں ہوئی۔ عمر ۶۳ سال کچھ ماہ ہوئی۔ (سیر اعلام النبلاء)

حضرت مغیرہ بن شعبہ

مغیرہ بن شعبہؓ کا سلسلہ نسب یہ ہے: مغیرہ بن شعبہ بن ابی عامر بن مسعود بن معتب، ان کی کنیت ابوعیسیٰ تھی۔ بعض سوانح نگاروں نے ابوعبداللہ اور ابومحمد بھی کنیتیں بیان کی ہیں۔ وہ مختلف علاقوں کے گورنر رہے ہیں۔

حضرت مغیرہؓ کا شمار ان کبار صحابہ میں ہوتا ہے، جو شجاعت وجواں مردی اور تدبیر وفراست میں مشہور تھے۔ انھوں نے بیعتِ رضوان میں شرکت کی تھی۔ وہ بڑے لمبے تڑنگے اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ جنگ یرموک اور بعض لوگوں کے مطابق جنگ قادسیہ میں ان کی آنکھ ضائع ہوگئی تھی۔ ابن سعد نے لکھا ہے: حضرت مغیرہ کے سر کے بال بہت زیادہ سرخ تھے۔ وہ چار مانگیں نکالتے تھے۔ ہونٹ اوپر کی جانب سکڑے ہوئے اور آگے کے دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ سر بڑا، بازو موٹے مضبوط اور سینہ کشادہ تھا۔ وہ بڑے زیرک اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے تھے۔ اسی لئے انھیں مغیرۃ الرائ کہا جاتا تھا۔

معمر نے زہری سے روایت کی ہے کہ ''فتنے (حضرات علی ومعاویہ کے درمیان اختلافات) کے زمانے میں پانچ لوگ اپنی زیرکی اور دانائی وبصیرت میں مشہور تھے۔ قریش میں حضرت عمرو وحضرت معاویہ، انصار میں حضرت قیس بن سعد، ثقیف میں سے حضرت مغیرہ، اور مہاجرین میں سے حضرت عبداللہ بن بدیل بن ورقۃ الخزاعی۔ حضرت قیس اور حضرت ابن بدیل حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ الگ تھلگ رہے۔ انھوں نے حضرت علی اور حضرت معاویہ میں سے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔

حضرت مغیرہؓ نے صلح حدیبیہ سے قبل اسلام قبول کیا اور نبی ﷺ کے ساتھ رہے یہاں تک کہ آپ عمرہ کی نیت سے نکلے۔ حضرت مغیرہ فرماتے ہیں: یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ میرا پہلا سفر تھا۔ میں ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ رہتا۔ ہم لوگ دوسرے صحابہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب رہتے۔ آپ کے نقش قدم پر چلتے اور آپ کی سنتوں کو اپنے دل ودماغ میں بٹھاتے۔

یونس بن مسیرۃ نے ابوادریس کو یہ بیان کرتے سنا ہے: ''حضرت مغیرہ بن شعبہ دمشق آئے تو میرے دریافت کرنے پر انھوں نے فرمایا: ''میں نے غزوہ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کو وضو کرایا ہے۔ اس موقع پر آپ نے اپنے خفین (چرمی موزوں) پر مسح کیا'' اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت مغیرہؓ کو اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہنے کا کم موقع ملا لیکن اس مختصر مدت میں بھی وہ آں حضرتؐ سے کسبِ فیض کرنے اور آپ کی سنتوں اور اعمال کو عام کرنے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔

حضرت مغیرہؓ کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ ان کے زمانے میں اور ان کی زیرامارت آذربیجان اور ہمدان کے علاقے فتح ہوئے۔ حضرت لیثؒ فرماتے ہیں: ''۴۰ھ میں حضرت مغیرہ امیر الحج تھے۔ اس زمانے میں وہ کوفہ کے گورنر تھے۔ ان کی وفات شعبان ۵۰ھ میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ستر سال تھی۔

صحیحین میں ان سے مروی احادیث کی تعداد بارہ ہے۔ ان کے علاوہ ایک حدیث صحیح بخاری میں اور دو حدیثیں صحیح مسلم میں ہیں۔ (دیکھیے سیر اعلام النبلاء: جلد ۳ ص ۲۱-۲۲)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن عمر بن الخطاب بن کعب بن لوئ بن غالب القرشی العدوی۔ ان کی کنیت ابوعبدالرحمٰن تھی۔

نوعمری ہی میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ پھر اپنے والد کے ساتھ ہجرت کی۔ غزوۂ احد کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے انھیں چھوٹا ہونے کی وجہ سے جنگ میں شرکت کی اجازت نہیں دی تھی۔ پہلا غزوہ جس میں وہ شریک ہوئے، غزوۂ خندق تھا۔ اسی طرح انھیں بیعتِ رضوان میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی اور ام المومنین حضرت حفصہؓ دونوں کی ماں زینب بنت مظعون تھیں۔ انھوں نے نبی ﷺ سے براہ راست بھی احادیث روایت کی ہیں اور اپنے والد عمر بن الخطابؓ ابوبکرؓ، عثمانؓ، بلالؓ، صہیبؓ، زید بن ثابتؓ، اپنی بہن حفصہؓ اور دوسرے صحابہ کے واسطے سے بھی۔

ابن عمرؓ جہاد کے لیے شام، عراق، بصرہ اور فارس گئے۔ نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے اہل عراق سے جنگ کے دوران ایک شخص کو دعوتِ مبارزت دی۔ پھر اسے قتل کرکے اس کا سامان اپنے قبضے میں کرلیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ علم وفقہ، جہاد، شہسواری وشجاعت، عبادت وزہد اور اتباع سنت نبوی کے جامع تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاحب زادے سالم ان سے روایت کرتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں کوئی شخص خواب دیکھتا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسے بیان کرتا۔ میں نوجوان اور غیر شادی شدہ تھا اس لئے مسجد میں سوتا تھا۔ ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ دو فرشتے میرے پاس آئے اور مجھے لپٹی ہوئی آگ جہنم کے پاس لئے گئے۔

میں نے اس میں کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جنھیں پہچانتا تھا۔ میں کہنے لگا: ''جہنم سے اللہ کی پناہ''، ہمیں ایک فرشتہ ملا۔ اس نے کہا ''مت ڈرو'' میں نے اس خواب کو اپنی بہن حفصہ سے بیان کیا۔ انھوں نے اسے رسول اللہ ﷺ کو سنایا۔ آپؐ نے فرمایا: عبداللہ بڑے اچھے آدمی ہیں، کاش وہ تہجد پڑھتے'' حضرت سالم بیان کرتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ کے اس ارشاد کے بعد حضرت عبداللہ رات میں بہت کم سوتے تھے اور اس کا زیادہ تر حصہ عبادت میں گزارتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: ''قریش کے نوجوانوں میں اپنے نفس پر سب سے زیادہ قابو رکھنے والے اور دنیا سے سب سے زیادہ بے رغبت عبداللہ بن عمرؓ تھے'' طاؤس فرماتے ہیں: ابن عمر سے زیادہ پرہیز گار شخص میں نے نہیں دیکھا۔ ابوجعفر باقر نے ایک موقع پر فرمایا: ابن عمر رسول ﷺ سے جو کچھ سنتے تھے اسے جوں کا توں دوسروں سے بیان کردیتے تھے اس معاملہ میں ان کا رویہ بے مثال تھا۔ وہ نبی ﷺ کی سنت کو مضبوطی سے تھامے رہتے تھے۔ نافع فرماتے ہیں: حضرت ابن عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے آثار کو تلاش کرنے اور آپ کی سنتوں پر عمل کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ جس جگہ آں حضرت ﷺ نے نماز پڑھی ہوتی وہاں وہ بھی نماز ادا کرتے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے ایک درخت کے نیچے آرام فرمایا تھا۔ حضرت ابن عمر اس درخت کی دیکھ بھال کرتے رہتے تھے اور اس کی جڑ میں پانی ڈالتے رہتے تھے تاکہ وہ سوکھ نہ جائے۔ اپنی

انتہائی پرہیز گاری کی وجہ سے حضرت ابن عمرؓ زیادہ احادیث روایت نہیں کرتے تھے۔ شعبیؒ فرماتے ہیں: میں حضرت ابن عمر کی مجلس میں ایک سال تک بیٹھتا رہا۔ اس عرصہ میں میں نے ان سے صرف ایک حدیث سنی۔

حضرت ابن عمرؓ خشوع وخضوع، زہد وتقویٰ باللہ میں معروف تھے۔ حبیب بن الشہید فرماتے ہیں: کسی نے حضرت نافع سے دریافت کیا: حضرت ابن عمرؓ اپنے گھر میں کیا کرتے تھے؟ فرمایا: تم لوگ ان کی طرح نہیں کرسکو گے۔ وہ ہر نماز کے لئے وضو کرتے تھے اور وضو ونماز کے درمیان قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ حضرت نافع ہی نے ایک مرتبہ بیان کیا کہ اگر کبھی حضرت ابن عمرؓ کی عشاء کی جماعت چھوٹ جاتی تھی تو وہ باقی پوری رات نوافل پڑھتے ہوئے گزار دیتے تھے۔ محمد بن زید سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر کے پاس ایک برتن تھا۔ رات کو وہ اس میں پانی بھر لیتے تھے۔ نماز ادا کر کے بستر پر چلے جاتے۔ پھر پرندے کی طرح جھپکی لے کر اٹھ جاتے تھے اور وضو کر کے نماز ادا کرنے لگتے تھے۔ ایسا وہ رات میں چار پانچ مرتبہ کرتے تھے۔ نافع فرماتے ہیں: ابن عمرؓ جب یہ آیت پڑھتے تھے: اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْاۤ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ(الحدید:١٦) (کیا وقت نہیں آیا ایمان والوں کے لئے کہ گڑگڑائیں ان کے دل اللہ کی یاد سے) تو رونے لگتے تھے یہاں تک کہ ان کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔

حضرت ابن عمرؓ کا زہد وتقویٰ اور دنیا سے بے رغبتی معروف تھی۔ اس سلسلے میں متعدد حیرت انگیز واقعات مروی ہیں۔ ایوب بن وائل فرماتے ہیں: حضرت ابن عمرؓ کے پاس کہیں سے دس ہزار درہم آئے۔ اسی وقت اسے انھوں نے لوگوں میں تقسیم کرادیئے۔ صبح ہوئی تو اپنی سواری کے لئے ایک درہم ادھار لے کر چارہ خریدا۔ حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ ایک طرف حضرت ابن عمر کی سخاوت وفیاضی کا یہ عالم تھا کہ ایک مجلس میں تیس ہزار درہم تک تقسیم کر دیتے تھے دوسری طرف ان کی نجی زندگی ایسی تھی کہ ایک ایک مہینہ گزر جاتا تھا لیکن انھیں گوشت کی ایک بوٹی کھانے کو نصیب نہیں ہوتی تھی۔ نافع ہی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہ نے حضرت ابن عمر کی خدمت میں ایک لاکھ درہم بھیجے۔ ایک سال گزرنے سے پہلے پہلے یہ سب رقم ختم ہوگئی۔ نافع کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمرؓ اپنی داڑھی مٹھی میں لیتے اور جتنی بڑھی ہوئی ہوتی اسے کاٹ دیتے تھے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں: ہمارے یہاں حضرت زید بن ثابتؓ کے بعد لوگوں کے امام حضرت عبداللہ بن عمرؓ تھے۔ وہ ساٹھ سال تک لوگوں کو مسائل سے آگاہ کرتے رہے۔

ابن عمرؓ نے ایک طویل زندگی گزاری جو علم اور عبادت سے معمور تھی۔ وہ نبی ﷺ کی سنت کو مضبوطی سے تھامے ہوئے اور آپؐ کے آثار اور قولی وفعلی سنتوں کا تتبع کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں: جب حضرت ابن عمرؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو ایک مرتبہ فرمایا: دنیا کی کسی چیز کا مجھے افسوس نہیں ہے۔ سوائے تین چیزوں کے: دوپہر کی پیاس، رات کی مشقت اور یہ کہ میں اس باغی گروہ (مراد حجاج) سے جنگ نہ کر سکا۔

امام مالک نے فرمایا: حضرت ابن عمرؓ کی وفات ۸۷ سال کی عمر میں ۷۳ھ میں مکہ میں ہوئی اور ذی طویٰ میں مدفون ہوئے۔

حضرت ابن عمرؓ سے مکرّرات کے ساتھ دو ہزار چھ سو تیس (۲۶۳۰) احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے ایک سو اڑسٹھ (۱۶۸) احادیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں ہیں، ان کے علاوہ صرف صحیح بخاری میں اکیاسی (۸۱) اور صرف صحیح مسلم میں اکتیس (۳۱) احادیث ہیں۔

حضرت نعمان بن بشیر

حضرت نعمان بن بشیرؓ کا سلسلہ نسب یہ ہے: نعمان بن بشیر بن سعد بن ثعلبہ۔ وہ انصار کے قبیلے خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ مشہور صحابیٔ رسول حضرت عبداللہ بن رواحہ کے بھانجے تھے۔ خود بھی صحابی تھے اور ان کے والد بھی صحابی تھے۔ ان کی پیدائش ۲ھ میں ہوئی۔ ان کا شمار بالاتفاق نوعمر صحابہ میں ہوتا ہے۔

واقدی فرماتے ہیں: ''ہجرت مدینہ کے چودہ ماہ بعد انصار میں سب سے پہلی پیدایش نعمان بن بشیرؓ کی ہوئی۔ ان کے والد حضرت بشیر بن ثعلبہ صحابیٔ رسول تھے''۔

حضرت بشیرؓ نے ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ اپنے بیٹے نعمان کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت کے لئے دے دیں۔ انھوں نے جب آں حضرت ﷺ کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی تو آپؐ نے فرمایا: کیا تم نے اپنے تمام لڑکوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے؟ جواب دیا: نہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پھر اس کو بھی لے جاؤ'' حضرت نعمانؓ اپنی صغرسنی کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے اور آپؐ کے ارشادات کو بغور سنتے اور آپ کی احادیث یاد کر لیتے تھے۔ آپ سے مروی احادیث میں سے ایک مشہور حدیث یہ ہے: ''الحلال بیّن والحرام بیّن......

حضرت نعمان نے آں حضرت ﷺ سے براہ راست روایت کرنے کے علاوہ حضرت عبداللہ بن رواحہ کے بیٹے حضرت خالد، حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کے واسطے سے بھی احادیث روایت کی ہیں۔ ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے بیٹے محمد اور آزاد کردہ غلام سالم کا نام ملتا ہے۔

حضرت نعمان خطابت اور شاعری کی خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ یہ صلاحیتیں انھیں اپنے ماموں سے ورثے میں ملی تھیں۔ انھوں نے اشعار کو قرآنی رنگ میں رنگنے کا فن اپنے ماموں عبداللہ بن رواحہ سے سیکھا تھا۔

حضرت نعمانؓ سے ایک سو چودہ حدیثیں مروی ہیں۔ ان میں سے پانچ حدیثیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں ہیں۔ ایک حدیث صرف صحیح بخاری میں اور چار حدیثیں صرف صحیح مسلم میں ہیں۔ (الاصابہ فی تمیز الصحابۃ، ابن حجر جلد۳، ص ۵۵۹۔ سیر اعلام النبلاء: ج ۳ ص ۴۱۱۔۴۱۲۔ طبقات ابن سعد: ج ۶ ص ۵۳)

حضرت سہل بن سعد

اس حدیث کے راوی حضرت سہل بن سعدؓ ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے، سہل بن سعد بن مالک بن خالد بن ثعلبہ۔ ان کا شمار اصحابِ فضل اور بزرگ صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کا لقب ابوالعباس تھا۔ انصار کے قبیلۂ خزرج کی شاخ ساعد سے تعلق تھا۔ ان کے والد ان صحابہ میں سے ہیں جن کی آں حضرت ﷺ کی حیات ہی میں وفات ہوگئی تھی۔

حضرت سہل فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کی جس مجلس میں لعان کا معاملہ پیش ہوا تھا اور آپ نے لعان کرائی تھی، اس مجلس میں میں بھی موجود تھا۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال کی تھی''۔ یہ ایک اہم اشارہ ہے، جس کے ذریعے اس اہم اختلافی مسئلہ کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے کہ لعان کرنیوالے حضرت ہلال بن امیہ اور ان کی بیوی تھی یا عویمر العجلانی اور ان کی بیوی۔ حضرت سہل بن سعد کا نام پہلے ''حزن'' تھا اسے بدل کر نبی ﷺ

نے ''سہل'' رکھا دیا۔ انھوں نے متعدد احادیث روایت کی ہیں۔ ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے صاحب زادے عباس، ابوحازم الاعرج، عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن الحارث بن ابی ذباب، ابن شہاب زہری، یحییٰ بن میمون الحضرمی وغیرہ ہیں۔ حضرت سہل کی روایت کردہ اہم احادیث میں سے ایک حدیث الاستئذان ہے۔ اور وہ یہ ہے: زہری سے روایت ہے کہ حضرت سہل بن سعدؓ نے فرمایا: ایک شخص نے نبی ﷺ کے ایک حجرے کے سوراخ سے اندر جھانکا۔ اس وقت آپؐ کے دستِ مبارک میں ایک لکڑی تھی جس سے سر کھجلا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو تو اسے تمہاری آنکھ میں بھونک دیتا۔ اجازت طلب کرنیکا حکم اسی لئے دیا گیا ہے کہ کسی پر نگاہ نہ پڑے'' (بخاری و مسلم) آپ مدینہ میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی ہیں اور ان لوگوں میں شمار ہوتا تھا جن کی عمر سو سال ہوئی۔

حضرت حکیم بن حزام

حضرت حکیم بن حزام قبیلہ قریش کی شاخ بنو اسد سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے: حکیم بن حزام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزی بن قصی بن کلاب۔ انھوں نے تاخیر سے اسلام قبول کیا۔ انھیں اس کی توفیق فتح مکہ کے دن حاصل ہوئی۔ غزوہ حنین اور غزوہ طائف میں شریک ہوئے۔ حضرت حکیم بن حزام کا شمار قریش کے معزز، عقل مند اور شریف لوگوں میں ہوتا تھا۔ ام المومنین حضرت خدیجہؓ ان کی پھوپھی اور حضرت زبیر ان کے چچازاد بھائی تھے۔

حضرت حکیم فرماتے ہیں: ''میں تاجر تھا۔ تجارت کی غرض سے یمن اور شام جاتا تھا اور وہاں سے خوب منافع کما کر لاتا تھا اور اپنی قوم کے غریبوں میں تقسیم کرتا تھا۔ میں نے عکاظ کے بازار سے اپنی پھوپھی (مراد حضرت خدیجہؓ) کے لئے زید بن حارثہ کو چھ سو درہم میں خریدا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح کیا تو میری پھوپھی نے زید کو آپ کو ہدیہ کر دیا۔ آپؐ نے انھیں آزاد کر دیا۔ جب حضرت معاویہؓ نے حج کیا تو میرا مکے کا مکان چالیس ہزار دینار میں لے لیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ابن الزبیرؓ نے میرے بارے میں کہا: ''ان بڑے میاں کو نہیں معلوم کہ انھوں نے کیا بیچ دیا ہے'' میں نے جواب میں کہا: میرے نزدیک اس کی حیثیت شراب کے ایک مشکیزہ کے برابر ہے'' کوئی شخص ان کے پاس آتا اور جہاد میں شریک ہونے کے لئے سواری مانگتا تو اسے مایوس نہ کرتے تھے۔

حضرت حکیم نے دارالندوۃ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ ایک لاکھ درہم میں بیچ دیا۔ اس پر حضرت ابن الزبیر نے ان سے کہا: آپ نے قریش کا وقار فروخت کر دیا۔ انھوں نے جواب دیا: بھتیجے! تقویٰ کے علاوہ اب کوئی چیز عزت بخشنے والی نہیں۔ میں نے اسکے بدلے اپنے لئے جنت میں ایک گھر خرید لیا ہے۔ میں تمہیں گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اسے اللہ کے لئے وقف کر دیا۔

اس طرح یہ صحابی جلیل مانگنے والے سے دینے والے بن گئے، اللہ کی راہ میں صدقہ وخیرات کرنے لگے اور اپنے رب سے ملاقات کی آرزو کرنے لگے۔

کہا جاتا ہے کہ جب حضرت حکیمؓ کی وفات کا وقت قریب ہوا تو انھیں یہ فرماتے ہوئے سنا

گیا: لآ إله إلا اللّٰہ ایک وقت تھا کہ میں تجھ سے ڈرتا تھا۔ لیکن میں تیری آس لگائے ہوئے ہوں۔

حضرت حکیم بن حزامؓ سے چالیس احادیث مروی ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ

حضرت جابرؓ کا سلسلہ نسب یہ ہے: جابر بن عبداللہ بن عمرو بن حزام بن ثعلبہ بن حرام بن کعب بن غنم بن کعب بن سلمہ۔ ان کی کنیت ابوعبداللہ اور ابوعبدالرحمٰن تھی۔ انصار کیقبیلۂ خزرج سے تعلق تھا۔ ان کا شمار مجتہد، حافظ اور فقیہ صحابہ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بیعتِ رضوان میں شرکت کی تھی۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک ہونے والے صحابہ میں سب سے آخر میں ان کی وفات ہوئی۔

انھوں نے نبی ﷺ سے براہ راست بہت سی احادیث روایت کیں اور حضرت عمرؓ، علیؓ، ابوبکرؓ، ابوعبیدہؓ، معاذ بن جبلؓ، زبیرؓ، اور دوسرے صحابہ کے واسطے سے بھی روایت کی۔ ان سے روایت کرنے والوں میں سعید بن المسیب، عطاء بن رباح، حسن بصری، حسن بن محمد بن الحنفیہ اور دیگر کا نام آتا ہے۔

حضرت جابرؓ اپنے زمانے میں حضرت عمرؓ کے بعد کئی سال تک مدینے کے مفتی رہے۔ کئی احادیث صرف انہی سے مروی ہیں۔ وہ بیعت عقبہ میں اپنے والد کے ساتھ شریک تھے۔ ان کے والد بدری صحابہ میں سے ہیں۔ وہ غزوۂ احد میں شہید ہوگئے تھے، انھیں یہ شرف حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں دوبارہ زندگی بخشی اور ان سے کلام فرمایا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے عہد میں جب شہدائے احد کے قبروں کے پاس ایک چشمہ جاری کیا تو ان کی قبر کھل گئی تھی۔ حضرت جابرؓ نے فوراً جا کر اپنے باپ کی قبر دیکھی۔ ان کی نعش اسی طرح تر و تازہ تھی۔ اس پر بوسیدگی کے مطلق آثار نہ تھے۔ غزوۂ احد میں حضرت جابرؓ شرکت کرنا چاہتے تھے لیکن اپنے والد کے کہنے پر اپنی بہنوں کی دیکھ بھال کے لئے رک گئے تھے۔ غزوۂ خندق میں انھوں نے شرکت کی پھر بیعتِ رضوان میں بھی شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ انھوں نے طویل عمر پائی۔ آخرِ عمر میں ان کی بینائی زائل ہوگئی تھی۔ تقریباً نوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

حضرت جابرؓ کا شمار ان صحابہ کرام میں ہوتا ہے جو رسول ﷺ کی خصوصی عنایات اور توجہات سے بہرہ ور تھے۔ آپؐ ان کی تربیت کی فکر رکھتے تھے۔ ان کے لئے وقت فارغ کرتے تھے، کبھی ان کے لئے دعا کرتے، کبھی ان کی مدد کرتے اور کبھی ان کے لئے استغفار کرتے۔ ابوالزبیر سے روایت ہے کہ حضرت جابر نے ایک مرتبہ فرمایا: رسول اللہ نے 'لیلۃ البعیر'' میں پچیس مرتبہ میرے لئے استغفار کیا تھا۔ لیلۃ البعیر سے اس واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جابرؓ نبی ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، اس موقعے پر انھوں نے نبی ﷺ کے ہاتھ اپنا اونٹ بیچ دیا تھا، اس شرط کے ساتھ کہ مدینہ تک وہ خود اس پر سواری کریں گے۔ یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی حضرت جابر سے محبت، ان سے ہنسی مذاق، اور ان کے نکاح ولیمہ میں مدد کی تفصیلات کا حسین مرقعہ پیش کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت جابرؓ کو طویل عمر سے نوازا اور دعوت و جہاد کے مراحل میں آں حضرت ﷺ کی مبارک صحبت سے مشرف فرمایا۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سولہ غزوات میں شرکت کی ہے۔ اپنے والد کی حیاتِ میں میں کسی غزوہ میں شریک نہ ہوسکا، اس لئے کہ وہ مجھے اپنی بہنوں کی دیکھ

بھال کے لئے روک جایا کرتے تھے۔ میری نو بہنیں تھیں۔ غزوۂ احد میں وہ شہید ہوگئے۔ اس کے بعد پہلا غزوہ جس میں آں حضرت ﷺ کے ساتھ شریک ہوا۔ غزوہ حمراء الاسد تھا''۔ ان غزوات میں حضرت جابرؓ رسول ﷺ کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ آپؐ کے سرچشمۂ علم سے فیض یاب ہوتے تھے، اور زندگی میں تجربہ، دعوتی امور میں رہنمائی اور میدانِ جہاد میں درس وعبرت حاصل کرتے تھے۔ اس طرح ان کے علم میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی اور مزید علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوتا۔ تحصیل علم اور اس کے لئے سفر کے سلسلے میں ان کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ صرف حدیث قصاص کو حضرت عبداللہ بن انیس سے سننے کے لئے انھوں نے مصر کا سفر کیا تھا۔

واقدی کا بیان ہے: حضرت جابرؓ کی وفات ۷۸ھ میں ہوئی۔ ان کی عمر چورانوے سال کی تھی۔ ان سے ایک ہزار پانچ سو چالیس (۱۵۴۰) احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے اٹھاون (۵۸) احادیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں ہیں۔ چھبیس (۲۶) احادیث صرف بخاری میں اور ایک سو سولہ (۱۱۶) احادیث صرف صحیح مسلم میں ہیں۔

حضرت معقل بن یسار المزنی

حضرت معقل بن یسارؓ مزنی بصری ان صحابہ کرام میں سے ہیں، جنھوں نے بیعت رضوان میں شرکت کی تھی۔ انھوں نے نبی ﷺ سے براہ راست روایت کرنے کے علاوہ حضرت نعمان بن مقرن کے واسطے سے بھی روایت کی ہے۔ ان سے حضرت عمران بن حصین نے روایت کی ہے، حالانکہ وہ ان سے مقدم تھے۔ اسی طرح ان سے روایت کرنے والوں میں حسن بصری، ابوالملیح بن اسامہ، معاویہ بن قرۃ مزنی، علقمہ بن عبداللہ مزنی وغیرہ بھی ہیں۔ محمد بن سعد فرماتے ہیں: ہم نہیں جانتے کہ ان کے علاوہ کسی اور صحابی کی کنیت ابوعلی ہو۔ ان کی وفات بصرہ میں حضرت معاویہؓ کی خلافت کے آخری زمانے میں ہوئی۔

حضرت عدی بن عمیر

حضرت عدی بن عمیر کندیؓ مشہور صحابیٔ رسول ہیں ان کی کنیت ابوزرارہ تھی۔ صحیح مسلم وغیرہ میں ان کی روایت کردہ کچھ احادیث ہیں۔ ان سے ان کے بھائی عرس نے روایت کی ہے۔ یہ بھی صحابی ہیں۔

حضرت عدی اپنی قوم اور قبیلے کے لوگوں میں رہتے تھے۔ اس علاقے میں کچھ یہودی علماء بھی تھے جو نبوت اور انبیاء کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ ان میں ایک یہودی عالم تھا جس کا نام ابن شہلاء تھا۔ اس نے ایک مرتبہ عدی بن عمیر سے کہا: ''میں اللہ کی کتاب میں پاتا ہوں کہ جنت کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو اپنے رب کی عبادت کرتے ہوئے سجدہ کرتے ہیں'' پھر اس نے مزید کہا: ''اللہ کی قسم میرا خیال ہے کہ یہ صفت صرف ہم یہود میں پائی جاتی ہے۔ اندازہ ہے کہ اللہ کا نبی ہم ہی میں مبعوث ہوگا۔ عدی فرماتے ہیں: ''اللہ کی قسم تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ بنو ہاشم کے ایک شخص نے نبوت کا اعلان کیا ہے۔ مجھے ابن شہلاء کی بات یاد آ گئی۔ میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ اور ان کے اصحاب سجدہ ریز ہیں'' اسی طرح حضرت عدی کا یہودی علماء سے ملنا ملنا اور ان کی باتیں سننا ان کے اسلام قبول کرنے کا مبارک سبب بن گیا اور انھیں رسول ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

واقدی نے لکھا ہے: حضرت عدی کی وفات ۴۰ھ میں کوفہ میں ہوئی۔ ابوعروبہ حرانی فرماتے ہیں: حضرت عدی بن عمیر کوفہ میں رہنے لگے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد وہاں سے الجزیرۃ چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

حضرت معاویہؓ

حضرت معاویہؓ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: معاویہ بن ابی سفیان صخر بن حرب بن امیۃ بن عبد شمس بن عبد مناف القرشی الاموی۔ ان کی ولادت کب ہوئی؟ اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی ولادت بعثت سے پانچ سال قبل ہوئی۔ ان کی ماں کا نام ہند تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: ھند بنت عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے باپ حضرت ابوسفیانؓ سے قبل عمرۃ القضاۃ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا۔ لیکن اپنے باپ کے خوف کی وجہ سے مکہ ہی میں ٹھہرے رہے تھے۔ نبی ﷺ کی خدمت میں مدینہ حاضر نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اظہار فتح مکہ کے دن کیا۔

انھوں نے نبی ﷺ سے براہ راست روایت کی اور اپنی بہن حضرت ام حبیبہ، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے واسطے سے بھی۔ وہ آں حضرت ﷺ کے کاتبین میں سے تھے۔

ابن ابی الدنیا اور دیگر سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہ دراز قد، سفید رنگت کے اور خوبصورت تھے۔ جب ہنستے تو ان کا اوپر کا ہونٹ اٹھ جاتا تھا۔ وہ خضاب لگاتے تھے۔

انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ حنین میں شرکت کی تو آپؐ نے مال غنیمت میں سو (۱۰۰) اونٹ اور چالیس اوقیہ چاندی عطا کی۔

صحابیٔ رسول حضرت عبدالرحمٰن بن ابی عمیرہ المزنیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک موقع پر حضرت معاویہؓ کے لئے یہ دعا فرمائی: اللھم علمہ الکتاب والحساب وقہ الضراب۔ مدائنی سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ جب حضرت معاویہؓ کو دیکھتے تو فرماتے ''یہ عرب کے کسریٰ ہیں''

مجاہد سے روایت ہے کہ شعبیؒ نے فرمایا: ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ نے حضرت عثمانؓ کے گھر والوں کو پیغام بھیجا کہ وہ جن کپڑوں میں شہید کئے گئے تھے انھیں ان کے پاس بھیج دیں۔ انھوں نے خون سے رنگین قمیص اور داڑھی کے کچھ بال جو اکھاڑ لے گئے تھے، بھیج دیئے۔ حضرت ام حبیبہؓ نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کے ہاتھ ان چیزوں کو حضرت معاویہؓ کی خدمت میں بھیج دیا۔ حضرت معاویہ منبر پر چڑھے، قمیص پھیلائی، لوگوں کو جمع کیا اور انھیں حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے پر ابھارا۔ اہل شام برانگیختہ ہوگئے۔ انھوں نے کہا: ''وہ آپ کے بھائی تھے۔ آپ ان کے ولی ہیں۔ آپ کے ساتھ ہم بھی قاتلین عثمان سے قصاص کا مطالبہ کرتے ہیں'' اسی طرح معرکہ صفین برپا ہوا۔

جب امیر المومنین حضرت علیؓ شہید کر دیئے گئے تو اہل عراق نے ان کے بیٹے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور بہت بڑے لشکر کے ساتھ شام کا رخ کیا۔ حضرت حسن کی رائے نہیں تھی کہ جنگ میں لوگوں کا

خون بہے۔ وہ فتنہ کو ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے اس شرط پر حضرت معاویہ سے صلح کرلی کہ وہ اس بات کا عہد کریں کہ اپنے بعد ان کے سپرد خلافت کریں گے، چنانچہ یہ فتنہ دب گیا۔

اسی طرح حضرت حسنؓ کے بارے میں نبی ﷺ کا یہ ارشاد سچ ثابت ہوا: ''میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان صلح کرادے گا''

حضرت معاویہ صلح ہوجانے سے بہت خوش ہوئے۔ صلح کے بعد وہ اور حضرت حسنؓ سوار ہوکر کوفہ میں داخل ہوئے۔ حضرت معاویہ نے ۴۱ھ میں ربیع الثانی کے اواخر میں زمام خلافت سنبھالی۔ اس سال کو ''عام الجماعۃ'' کا نام دیا گیا اس لئے کہ اس سال تمام مسلمان ایک امام پر متفق ہوگئے تھے۔

شعبی فرماتے ہیں: سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے بیٹھ کر خطبہ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا بدن فربہ ہوگیا تھا۔ میمون بن مہران کا قول ہے: سب سے پہلے منبر پر بیٹھ کر تقریر کرنے کی روایت حضرت معاویہؓ نے ڈالی۔ زبیر بن بکار سے روایت ہے: حضرت معاویہؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے منبر پر بیٹھ کر خطبہ دیا اور انھوں نے لوگوں سے بیٹھ کر خطبہ دینے کی اجازت طلب کی، چنانچہ لوگوں نے اس کی اجازت دیدی۔

ابوعمرو بن علاء بیان کرتے ہیں: جب حضرت معاویہؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو کسی نے عرض کیا: وصیت کردیجئے۔ فرمایا: ''اے اللہ! لغزشوں سے درگزر فرما۔ اپنے حلم کے ذریعے میری نادانی سے تجاوز فرما'' مزید فرمایا: موت کا وقت قریب ہے۔ اس سے نجات نہیں۔ اور موت کے بعد کا مرحلہ تو مزید دشوار اور پریشان کن ہے''۔

حضرت معاویہؓ کی وفات رجب ۶۰ھ میں، ستہتر (۷۷) سال کی عمر میں ہوئی۔ ان سے ایک سو تریسٹھ احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے چار احادیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں، چار احادیث صرف صحیح بخاری میں اور پانچ احادیث صرف صحیح مسلم میں ہیں۔

حضرت ابوسعید خدریؓ

حضرت ابوسعید خدریؓ کا نام سعد اور ان کے والد کا نام مالک تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے: سعد بن مالک بن سنان بن ثعلبہ بن عبید الابجر بن عوف بن الحارث بن الخزرج۔ ابجر کا نام خدرۃ تھا۔ انہی کی طرف نسبت سے حضرت ابوسعید، خدری کہلاتے ہیں۔ ان کے والد غزوۂ احد میں شہید کردیے گئے تھے۔ حضرت ابوسعید نے غزوۂ خندق میں شرکت کی تھی۔ اس طرح انھیں بیعت رضوان میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ نے نبی ﷺ سے براہ راست کثرت سے احادیث روایت کی ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دوسرے متعدد صحابہ کے واسطے بھی روایت کی ہے۔ ان کے واسطے سے روایت کرنے والوں میں ابن عمرؓ، جابرؓ، انسؓ اور دیگر بہت سے صحابہ ہیں، حضرت ابوسعید خدریؓ مجتہد فقہائے صحابہ میں سے تھے۔ ان کا شمار نوعمر صحابہ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے گہوارۂ نبوت میں پرورش پائی۔ وہ وحی کی برکتوں سے متمتع ہوتے، نبوی تربیت کے آثار کا مشاہدہ کرتے، آں حضرت ﷺ کی ہدایات اور ارشادات کو بغور سنتے۔ اور آپؐ کو غزوات اور معرکوں میں شرکت کے لئے عازم سفر ہوتے دیکھتے تو اپنی کم سنی کے باوجود ان کے دل میں شرکت

کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے والد (ابوسعید خدریؓ نے اپنا واقعہ یوں سنایا: ''غزوۂ احد کے موقعے پر جب کہ میری عمر تیرہ سال تھی۔ میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر نبی ﷺ کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول اس کی ہڈیاں بڑی مضبوط ہیں (اسے جہاد میں شرکت کی اجازت دے دیجئے۔ آپؐ نے میری طرف نظر اٹھا کر بغور دیکھا
پھر فرمایا: ''اسے واپس لے جاؤ'' چنانچہ میرے والد مجھے واپس لے گئے'' اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابوسعید خدریؓ غزوات کے موقع پر کتنے مستعد رہتے تھے، دوران جہاد نبی ﷺ کی ہم رکابی کے لئے کتنے سرگرم رہتے تھے۔ آپؐ کی مجلسوں سے علم و معرفت کے موتی چننے اور تربیت کے جام پینے کے لئے کتنے بے چین رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی تربیت قرآنی اور ربانی طرز پر ہوئی۔ ان میں اسلام کی روح سرایت کرگئی اور ان کی زندگی تعلیمات نبوی کا کامل نمونہ بن گئی۔ یہاں ہم حضرت ابوسعید خدریؓ کی ایک وصیت نقل کرتے ہیں اس سے ان کی اسلامی شخصیت اور دین سے ان کی محبت اور اس کے فہم کا اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے فرمایا: ''تقویٰ اختیار کرو اس لئے کہ وہی اصل سرمایہ ہے، جہاد کرو کہ وہ اسلام کی رہبانیت ہے، اللہ کا ذکر اور قرآن کی تلاوت کرو۔ اس سے آسمان والوں میں تمہاری روح کو سکون ملے گا اور زمین والوں میں تمہارا ذکرِ خیر ہوگا۔ اگر بولو تو صرف حق بات کہو اس طرح شیطان پر تمہیں غلبہ نصیب ہوگا''۔

یہ بابرکت، پاکیزہ اور عطر بیز کلمات حکمتوں اور نصیحتوں سے پر ہیں۔ ہر جملہ حضرت ابوسعید خدریؓ کے علم کی وسعت، ان کے طرز زندگی اور مدینہ منورہ کے ہر آن بدلتے ماحول میں رہ کر نئے علم کے حصول پر دلالت کرتا ہے۔ حنظلہ بن ابی سفیان اپنے بزرگوں سے روایت کرتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ کے نوعمر صحابہ میں ابوسعید خدریؓ سے بڑھ کر علم والا کوئی نہ تھا''۔

حضرت ابوسعیدؓ سے ایک ہزار ایک سوستر (۱۱۷۰) احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں تینتالیس (۴۳)، صرف بخاری میں (۱۶) اور صرف مسلم میں باون (۵۲) احادیث ہیں۔ وہ ان سات صحابہ میں سے ایک ہیں جنھوں نے کثرت سے احادیث روایت کی ہیں۔ واقدی اور دیگر اصحاب سیر نے لکھا ہے کہ ان کی وفات ۷۴ھ میں ہوئی۔ ان کی زندگی علم و عمل، جہاد اور عبادت سے معمور تھی۔ انھیں بارہ غزوات میں شرکت کی سعادت حاصل ہے۔